(مصوّر)

تاریخ ادبِ اُردو

(یعنی)

ہسٹری آف اُردو لٹریچر

مصنفہ

رام بابو صاحب سکسینہ۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایف
آر۔ ایس۔ اے (لندن) ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ایم۔ اے
ایس۔ بی۔ ممبر ہندوستانی اکیڈمی۔ یو پی۔ کلکٹر
مصنف اُردو شعراء زمانۂ حال و اوراقِ پریشاں وغیرہ

مترجمہ

مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے سابق ہیڈ ٹرانسلیٹر گورنمنٹ آف انڈیا

باہتمام۔ بپن بہاری کپور منیجر

(راجہ) رام کمار پریس واقع نول کشور پریس بکڈپو لکھنؤ

۱۹۵۲ء
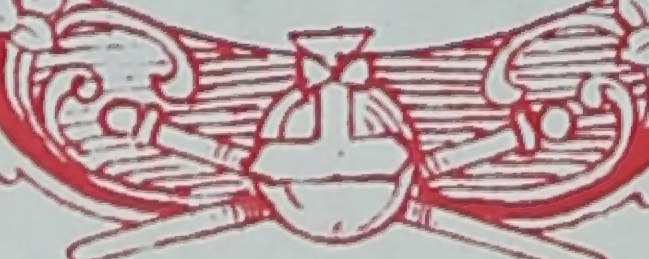
انتساب

باجازت خاص

یہ ناچیز تالیف

اعلیٰحضرت عالیجاہ فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ مخلص الدولہ ناصر الملک امیر الامرا
ہیجر ہائنس نواب سر سید محمد حامد علیخان بہادر مستعد جنگ دام اقبالہٗ جی۔ سی
ایس۔ آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ جی۔ سی۔ وی۔ او۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ملک معظم فرمانروائے
رامپور کے نام نامی کے ساتھ معنون کیجاتی ہے جنکے مبارک عہد مین اور جن کے
نامور اسلاف کے مبارک زمانہ مین ادب اُردو کی قدردانی اور ترقی اور مشہور
شعرا اور اہل فن کی سرپرستی خاص طور پر ہوتی رہی ہے جس کی
وجہ سے ادب اُردو حضور والا کا ہمیشہ ممنون احسان
رہے گا

گر قبول افتد زہے عز و شرف

هزهائنس سر سید حامد علی خاں بہادر جی-سی-ایس-آئی
جی-سی-آئی-ای-جی-سی-وی-او والئی رام پور

فہرست مضامین

باب ۳

اُردو شاعری کے عام خصوصیات

باب ۱۲

طبقۂ متوسطین شعرائے دہلی ذوق و غالب کا زمانہ

مسٹر رام بابو سکسینہ مصنف اصل کتاب (ہسٹری آف اُردو لٹریچر)

فہرست تصاویر حصّۂ نظم

تمہید

(از مصنّف)

اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادب اُردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانۂ قدیم سے لیکر زمانۂ حال تک کا مع مشہور شعراء اور نثاروں کے مختصر حالات زندگی اور اُن کے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقہ کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ اس میں وضاحت سے بیان کیے جائیں اور نیز مختلف تحریکوں اور طرزوں کی ابتدا اور ترقی اور زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اُس دَور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظر انداز نہ کیے جائیں جس میں کہ وہ شعرا و نثار گذرے۔ یہ کتاب محض کسی زمانے کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ اُن خیالات اور خصوصیات کے دکھانے کی اس میں پوری کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اُس زمانہ پر تھا۔ اسکی تصنیف میں میرے پیش نظر یہ رہا ہے کہ یہ زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور ٹکسٹ بک تیار کی جائے تاکہ انگریزی دان جماعت بھی ادب اُردو سے کما حقہٗ واقف ہو جائے۔

مصنف اپنی خامیوں سے بخوبی واقف ہے تقریباً چار برس کا عرصہ گذرا کہ اُس نے باوجود اپنی سرکاری مشغولیتوں کے اس کتاب کو ختم کر دیا تھا مگر بعد کو کچھ ابواب میں ردو بدل کرنا پڑا تاکہ وہ زمانۂ موجودہ کی تحقیق و تنقید کے مطابق ہو جائیں۔ یہی وجہ اس ناہمواری کی ہے جو کتاب کے مختلف حصّوں میں پائی جاتی ہے۔

، ابتدائی قصیدہ تو یہ تھا کہ ادب اُردو کی ایک پرائمر (ابتدائی کتاب) کالج کے طلبا اور عام پبلک کے فائدے کے لئے تیار کی جائے اسی وجہ سے فٹ نوٹ اور حوالوں سے کتاب کو وزنی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ہرچند کہ حسب ضرورت اصل کتابوں کا بخوبی مطالعہ کرلیا تھا مگر بالآخر یہ اپنے مقررہ حجم سے بڑھ گئی جس قدر میں آگے بڑھتا گیا اور اس کی غرض بدلتی گئی حوالے دینے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی گئی مگر بعد کو عملاً یہ کام مشکل معلوم ہوا۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ نقص آیندہ ایڈیشن میں دُور کردیا جائے گا۔

اس بات کی بھی شکایت کا موقع ہوسکتا ہے کہ تمثیلی اقتباسات دوسری کتابوں سے نہیں دیے گئے۔ میں نے یہ فروگذاشت جان بوجھ کر کی ہے اور سند میں پروفیسر سٹیبری کی کتاب "مختصر تاریخ انگریزی علم ادب" کی مثال پیش کرسکتا ہوں جس کے طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مختصر اقتباسات میرے مفید مطلب نہ ہوتے اور طویل اقتباسات سے کتاب کا حجم بڑھ جاتا۔ اس کمی کے رفع کرنے کی یہ تدبیر مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آیندہ کسی موقع پر ایک علیحدہ کتاب بطور ضمیمے کے مرتب کی جائے جس میں ہر دور کے خاص خاص مصنفین کی کتابوں کے اقتباس مع اُن کے انگریزی ترجمہ کے اور اگر ممکن ہوا تو منظوم ترجمے کے بالتفصیل دیے جائیں۔ یہ نقص بھی ضرور رہ گیا ہے کہ ماخذ کے نام نہیں دیے جاسکے۔ اس کی تلافی انشاءاللہ یوں ہوجائے گی کہ ایک علیحدہ رسالہ تنقیدی نوٹوں کے ساتھ جس کا نام "ماخذ ادب اُردو" ہوگا شائع کیا جائے گا۔

ایک اور اہم فروگذاشت قابل ذکر یہ ہے کہ دَور موجودہ کے اُردو شعراء کا اس کتاب میں ذکر نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ ان کا حال ایک علیحدہ کتاب میں قلمبند کیا گیا ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

اس کتاب کے متعلق میں پروفیسر سٹیبری کا یہ مذاقیہ مگر نہایت صحیح قول ضرور نقل کروں گا۔ "اگر کوئی یہ دعوے کرے کہ میں نے ایسی کتاب لکھی ہے جس میں کوئی غلطی

نہیں ہے تو وہ مسخرہ جھوٹا ہے اور جو شخص کسی دوے سے ایسی کتاب لکھنے کی امید رکھے جس میں کوئی غلطی نہ ہو وہ اُس سے بڑھ کر لغو ہے" مجھ کو اس کتاب میں بہت سی فروگذاشتوں کا اعتراف ہے جن کی اصلاح افسوس ہے کہ نہیں کی جاسکی۔

اب میں اپنی اس مختصر تالیف کو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں مجھ کو اپنی محنت اور کاوش کی پوری داد مل جائے گی۔ اگر میں اس کے ذریعہ سے لوگوں کے دلوں میں اس ادب شریف یعنی ادب اُردو کا صحیح ذوق پیدا کروں جو میری رائے میں ہندو مسلم اتحاد کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور اُن کو شوق دلاؤں کہ وہ اس قصر عالی کو جس کی میں نے صرف بنیاد ڈالی ہے تکمیل تک پہنچا دیں۔

میں تہِ دل سے ممنون ہوں (۱) ان تمام مصنفین کا جن کی کتابوں کو میں نے نہایت شوق سے پڑھا اور اُن سے فائدہ اُٹھایا مگر اس کا اعتراف متن میں نہ کرسکا (۲) ان تمام اصحاب کا جنھوں نے مجھ کو کتابیں پڑھنے کے لئے مرحمت فرمائیں اور میرے استفسارات کا جواب نہایت فراخدلی سے دیا (۳) اُن حضرات کا جنھوں نے مسودۂ کتاب پڑھا اور تصحیح پروف میں میری مدد کی (۴) اُن کا جنھوں نے میرا دل بڑھایا اور نیک صلاح سے اپنی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مگر چونکہ میرے محسنوں کی فہرست طویل ہے اور ان میں سے بعض کا انتخاب کرنا ایک کو دوسرے پر بیجا ترجیح دینا ہے لہٰذا میں اُن کا سب کا مجموعی حیثیت سے تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

رام بابو سکسینہ

از بریلی (یوپی)
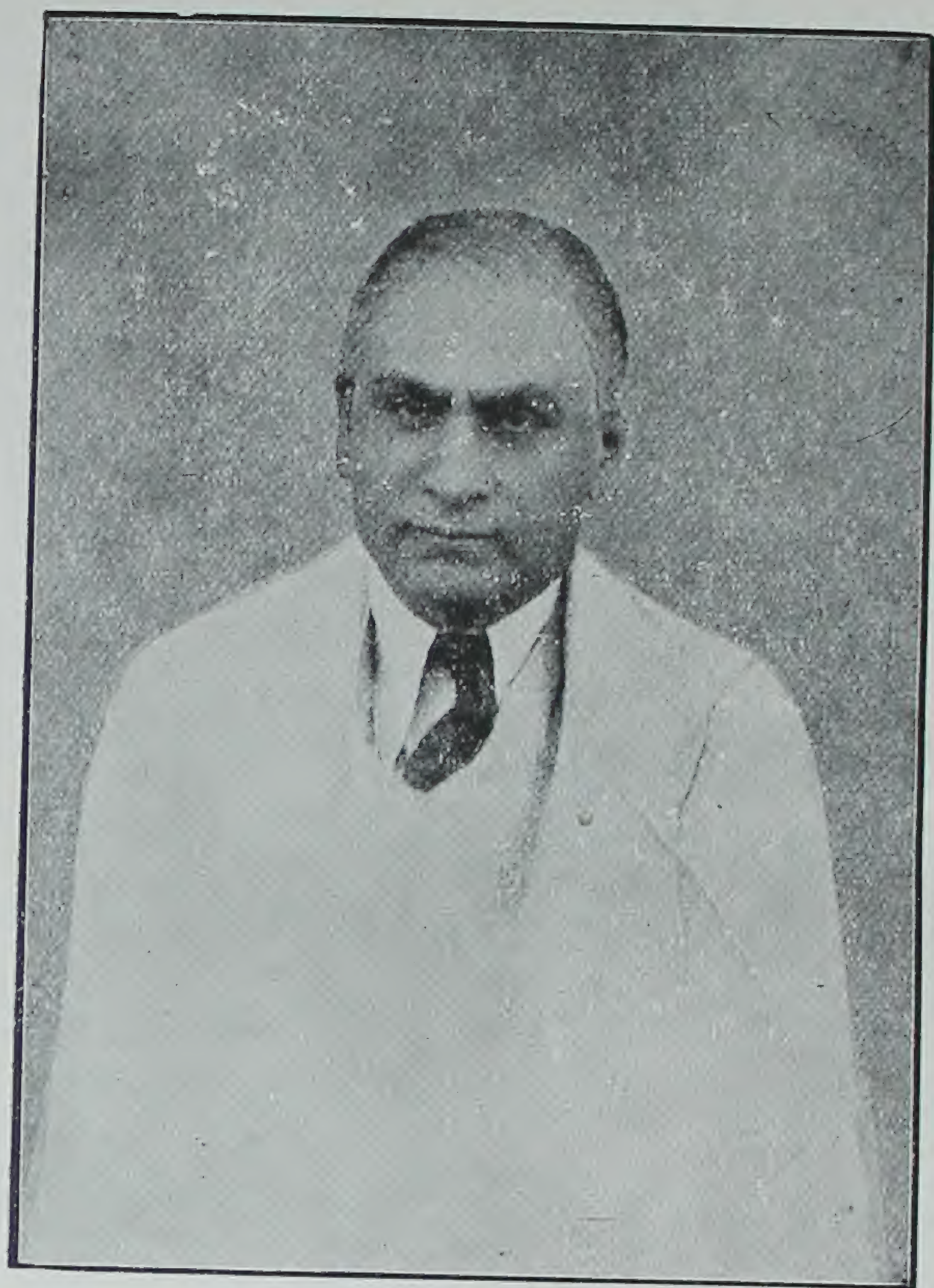
سر تیج بہادر سپرو کے-سی-ایس-آئی-ایل-ایل-ڈی

تقریظ

(از عالیجناب فضیلت انتساب سر تیج بہادر سپرو صاحب ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ ڈی۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی)

لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسۂ کانووکیشن کی تقریر میں میں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا تھا کہ ہم لوگ زبان اُردو سے بے توجہی اور غفلت کر رہے ہیں۔ ہمارے صوبے کے اکثر تعلیم یافتہ نوجوان اپنی اِس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے جو کہ اُن پر اُن کی زبان اور ادب کی ترقی کی نسبت عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے مگر صفائی سے کہنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کی دیسی زبانوں کو جس قدر ہمارے نام نہاد نیشنلزم (قوم پرستی) کے غلط مفہوم نے جو در اصل کمیونلزم (فرقہ بندی) کا مرادف ہے، نقصان پہونچایا اتنا اور کسی چیز نے نہیں پہونچایا۔ ہمارے صوبے کے اکثر مقامات پر ایسے ہندو گریجویٹوں اور انڈر گریجویٹوں کو دیکھ کر سخت افسوس آتا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ہندی کی ترقی کے لازمی طور پر یہ معنی ہیں کہ دلوں سے اُس زبان اور ادب کی محبت اور خیال بالکل نکال دیا جائے جس میں خود ان کے بزرگ ابھی دو ہی ایک نسل کا زمانہ گذرا کہ کمال رکھتے تھے۔ اسی طرح ایسے

مسلمانوں سے مل کر بھی نہایت صدمہ پہونچتا ہے جو ہندووں کی زبان اُردو سے بے توجہی اور بے پروائی کی شکایت سے تو لبریز ہیں لیکن اپنا کوئی قابل تعریف کارنامہ اُس میدانِ ادب میں نہیں پیش کر سکتے جس کا محافظ خاص وہ اپنے تئیں سمجھتے ہیں تعلیم و تربیت اور علمی مذاقوں کے اختلاف نے جو گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصہ میں بہت بڑھ گیا ہے، فرقہ بندی کے مضر اثرات کو اور قوی کر دیا ہے جس سے سرچشمۂ اتحاد مسموم اور ایک دوسرے کے خیالات کو صحیح طور پر سمجھنا معدوم ہوتا جاتا ہے۔

میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ زمانۂ حال میں لوگوں کو ایک قسم کا ادبی اشتغال ضرور ہے مگر ہمارے اس قسم کے کاموں سے ہماری زندگی کتنی مالا مال ہوگی یا کہ وہ کام کتنے دیرپا ہوں گے یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا جواب صرف مرور ایام سے ملے گا۔ جس قدر نظمیں فی زماننا لکھی جاتی ہیں اُن کا زیادہ تر حصہ ایک منظوم نثر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اُن میں کوئی الہامی اثر مطلق نہیں پایا جاتا اور نہ کوئی اعلیٰ آئڈیل ہوتا ہے بلکہ بعض نظمیں تو میں نے ایسی دیکھیں جن پر "بدنام کنندۂ نکونامے چند" کی مثال پوری طرح صادق آتی تھی اور اُن کو ایک اعلیٰ درجے کی بد مذاقی کا نمونہ پایا۔ ہماری نثر کی بھی یہی حالت سمجھنا چاہیے۔ چلتی ہوئی کتابیں اس صنف میں ہرگز ایسی نہیں ہوتیں جن سے ہمارے خیالات میں بلندی یا ہماری دلچسپیوں میں کوئی اضافہ ہو بلکہ وہی کمبخت پرانے عشق و عاشقی کے قصے ہیں جن میں یا تو کسی عورت کی بیوفائی اور مکاری اور یا ادنیٰ درجہ کی رکیک سازشوں اور چالاکیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ میرے اس خیال میں تمام ادبائے اُردو بالکلیہ داخل نہیں ہیں لہٰذا میں اس بات کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں کہ الحمدللہ ہم میں چند افراد ایسے ضرور ہیں جن کے ادبی کارنامے گو مقدار میں کم سہی مگر بلاشک نہایت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں شعرائے اُردو کی پوری تعداد کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے مگر وہ جو اپنا نام صفحۂ ہستی پر چھوڑ جانے والے ہیں اُن کی تعداد فی الحقیقت بہت کم ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر ہندوستان

میں کسی مقام پر ادب اُردو کی قرار واقعی دیرپا اور مفید خدمت انجام دی جاتی ہے تو وہ حیدرآباد دکن ہے۔

انھیں اسباب سے یہ میرے لئے خاص طور پر قابل مسرت ہے کہ ہمارے اسی صوبہ کے ایک گریجویٹ کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُن کو اتنا وقت ملا کہ باوجود اپنی سرکاری مصروفیتوں کے انھوں نے ایک کتاب زبان انگریزی میں زبان اور ادب اُردو کی تاریخ پر تیار کر دی۔ مولانا آزاد کی مشہور و معروف کتاب "آب حیات" سے کون واقف نہیں لیکن وہ ضروریات زمانۂ حال کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور کتابیں زمانۂ موجودہ میں بھی اسی مبحث پر بہت عمدہ تصنیف ہوئیں مگر اُن کے مصنفین مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اُن میں قوت امتیاز اور روشن خیالی کے ساتھ تنقید کی بھی کمی ہے اس کتاب کے مسودہ کو میں نے بڑی خوشی کے ساتھ پڑھا تھا اور ہر چند کہ بعض باتوں میں مصنف کی تجاویز سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر قابل مصنف کی اس بارے میں ضرور داد دینا پڑتی ہے کہ کیسے مسلسل اور مربوط طریقہ سے انھوں نے زبان اور ادب اُردو کی ترقی اور نشو و نما کا حال قدیم زمانہ سے لے کر زمانۂ حال تک کا لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کتاب کے آیندہ اڈیشنوں میں وہ خود اس بات کی ضرورت محسوس کریں کہ اپنی تجاویز پر نظر ثانی کریں مگر جو بات مجھے اُن میں نہایت امید افزا معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد اور اپنے اظہار خیال میں بیباک ہیں۔ مثالاً میں اس کتاب کے باب کو پیش کرتا ہوں۔ اور بھی بہت سی مثالیں دیگر مقامات سے پیش کی جا سکتی ہیں مگر میں اسی پر اکتفا کروں گا۔ مختصر یہ کہ کتاب نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے جس کے واسطے تمام بہی خواہان اُردو کو لایق مصنف یعنی رام بابو سکسینہ صاحب کا احسان مند ہونا چاہئیے۔ یہ کتاب یقیناً اُن تمام اصحاب کو پسند آئے گی، اور میری رائے میں ضرور آنا چاہئیے جو اس بات کی

تحقیق چاہتے ہیں کہ زبان اُردو کس طرح عالم وجود میں آئی مختلف اُستادوں کے ہاتھ سے اس میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئی اور ترقی کے مختلف ادوار نے اس پر کیا کیا اثرات کیے۔ آخر میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سول سروس صوبہ کے حکّام اتنے خوش نصیب نہیں ہیں کہ ان کو اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں اتنا وقت مل جائے کہ وہ اُس کو کسی ادبی خدمت میں صرف کر سکیں مگر رام بابو صاحب نے اس کلیہ کو توڑ دیا اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ڈپٹی کلکٹر ایک مصنّف بھی ہو سکتا ہے اور قانون و انتظام کے فرائض کے ساتھ ساتھ ادبی فرائض کو بھی بخوبی انجام دے سکتا ہے۔

(ڈاکٹر سر) تیج بہادر سپرو

میرزا محمد عسکری بی-اے مترجم کتاب ہذا

التماسِ مترجم

ادب اُردو تشنہ تھا کہ اُس کی قدیم تاریخ یعنی اُس کی نشو نما، اس کی تدریجی ترقیاں اور وہ تغیرات جو اُس میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں ان سب چیزوں کے حالات کسی ایسے شخص کی بھی زبان سے سُنے جائیں جو اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہو جنہوں نے اب سے پہلے اس قسم کے حالات، و واقعات پر بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت خوب لکھا جا چکا ہے صد ہا نہیں تو بیسیوں تذکرے ایسے موجود ہیں جن سے مذکورہ امور بہت وضاحت سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم تذکرہ نویسی کو تین دَور پر تقسیم کریں تو قدما میں میر تقی اور میر حسن کے تذکرے ہمارے واسطے شمع ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ متاخرین میں آب حیات اور جلوۂ خضر کو ہم لے سکتے ہیں جن سے ہم کو بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں۔ اور اوّل الذکر تو باوجود سخت تنقیدات کے جو اُس کی نسبت وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں جن سے بعض واقعات فی الحقیقت معرض شک میں ضرور پڑ گئے ہیں۔ پھر بھی اپنی صنف میں ایک لاجواب اور انتخاب کتاب ہے جس کا نظیر علی الخصوص اس زمانہ میں جبکہ ہم اپنی زبان کی طرف سے اتنی بے پروائی برتتے ہیں محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قدیم تذکرہ نویسوں نے بس اسی پر اکتفا کی ہے کہ اپنے معاصرین اور بعض قدیم شاعروں کے وہ حالات جو اُن کو بآسانی معلوم ہو سکے قلمبند کر دیے اور کچھ نمونے اُن کے کلام کے پیش کر دیے اور مختصر طور اپنی رائے اُن کے کلام کی نسبت ظاہر کر دی اور بس۔ زبان کی تدریجی ترقیوں کا حال اور وہ تغیرات جو اُن کے عہد تک زبان میں ہوئے تھے اس کے بیان کرنے کے نہ وہ شائق تھے اور نہ اس کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ میری رائے میں اس کا سہرا مولانا آزاد کے سر ہے کہ

اُنھوں نے اُردو زبان کی ابتداء وارتقاء اور اُس کے مختلف ادوار کی تاریخ زمانہ حال کی روش کے مطابق سب سے پہلے قلمبند کی۔ مگر میری ناچیز رائے میں اتنی بات اُن سے ضرور رہ گئی کہ اس قسم کی کتاب میں اپنی عبارت کا طرز ادا بجائے سادہ اور سائنٹیفک رکھنے کے انھوں نے نہایت رنگین اور پر تصنع رکھا جیسا کہ ان کی دیگر تصانیف کا ہے اور اسکا خیال نہیں رکھا کہ تصنیف ایک خاص انداز کی اور ان کی دیگر تصانیف سے مختلف ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ان کی کتاب اس قدر دلچسپ ہوگئی کہ اگر ایک مرتبہ اُس کو شروع کیجئے تو پھر ہاتھ رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور ایک دفعہ کے پڑھ لینے کے بعد طبیعت اس سے اکتاتی نہیں۔ اور یہ بات گلستان سعدی کے سوا کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ مگر حق یہ ہے کہ جو اعتراضات فی زماننا اس پر بیدردی سے کیئے جارہے ہیں یہ بھی اسی عبارت کی رنگینی کا نتیجہ ہے کہ کتاب کو پر لطف بنانے کی غرض سے اور دل کو خوش کرنے کے لئے اظہار واقعات میں ایک مورخ کی نہیں بلکہ ایک افسانہ گو کی حیثیت اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ایسے واقعات خلط ملط ہو گئے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ یا ایسے پر زور اور رنگین الفاظ استعمال کیئے گئے جو اس موقع کے حسب حال نہ تھے۔ تنقید کی گہری نگاہیں جو اس کتاب پر بالفعل پڑ رہی ہیں اور اعتراضات کی بوچھار جو اُس پر ہو رہی ہے میری رائے میں ایک نتیجۂ لازمی بلکہ خمیازہ اس غلطی کا سمجھنا چاہیئے جو مصنف مرحوم نے اپنی عبارت اور طرز ادا کے اختیار کرنے میں شروع میں کی تھی۔

تذکرہ نویسی کا تیسرا دور ہم کو اپنے ہی زمانے میں ملتا ہے جس میں لالہ سری رام صاحب کی مشہور و معروف تصنیف خمخانۂ جاوید ہے جس میں سلاست عبارت، روانی بیان اور متانت کے ساتھ بیحد کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی شعرا کے ساتھ ان لوگوں کا بھی تذکرہ کیا جائے جو گوشۂ گمنامی میں زندگی گزار رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ اس تذکرہ

کی اب تک صرف چار جلدیں چھپی ہیں اور شین منقوطہ سے آگے نہیں بڑھا۔ اُس کے ساتھ ہی تذکرہ گل رعنا مولوی حکیم عبد الحی صاحب مرحوم کا اور شعر الہند مولوی عبد السلام صاحب ندوی اور سیر المصنفین جناب تنہا (نثاروں کا تذکرہ) بھی ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بلکہ ان تذکروں کے شائع ہونے سے بہت سی وہ باتیں جو ابتک پردۂ خفا میں تھیں معرض ظہور میں آگئیں۔

مگر غالباً غلط نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ ان سب میں کوئی نہ کوئی مخصوص انداز رکھا گیا ہے اور انھیں وجوہات سے اُن تذکروں کو مکمل کہنا ایک حد تک غیر ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ تذکرۂ خمخانۂ جاوید میں صرف اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شاعر بھی چھوٹ نہ جائے۔ اسی طرح تذکرۂ گُل رعنا کی بنیاد آزاد کی غلط بیانیوں کے ایراد پر ہے اس کے ساتھ ہی یہ کسی طرح سے مکمل نہیں اور بہت سی باتوں اور بہت سے باکمالوں کو اس میں نظر انداز کر دیا گیا ہے یا نظر انداز ہو گئے ہیں۔ شعر الہند بحیثیت مجموعی شعر اُردو کی ایک تاریخ ہے مگر ژولیدہ بیانی نے اُس کو بھی حدود معین سے نکال دیا ہے۔ سیر المصنفین یا نثر نگاروں کا تذکرہ یہ مخصوص نثر کے لئے ہے۔ اگرچہ یہ بھی ادب اُردو کے واسطے نہایت قابل قدر اور گرانبہا اضافے ہیں مگر سب میں ایک ایک انفرادی خصوصیت موجود ہے۔

"ہسٹری آف اُردو لٹریچر" جناب رام بابو صاحب سکسینہ کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے جو اُنھوں نے انگریزی میں تصنیف فرمائی ہے اور اس سے زیادہ تر یہ غرض تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس سے مستفیض ہو۔ مگر اوّل سے آخر تک اس کتاب کے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مصنف موصوف نے جس کاوش۔ جس کوشش زور مطالعہ اور وسعت نظر سے اس میں کام لیا ہے اور اسلوب بیان و تنقید وغیرہ میں جو صفائی مدنظر رکھی ہے شعرا اور نثاروں کے کلام کا توازن کرکے اُن پر جیسی صحیح بیباکانہ اور بے لاگ رائیں قائم کی ہیں وہ اس کتاب کو ہر حیثیت سے منفرد صورت میں پیش کرتی ہیں۔ تلاش و تجسس کا یہ

عالم ہے کہ اُن واقعات کو اظہر من الشمس کر دیا ہے جن سے ابھی تک لوگ نا آشنا تھے۔ ایک ایک لفظ سے ایک ضخیم دفتر کا فائدہ اُٹھایا ہے اسکے ساتھ کہیں توازن انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ قدما اور متاخرین کو تو بالکل نظر انداز کیجئے زمانہ حال میں جس قدر کتابیں زبان اُردو کی تحقیق یا اس کی نظم و نثر کے متعلق یا بطور تذکرہ وغیرہ کے نکلتی ہیں اُن کے مصنفین زبان انگریزی سے کما حقہ واقفیت تقریباً پندرہ بیس فیصدی سے زیادہ نہیں رکھتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو طریقہ تحقیق و تدقیق (ریسرچ) اور علی الخصوص ترتیب مضامین کا مطبوعات یورپ میں اختیار کیا جاتا ہے اس سے ہماری اکثر ادبی تصانیف بالکل خالی ہوتی ہیں۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ پُرانے رنگ کی کتابیں جن میں فہرست مضامین وانڈکس تک کا پتہ نہیں ہوتا موجودہ انگریزی داں طبقہ کو مطلق پسند نہیں آتیں اور اُن کی آنکھیں انھیں باتوں کو ڈھونڈھتی ہیں جو زبان انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور جن سے اور کچھ نہیں تو کتاب کی سہولت اور دلچسپی میں ضرور ترقی ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کا بہت سا ضروری وقت فضول اور غیر ضروری باتوں سے بچ جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے اصل کتاب کی ترتیب میں اُسی روش کا خیال رکھا ہے جو ادب انگریزی کے مشہور مورخین پروفیسر سینٹس بری اور گاسں وغیرہ نے اپنی تصانیف میں اختیار کی ہے جس سے علاوہ جدت ترتیب اور مخصوص اسلوب بیان کے یہ فائدہ بھی ضرور ہوا کہ کتاب اُن اصحاب کے واسطے بہت مفید ہو گئی جنھوں نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری یا آئی سی ایس کے واسطے ادب اُردو لیا ہو۔ جس قدر سوالات کہ امتحان مذکور میں پوچھے جا سکتے ہیں وہ سب اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی اور بآسانی حل ہو سکتے ہیں اور ترتیب مضامین خود سوالات بنانے میں بھی معین ہو گی۔ مگر چونکہ اُردو داں طبقہ اس سے محروم تھا۔ نیز یہ کہ ایسی کتاب کو عام ہونا چاہیئے اور اس سے ہر شخص کو مستفیض ہونا چاہیئے اور موجودہ صورت میں وہ محض ایک فرقہ کے لیے مخصوص تھی اس وجہ سے

ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا ترجمہ کر دیا جائے۔ مگر ترجمہ جس کو حقیقی ترجمہ کہہ سکیں اُس کے لئے میرے نزدیک اسی مطالعہ اُسی تعمق نظر اسی وسعت معلومات کی ضرورت ہے جو مصنف کی نظر اور عبارت میں ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں لانا اور پھر اُن کی وہی خوبیاں قائم رکھنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے مگر چونکہ اصل خیالات کا ماخذ اُردو ہے اور اُردو ہی کے جامہ میں اُس کو پھر منتقل کرنا تھا اسلیے بہت ممکن ہے کہ باوجود ان مشکلات کے میں کچھ اس فرض سے عہدہ برآ ہوا ہوں۔ اس موقع پر میں اپنے قدیم عنایت فرما اور مخلص دوست راے بہادر کنور بم بہادر شاہ صاحب بالقابہ کا ممنون ہوں کہ انھیں کے اصرار سے مجھ کو موقع ملا کہ اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ ادب اُردو کی خدمت کر سکوں۔

ترجمہ کی مشکلات کے علاوہ بعض دوسری مشکلوں سے بھی دوچار ہونا پڑا بعض باتیں ایسی تھیں کہ وہ اگرچہ اول اردو ہی میں تھیں مگر قدیمی تذکرہ نویسوں نے اُس کو فارسی میں بیان کیا ہے پھر انھیں کو اُردو میں بیان کیا اور پھر اُردو سے انگریزی میں بیان کی گئیں اس لیے ان میں کچھ نہ کچھ تباین ہو گیا۔ اس میں مصنف ایک حد تک معذور تھے مگر اُن کو اُردو میں دبارہ پھر اُسی حیثیت سے لانا مشکل تر تھا جس کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ہے، اور جہاں انھیں مضامین ماخوذہ کا اعادہ کرنا پڑا ہے تو اُن کے الفاظ کو نیا جامہ پہنا دیا لیا ہے بعض واقعات ایسے تھے جنھیں شاید مصلحتاً اصل کتاب میں مجملاً بیان کیا گیا تھا، مگر اُردو میں اُن کی کسی قدر تفصیل ضروری تھی۔ اُن کو بھی اس میں بیان کیا گیا اور اس میں بھی تحقیق و تنقیح کما ینبغی کی گئی۔

چونکہ انگریزی میں نمونۂ کلام دینا کچھ زیادہ ضروری اور وقیع نہ تھا اسلئے اصل کتاب میں اس طرف توجہ نہیں کی گئی لیکن اس میں سب کا نہیں مگر اکثر کا نمونۂ کلام دیا گیا ہے۔ کسی دوسری زبان میں اگر یہ بات ضروری نہ بھی ہو تب بھی اُردو کے لیے نقد و تبصرہ

ہیں مسامحت اور ملائمت کی ضرورت ہے اسی لیے اکثر اس بات کو نظر انداز نہیں کیا گیا ورنہ ظاہر ہے کہ گلشن بیخار میں نظیر اکبر آبادی پر کوئی بڑا اعتراض نہیں کیا گیا تھا بلکہ مصنف نے اپنی رائے کو بے لوث ظاہر کر دیا تھا اسی پر قطب الدین باطن کا پورا تذکرہ لکھا گیا جس میں وہ سب اساتذۂ دہلی معرض تحقیر میں لائے گئے جنھیں مصنف گلشن بیخار (یعنی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ) سے برائے نام بھی تعلق تھا۔ اسی طرح سے برہان قاطع دکھنی، اور قاطع برہان مرزا غالب نے اپنے زمانہ میں جو بے پایاں طوفان برپا کیا تھا اُسکی مہیب آوازیں آج تک کانوں میں آرہی ہیں۔

اکثر جگہ ترجمہ میں کوہ کندن وکاہ برآوردن کا معاملہ پیش آیا ہے یعنی بعض معمولی اور ادنیٰ باتوں کے لیے پوری پوری کتابیں اور تاریخیں پڑھنی پڑی ہیں جس کے بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جا سکا ہے یا کوئی رائے قائم کی ہے۔ اصل کتاب کے علاوہ مصنف صاحب بھی اکثر جگہ حذف و اضافہ کرتے رہے ہیں اس لیے اس میں وہ بہت سی باتیں دوسری شکل میں نظر آئیں گی جو اصل کتاب میں تھیں کہیں کہیں مترجم اور مصنف کی رائے میں اختلاف تھا جس کو فٹ نوٹ کے تحت میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ غرضکہ یہ ایک کوشش و کاوش ہے جو ارباب نظر کی خدمت میں ہدیۂ ناز بنا کر پیش کی جاتی ہے اور نگاہ منظر طغرای قبول کی متمنی ہے۔

مجموعی حیثیت سے آج جب اس کتاب کو دیکھا جاتا ہے تو تنہا اس کے اندر وہ تمام چیزیں نظر آتی ہیں جو ایک ادیب کی معلومات کے لیے سرمایۂ ناز ہیں۔ یعنی زبان اُردو کی پیدائش ہندی بھاشا اور دوسری زبانوں سے اُس کا ارتباط و اتحاد۔ دوسری زبانوں کا اُس سے سرنگوں ہونا اور مٹ جانا نظم کے ادوار مختلفہ، اُن کے مشہور و معروف افراد۔ اُن پر تنقیدیں۔ موجودہ اساتذہ کے حال۔ تمام اصناف نظم پر روشنی۔ اُن کی ابتدا، و انتہا کے تاریخی نقطۂ نظر سے انکشافات۔ نثر اُردو کے مشہور مصنفین۔ اُس کی عہد بعہد کی ترقیاں۔ ان کی تصانیف پر نقد و تبصرہ مشہور نثاروں کا ذکر اور نثر کے اصناف وغیرہ پر بسیط رائیں

غرضکہ سبھی کچھ ان اوراق پریشان میں موجود ہے۔ اُردوے جدید کی جو روش بعض ناعاقبت اندیشوں نے نکالی ہے۔ اصولی طریقہ پر خواہ اس کا کوئی بھی موجد اور ذمہ دار ہو۔ مگر موجودہ صورت اس بات کی معین معلوم ہوتی ہے کہ وہ سلاست، شیرینی، روانی بیان کا خاتمہ کر کے چند ہی روز میں زبان کو ایک خارزار بنا دے گی میں نے اس بات کی خصوصیت سے کوشش کی ہے کہ نہ تو استعارات و تشبیہات اغراق و غلو سے مطلب کا خاتمہ ہو جائے اور نہ وہ اس قدر دشوار ہو جائے کہ قدم قدم پر لغت دیکھنا پڑے۔ بلکہ عبارت سلیس اور سادہ رہے اور کہیں سے گنجلک نہ ہو۔

کتاب کا فائدہ اور دلچسپی بڑھانے کے لیے اس کے آخر میں ایک مفصل انڈکس شامل کیا گیا ہے تاکہ ہر اس چیز کو جس میں اس کا ذکر ہے بہ آسانی ڈھونڈھ سکیں۔

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بعض مشہور شعرا اور نثاروں کی تصاویر بھی دی گئی ہیں جس سے کتاب کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ ضروری نہیں کہ تصاویر کے شمول سے کسی کتاب کی اصلی قدر و قیمت میں کوئی معتد بہ اضافہ ہو۔ مگر جبکہ فی زمانا دوسری کتابوں کے ادبی تذکرے اور انسائیکلوپیڈیا اپنے مشاہیر کی تصویروں سے خالی نہیں ہوتے تو ہم کو بھی مناسب معلوم ہوا کہ جس طرح ہم اپنے ادبی پیشواؤں کے روحانی اور باطنی فیوض سے اپنے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے ہیں اُسی طرح اُن کے خد و خال اور ظاہری جمال سے اپنی آنکھوں کو بھی روشن کریں۔ جی چاہتا تھا کہ تمام مشہور مشہور باکمالوں کی تصاویر ~~جائیں~~ (تمیں) مگر افسوس ہے کہ قدما کی تصویریں دستیاب نہیں ہوئیں اور جو ایک آدھ ملی بھی اُس کا بھی اعتبار نہیں علی الخصوص سودا کی تصویر جو ابھی تھوڑا عرصہ ہوا زمانہ میں شائع ہوئی تھی اور اس کتاب میں بھی اُسی سے لی گئی ہے، نہایت بھدی اور بھونڈی تصویر ہے اور ہرگز دل نہیں مانتا کہ یہ مرزا رفیع سودا کی شبیہ ہوگی۔ بہر طور جس قدر عمدہ اور معتبر تصاویر بہم پہنچ سکیں اس کتاب میں دی گئیں۔ اور اُس کے واسطے ہم اپنے مکرم و محترم دوست

منشی دیا نرائن صاحب نگم کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے بعض تصاویر کے بلاک فراہم کیے اور خود مصنف صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب آسیؔ کے بھی شکرگزار ہیں جن کی کوشش سے بعض دیگر تصاویر دستیاب ہوئیں۔ اول الذکر نے ایک بہت بڑا ذخیرہ تصاویر کا بھیج دیا جس میں سے اکثر کام آئیں۔

آخر میں بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں بعض حضرات کا جن سے اس کتاب کی تیاری میں بہت کچھ مدد ملی دلی شکریہ ادا کروں۔ سب سے پہلے میں اپنے مددگار اور دوست مولوی الباری آسیؔ کا نام اس فہرست میں لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے مجھ کو اس کی تکمیل و تیاری میں بڑی مدد دی۔ مجھ میں ایک سخت عیب ہے کہ اپنے ہاتھ سے لکھنے سے قاصر ہوں بلکہ اپنے ڈکٹیشن سے کسی دوسرے شخص سے لکھواتا جاتا ہوں یہ کتاب تمام و کمال مولوی صاحب موصوف کی اس اعانت قلمی کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اُن کا سا کاتب مجھے نہ ملتا تو اس کا اتمام و اختتام دشوار تھا۔ مولوی جعفر علی صاحب مصحح مطبع کا بھی متشکر ہوں کہ انھوں نے نہایت مستعدی اور ہوشیاری سے میرے ساتھ پروف پڑھے اور سپرنٹنڈنٹ مطبع یعنی بابو کیسری داس صاحب سیٹھ کا بھی شکریہ میں نہیں بھول سکتا جنھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں دلچسپی لے کر کافی مدد دی۔

مرزا محمد عسکری۔ لکھنؤ۔ ۱۵ / فروری ۱۹۲۹ء

باب ۱

زبان اُردو اور اُس کی اصل

اُردو سے کیا مراد ہے

عام طور پر لوگ اُردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں اس وجہ سے کہ اس کی ابتدا مسلمان حملہ آوروں کی فوج میں اور مسلمان سلاطین ہند کی دارالسلطنتوں میں پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُردو کے فارسی نژاد ہونے کی غلطی عام لوگوں کو تو اس وجہ سے بھی محسوس ہوتی ہے کہ اُس میں فارسی کے لفظ بکثرت ہیں اور اُس کی شاعری کی بحریں اور اس کا رسم الخط بھی مثل فارسی کے ہے۔ اس غلطی کی بناء پر عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے بمقابلہ ہندی کے جو ہندوؤں کی مخصوص زبان سمجھی جاتی ہے اور اس غلط فہمی سے ایک عرصۂ دراز سے سخت مقابلہ اور مباحثہ درمیان معاونین اُردو اور طرفداران ہندی کے ان دونوں زبانوں کی عمدگی اور خوبی اور نیز ان کی استعداد قبولیت عامہ کی نسبت چلا آتا ہے اور اس بحث میں لوگ ایک معمولی بات یعنی زبان اُردو کی اصل کو نظر انداز کر جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ زبان اُردو اس ہندی کی بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلاواسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے زبان اُردو کی اصل اور ماں سمجھی جا سکتی ہے۔

گو کہ "اُردو" کا نام اس زبان کو ایک عرصۂ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اُردو کی صرف و نحو، محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اُس میں استعمال ہونا اِس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اُس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان عام بن گئی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کی جائے ورود اور ان کا دار السلطنت بنا ہوا تھا۔ پس یہ خیال کرنا جیسا کہ میرامّن اور بعض اور قدیم اُردو نثاروں کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے جس میں وہ سب زبانیں داخل ہیں جو کسی زمانے میں دلّی کے بازاروں میں بولی جاتی تھیں صحیح نہیں ہے یہ ضرور سچ ہے کہ لشکر یا بازار سے اس زبان کی نشو و نما اور ترقی کو اس قدر تعلق ضرور تھا کہ اُس کا نام ہی "اُردو" ہو گیا جس کو زبان تُرکی میں "لشکر" کہتے ہیں۔ زبان میں ہنوز پختگی نہیں آئی تھی اور وہ بحالت تشکیل تھی اور اجنبی الفاظ اور جملوں کے قبول کر لینے کا مادّہ اس میں بہت تھا جیسا کہ اب بھی ہے۔

اِس زمانے میں انگریزی تقلید میں اُردو کو "ہندوستانی" کہتے ہیں، مگر یہ لفظ ہماری رائے میں گو باعتبار لفظ صحیح ہو مگر حقیقت میں صحیح نہیں ہے کیونکہ اس لفظ میں مشرقی ہندی اور مغربی ہندی اور راجستانی سب شامل ہیں۔ اسی طرح ہمارے خیال میں برج بھاشا کو اُردو کا ماخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے، اور جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اُس کے جوانب میں بُولی جاتی تھی۔ گو اُس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی بہت مشابہت رکھتی ہے مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دلّی بھاشا ہمارے خیال میں زبان اُردو کی اصل سمجھی جا سکتی ہے۔

اُردو اور ہندی کا تعلق

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اُردو کا اصلی ماخذ دہ زبان ہے جو دلّی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے اور

مغربی ہندی اپنی جگہ پر شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی اور مندرجۂ ذیل زبانیں اُس کی شاخیں ہیں یعنی بانگارو، برج بھاشا، قنوجی، اور وہ زبان جو دہلی کے اطراف میں مروج تھی مگر زمانہ حال کی اعلیٰ ہندی اُردو سے پیدا ہوئی اس طرح کہ فارسی الفاظ نکال کر اُنکی جگہ سنسکرت لفظ رکھدیے گئے۔ اسی اعلیٰ ہندی میں نثر کی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں کہ مصنفین نے سنسکرت کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کیے ہیں مگر سچ پوچھیے تو اُردو ہندی اپنے ماخذ اور نیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہیں اور ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے بھی تو نشو و نما اور ترقی کے طریقے میں ہے۔ اُردو چونکہ مسلمانوں کے سایۂ عاطفت میں پلی اسلیے اُس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہوگئی برخلاف ہندی کے کہ جو اپنے اصلی ماخذ یعنی سنسکرت کی طرف عود کر گئی جس کا نتیجہ ہوا کہ موجودہ زمانے کی ادبی اُردو اور ادبی ہندی میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا یعنی اول الذکر میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور آخرالذکر غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہے

زبان اور ادب اُردو فارسی کا احسان مند ہے

شروع میں زبان نہایت سادہ اور بے تکلف تھی اور عوام الناس کی معمولی ضروریات کے پورا کرنے کے واسطے بالکل کافی تھی۔ جوں جوں اُس میں ترقی ہوتی گئی اور وہ ایک ادبی زبان بنتی گئی اُسی قدر اُس میں فارسی اور عربی اور ترکی الفاظ شامل ہوتے گئے۔ فارسی الفاظ سُننے میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے اس وجہ سے مصنفین نے اپنی کتابوں میں جدّت کی چاشنی دینے کے لیے اُن کو بے تکلف استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح فارسی ترکیبیں جو اصلی زبان سے بالکل اجنبی تھیں اور اس کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھیں زبان میں داخل ہونے لگیں۔ اسی کے ساتھ فارسی رسم الخط بھی کچھ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ہندی کی جگہ پر رائج ہو چلا اس وجہ سے کہ فارسی الفاظ فارسی خط میں بہ نسبت ہندی کے زیادہ آسانی سے اور صحت کے ساتھ لکھے جا سکتے تھے اُردو شاعری پر بھی فارسی کا بڑا اثر پڑا اور وہ بھی فارسی شاعری کے قدم بقدم چلنے لگی۔

فارسی بحریں استعمال ہونے لگیں۔ ان کے علاوہ مضامین، طرز بیان، تخئیل، تلمیحات خاص خاص محاورے اور مثلیں یہ سب کچھ زبان فارسی سے لیا گیا۔ اُردو کا علم عروض بھی فارسی عروض کے تابع اور زیر اثر ہو گیا۔ نثر کا بھی یہی حال تھا وہی عبارت کی رنگینی، الفاظ کا توازن اور قافیہ بندی جو قدیم فارسی نثر کی جان تھی اُردو میں ان کی پوری نقل کی جاتی تھی۔ الغرض زبان فارسی اُردو پر اس قدر حاوی اور غالب ہو گئی کہ دونوں ایک ہو گئیں، اظہار خیالات، مضامین اور طرز ادا میں فارسی اُردو پر اتنی غالب ہو گئی کہ اُردو کی ابتدائی شان اس سے بالکل غائب ہو گئی یہاں تک کہ اکثر لوگوں نے اُردو کی صرف و نحو کی کتابیں تک فارسی کے طرز پر لکھنا شروع کر دیں۔

اُردو میں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت کے اسباب

مسلمان بحیثیت فاتح ہندوستان میں آئے اور قدرتاً زبان فارسی جو اُن کی مادری زبان تھی ہندوستان کی "شاہی" زبان بن گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبان مثل خادمہ کے دب گرا اور مغلوب ہو کر اپنی مالکہ زبان فارسی کی خدمت کرنے لگی اور اسی کے طرز ادا اور محاورات وغیرہ کی تتبع اور ناقل ہو گئی لوگوں کو نئی زبان سیکھنے کا شوق ہوا کرتا ہے اسی وجہ سے اُس وقت کے لوگ بھی پُرانا طرز چھوڑنے اور نئے الفاظ اور جدید محاورات اختیار کرنے لگے۔ دیسی زبان میں جو اب شرفا اور معزز شہری لوگوں سے چھوٹتی جاتی تھی اور اطراف شہر دیہات میں محدود ہوتی جاتی تھی اب لوگوں کو کوئی مزا نہیں آتا تھا لہذا جدّت پسند طبیعتوں نے نئی زبان کی طرف رُخ کیا اور اُس کو نہایت شوق و ذوق اور انہماک سے سیکھنے لگے۔ اسی وجہ سے قدیم ہندی شعرا کی تصانیف میں فارسی الفاظ کی کثرت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے مثلاً چند کوی کی "پرتھی راج راسو" کو دیکھیے جو فارسی الفاظ سے بھری ہوئی ہے دیسی زبان کی تنگی اور کم وسعتی بھی اس کا باعث ہوئی کہ نئے نئے الفاظ اور خیالات کے اظہار کے لیے اسکو اصلی لفظ اور طرز ادا جذب کر لینا پڑا۔ شروع میں دیسی زبان میں ایسے الفاظ بکثرت شامل تھے

جو یا تو سنسکرت کے لفظ تھے یا انھیں سے بگڑ کر کسی دوسری صورت میں زبان پر چڑھ گئے تھے۔ جب مسلمان آئے تو زبان میں بھی ایک بڑا انقلاب ہوا مسلمان حملہ آور بادشاہ بن گئے اور دہلی اُن کا پایۂ تخت ہو گیا۔ اب وہ یہاں بسنے اور آباد ہونے کے لیے آئے نہ کہ جس طرح سابق میں وہ سال بسال آتے تھے اور مال غنیمت لیکر واپس چلے جاتے تھے۔

جب دہلی پایۂ تخت ہو گیا اور بادشاہ مع لاؤ لشکر کے وہاں رہنے لگا تو باشندوں اور غیر ملکی سپاہیوں میں میل جول اور ربط و ضبط بڑھنے لگا۔ ایک دوسرے کی زبان اور خیالات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے الفاظ سیکھے اور اُن کو اپنے طرز پر استعمال کرے اور ظاہر ہے کہ فاتح کا اثر مفتوح پر زیادہ ہوا کرتا ہے پس مفتوح قوم کی دیسی زبان یعنی ہندی پر فارسی کا بہت بڑا اثر پڑنے لگا۔ اسی وجہ سے اُردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت شامل ہو گئیں مگر ہندی نے اپنا اثر فارسی پر کم ڈالا کیونکہ فارسی کے زباں دان اپنی زبان کو اس قسم کی آمیزش سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ تغیر گو کہ ابتدا میں بہت غیر محسوس طریقے سے شروع ہوا تھا مگر جوں جوں مسلمانوں کی جڑ مضبوط ہوتی گئی اور وہ اس ملک میں آباد ہوتے گئے یہ زبانی تغیر برابر ترقی کرتا گیا اور یہ ترقی کی رفتار برابر قائم رہی یہاں تک کہ اکبر کے زمانہ میں ایک ہندو وزیر مال کی تاکید سے ایک حکم جاری کیا گیا کہ ہر سرکاری ملازم کو فارسی سیکھنا ضروری ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کی جڑ مضبوط ہو گئی اور اس کی عظمت و اہمیت بڑھ گئی۔ لوگ فارسی، عربی، ترکی الفاظ بڑے شوق سے بولنے لگے کیونکہ وہ سُننے میں اچھے معلوم ہوتے تھے اور زور دار تھے اور انکے بولنے والے خواہ مخواہ تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے، اسکے علاوہ فارسی دانی سے سرکاری ملازمتیں بھی آسانی سے ملتیں اور تقرب شاہی کا بھی یہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ایسی حالتوں میں ابتدا ہر زبان کا یہی حال ہوا کرتا ہے جب قدیم اہل انگلستان کو نارمن لوگوں نے فتح کیا تو انگریزوں کی قدیم زبان "اینگلو سیکسن" کی بھی "نارمن فرنچ" کے ہاتھوں یہی حالت ہوئی تھی۔ پس جس طرح زبان

انگریزی میں دو طرح کی زبانیں یا بولیاں پائی جاتی ہیں وہی صورت اُردو کی بھی سمجھنا چاہیئے۔
اُردو میں فارسی الفاظ کی کثرت کے کئی اسباب ہیں مسلمان جب بحیثیت فاتح اس ملک میں آئے تو اپنے ساتھ بہت سی نئی چیزوں کے نام لائے جن کے مرادف سنسکرت یا دیسی بھاشا میں نہیں مل سکتے تھے، چونکہ ایسے نام کسی شرح یا گھوم پھیر سے بتائے نہیں جا سکتے تھے اسلیئے بجنسہ وہی فارسی الفاظ جن سے وہ چیز ظاہر ہوتی تھی زبان میں داخل کرنا پڑے مثلاً ایسے نام جو لباس، طعام، مذہب، اور بعض اسی قسم کی دوسری چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں پھر چونکہ فارسی فاتح قوم کی زبان تھی اور ایک ایسی زبان تھی جو رزم بزم اور حسن و عشق کے افسانوں کے لیے نہایت موزوں تھی اسلیے لوگ ایسے موقعوں پر فارسی الفاظ ہی بولنا پسند کرتے تھے اس وجہ سے کہ وہ نہایت شیریں اور شاندار معلوم ہوتے تھے۔ ایسے پُر زور لفظوں کے سامنے پُرانے دیسی الفاظ اور محاورں کو خواہ مخواہ پیچھے ہٹنا پڑا اس لیے کہ زمانہ اُن کو پسند ہی نہیں کرتا تھا زبان انگریزی کی بھی یہی داستان ہے جب یونانی اور لاطینی علوم کا احیا اور دوبارہ ترقی ہوئی تو اُس زمانہ میں بھی موٹے موٹے عالمانہ لفظ بولنے کا فیشن ہو گیا تھا بہر حال جب فاتح اور مفتوح دونوں قوموں کا میل جول بڑھا تو ایک ایسی مخلوط زبان یا بولی کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ جو دونوں قوموں کے اچھی طرح سمجھ میں آسکے اور چونکہ مفتوح اپنے مالکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہتے تھے لہذا اُنھوں نے اُن کو خوش کرنے کے لیے اُنکی زبان سے زیادہ اخذ کیا بہ نسبت اُسکے کہ اُن کے مالکوں نے اُنکی زبان سے فائدہ اُٹھایا۔
اظہار قابلیت کے لیے بھی عربی فارسی الفاظ کثرت سے بولے جانے لگے۔ اُردو ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی اور شاعری فارسی داں لوگوں کے ہاتھ میں گویا ایک کھلونا تھی جس کو وہ فارسی الفاظ و محاورات ہی کے لباس میں آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ زبان ہندی بہت کم جانتے تھے اور سنسکرت سے بالکل ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے یہ ہونہار بچہ اپنے حقیقی والدین سے جدا ہو کر اپنے مصنوعی والدین کی آغوش محبت میں تربیت پاتا رہا

جنھوں نے بلاشک اُسکے ساتھ بہت کچھ کیا۔ اُن کی آغوش تربیت میں رہ کر اُردو کا نشوونما بالکل فارسی کی روش پر ہوتا رہا۔ نہ صرف فارسی الفاظ کا ایک کافی ذخیرہ زبان میں جمع ہوگیا بلکہ فارسی ترکیبیں بھی کثرت سے شامل ہونے لگیں مثلاً جار مجرور صفت موصوف کی ترتیب بدل گئی ایسے سیکڑوں فقرے جو حرف ربط "بہ" سے معمولاً شروع ہوتے ہیں اُردو میں بے تکلف استعمال ہونے لگے جو دیسی مروجہ قواعد صرف و نحو سے بالکل خلاف تھا آج بھی ہماری ادبی دیسی زبان میں اسی قسم کی فارسی ترکیبیں کثرت سے موجود ہیں یہ ضرور ہوا کہ فارسی کے اثر سے اُردو ایک مستقل زبان کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے لیکن اِس کا افسوس بھی ہوتا ہے کہ اصل زبان کی خوبیاں جن سے اُردو کی ابتدا ہوئی تھی بہت کچھ فنا ہوگئیں۔

یورپ کی زبانوں کا اُردو پر اثر فارسی زبان اور فارسی ادب کا تو اُردو پر بہت گہرا اثر پڑا ہی تھا لیکن پرتگال اور انگریزی کا بھی کچھ کم اثر نہیں پڑا البتہ زبان ڈچ اور فرنچ کے جمائے ہوئے نقوش یا تو مٹ گئے یا ہیں بھی تو اس قدر دھندلے کہ معلوم نہیں ہوتے۔ پرتگالی اور انگریزی دونوں نے اُردو لغات میں معتدبہ اضافہ کیا۔ سنہ ۱۵۴۰ع میں ہندوستان کے مشہور بندرگاہوں پر اہل پرتگال قابض تھے اور ممالک مشرق میں گویا تجارت انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ اُن کی آبادیاں ہندوستان کے سواحل پر اور اندرون ملک میں بھی تھیں۔ اُن کا تعلق ہندوستان سے عارضی نہ تھا بلکہ وہ بحیثیت تاجر و حاکم اور مبلّغ کے یہاں رہتے تھے، انھوں نے بہت ترقی کی تھی اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں اُنکی زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان عام ہوگئی تھی جو محض ہندوستانیوں اور اہل یورپ کے درمیان تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہی نہ تھا بلکہ خود یورپ کے یہ سوداگر بھی آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ اسی میں عیسائی پادری اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اُس کو بہت ایسے موقع ملے کہ وہ اپنا اثر یہاں کی دیسی زبانوں پر ڈال سکی۔ سب سے زیادہ اثر

بنگلہ زبان پر پڑا۔ اسی طرح دروا ڑی زبانیں مثلاً مرہٹی، آسامی، اور اڑیا بھی اس سے بہت کچھ متاثر ہوئیں۔ اُردو بھی اُس کے لغات سے بہت متمتع ہوئی۔ یہ اثر اتفاق سے شمالی ہندوستان میں اسوقت پڑ رہا تھا جب دکھنی زبان جو پرتگالی کے اثر سے بسبب قربت کے بہت کچھ متاثر ہو چکی تھی اور نیز اسی طرح کی دوسری زبانیں اُردو پر اپنا اثر اچھی طرح ڈال رہی تھیں۔ پرتگالی الفاظ دیسی زبانوں میں اصلی حالت پر باقی نہیں رہے بلکہ جس بگڑی ہوئی شکل میں وہ ہندوستان میں بولے جاتے تھے اور ہندوستانی زبانیں اُن کو قبول کر سکتی تھیں اُسی ہیئت پر وہ اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ اہل پرتگال نے محض اپنی زبان کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں داخل نہیں کیے بلکہ بہت سے عربی، فارسی، اور ہندی الفاظ بھی اکثر یورپی زبانوں میں پہنچا دیے۔ اس کے علاوہ اکثر عربی اور فارسی لفظ پرتگالی سے مسخ ہو کر داخل ہوے مثلاً وہ الفاظ جو عربوں کے فتح اندلس کے زمانے میں اُن ممالک میں رائج ہو گئے تھے۔ پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں بکثرت بولے جاتے ہیں مثلاً از قسم میوہ جات و اشیاے طعام، اچار، انناس، افوس (قسم انبہ) بسکٹ، کاجو، ہاپیفرے (قسم مچھلی) پپیتا، تمباکو، اترنج، چاء، ساگو، گوبھی وغیرہ۔

از قسم سامان آرائش و آلات و اسلحہ، الپین المارہی، ارغنون، بجرا، بالٹی، بوتل، بپیا، پستول، پریگ، چابی، صابون، کوچ، کپتان، کاربین، کارتوس، میز، تولیہ، گارد وغیرہ۔

مذہبی الفاظ۔ پادری۔ گرجا، گراس وغیرہ۔

لباس میں۔ سایہ، قمیض، کاج، اسپیٹ وغیرہ۔

متفرق الفاظ مثلاً انگریز، آیا، بمبا۔ پاگر (تنخواہ) پاؤروٹی۔ چھاپہ، نیلام، مستری، کمرہ، اد پبیہ وغیرہ۔

اہل پرتگال ہی نے سب سے پہلے یورپ کی اکثر چیزوں کی اشاعت ہندوستان

ہیں کی لہٰذا اُن کے نام بھی اسی طرح رائج ہوگئے جس طرح کہ وہ لوگ اپنی زبان میں بولتے تھے مرزا غالب "شراب پرتگالی" کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ زبان انگریزی ایک زندہ اور حاکموں کی زبان ہے اس لئے اپنا اثر بہت کچھ ڈالا ہے اور ڈالتی رہے گی۔ انگریزی علم ادب نے اُردو نظم و نثر کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا جس کا ذکر مفصل طور پر آئندہ کسی باب میں کیا جائے گا۔ لیکن اتنا اس موقع پر ضرور بتا دینا چاہیے کہ زبان انگریزی نے وہ الفاظ اُردو میں داخل کیے جن کی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ موجود نہ تھا اور وہ الفاظ اب زبان زد ہوگئے۔ ترجمہ کا بھی یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر انگریزی الفاظ اُس کی بدولت اُردو میں شامل ہوگئے۔ اُردو میں انگریزی الفاظ بکثرت داخل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اسی طرح وہ انگریزی الفاظ جو بضرورت اُردو میں داخل اور مستحکم ہوگئے ہیں خارج کرنا بھی اندیشہ سے خالی نہیں ہے۔ اُردو کو مالدار ہونا چاہیے اور ہر طرح کے الفاظ جو اس کی اصل سے میل کھاتے ہوں اس میں ضرور داخل ہونے چاہئیں خواہ وہ انگریزی ہوں یا فارسی یا سنسکرت صرف یہی ایک طریقہ زبان اُردو کی تکمیل اور اُس کی ترقی کا ہے اور اسی طرح وہ ایک اعلیٰ درجہ کی زبان اور ہندوستان کی عام زبان بن سکے گی۔

نثر اور نظم کی زبان ہر زبان میں نظم و نثر کی عبارت میں فرق ہوتا ہے۔ عبارت میں متانت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لیے اور نیز اس خیال سے کہ نثر اور نظم میں فرق معلوم ہو نظم کی عبارت بہ نسبت نثر کے زیادہ شاندار ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ معمولی اور سادہ الفاظ اور معمولی بول چال کی ترکیبیں جو نثر میں عام طور پر پائی جاتی ہیں نظم میں ناجائز سمجھی جاتی ہیں یہی وجہ تھی کہ فارسی محاورات اُردو نظم میں بکثرت شامل کر دیے گئے۔ اگر اُردو نثر کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع میں مقفیٰ عبارت بہت پسند کی جاتی تھی جس میں بیحد تکلف اور تصنع ہوتا تھا۔ بہترین طرز وہ تھا جس میں ظہوری اور بیدل کی مرصع نگاری کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہماری پرانی نثر نگاری کی مثال باعتبار عبارت کی رنگینی اور قافیہ بندی

کے بعینہ وہی ہے جو انگلستان میں ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں انگریزی نثر کی تھی۔

مرزا غالب بلکہ سرسیّد احمد خاں کے زمانے سے ایک نیا دور شروع ہوا جبکہ مغربی تعلیم کے اثر سے وہ پرانا رنگ بدل گیا اور مقفیٰ عبارت اور فارسی کی رنگینیت کی جگہ اب بے تکلف اور سادہ عبارت پسند کی جانے لگی۔ دورِ جدید میں نثر نگاری کی وہ شان باقی بھی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ عملی دنیا میں سیدھے سادے صاف اور زوردار الفاظ کی ضرورت ہے اب بھی فارسی الفاظ کی کثرت ضرور ہے لیکن اس سے عبارت کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ کسی قسم کا تصنع پیدا ہوتا ہے۔ ہندی محاورات خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں اور پیچیدہ بندشوں سے گریز کیا جاتا ہے لیکن گلستان نظم کی آبپاشی اب بھی چشمہ فارسی ہی سے ہوتی ہے اور اس کا چمن اب بھی انھیں صنعتوں سے آراستہ کیا جاتا ہے ہندی الفاظ و محاورات استعمال ہوتے ہیں مگر کمی کے ساتھ اور صرف اُسی وقت جب وہ فارسی الفاظ کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔

نثر کی طرح نظم میں بھی کچھ تغیر ہو چلا ہے اور موجودہ رنگ میں بجائے پرانی لفاظی اور تصنع کے سادگی اور بے تکلفی بہت پسند کی جاتی ہے لیکن باوجود اس کے اکثر اہل ادب اب بھی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے دلدادہ ہیں مگر ان کی کثرت اور جا و بیجا استعمال کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ہماری رائے میں نظم اور نثر کی عبارت اور انشا پردازی میں کوئی اصولی اور اہم اختلاف نہیں ہے۔

ادبی اُردو تقریری زبان تحریری زبان سے بالکل علیحدہ ہے۔ سادہ اور روزمرّہ کے جملے جو ہر وقت زبان پر چڑھے ہوتے ہیں تحریر میں آتے وقت فارسی الفاظ سے بدل جاتے ہیں جس کی وجہ اُن کی جدّت عظمت اور شانداری ہے۔ ابتدا میں بیشک زبان کا دائرہ بہت تنگ اور الفاظ کا ذخیرہ کم تھا اور وہ ایک مستقل زبان کہلانے کی مستحق نہ تھی کیونکہ اُس وقت تک اِس میں بھونڈا پن تھا۔ نہ اُس پر جلا ہوئی تھی اور نہ اتنی صلاحیت اس میں تھی کہ

اس کے ذریعہ سے باریک اور نازک خیالات ادا ہوسکیں یا مختلف خیالات کا اظہار اچھی طرح کیا جا سکے ۔ اُس میں ایک قسم کا لوچ اور الفاظ اور بندشوں کے جذب کرنے کا مادہ ضرور تھا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو جو الفاظ اور بندشیں اس کو ملتی گئیں وہ سب اس میں شامل ہوتی رہیں ۔ رفتہ رفتہ زبان میں پختگی اور صفائی آتی گئی ۔ دَورِ اول کے شاعر ایسی زبان میں لکھتے تھے جس میں آدھی اُردو اور آدھی فارسی ہوتی تھی رفتہ رفتہ اُردو کا عنصر غالب ہوگیا اور غالب نے مغلوب کو جذب کرلیا ۔ فارسی الفاظ اور غیر مانوس فارسی ترکیبیں اس طرح اُردو میں مل گئیں کہ اب وہ ہماری زبان کا جزو بن گئیں جن کو اب ہم نکال نہیں سکتے ۔ بعض حضرات جو اس زمانہ میں سنسکرت الفاظ کے دلدادہ ہیں وہ فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو زبان سے نکالنے کی کوشش میں ہیں ۔ ہماری رائے میں یہ ایک فضول اور عبث کوشش ہے کیونکہ یہی کثرت الفاظ جو اُردو کا مایۂ ناز ہیں اُس کو اتنا لوچ دار اور مضبوط بنائے ہوئے ہیں کہ ہر ادبی کام اس کے ذریعہ سے نکل سکتا ہے ۔

زبان اُردو کے قدیم نام قدیم انگریز مورّخ جنھوں نے ہندوستان کے حالات لکھے ہیں، اُردو کو لفظ " اندوستان " سے تعبیر کرتے تھے شروع اٹھارھویں صدی کے مصنفوں نے زبانِ لاطینی میں اُس کو " لنگوا اندوستانی کا " لکھا ہے ۔ اس سے بھی پہلے کے انگریز مورّخین اُس کو " مورز " کہتے تھے ۔ جان گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ئ میں سب سے پہلے لفظ " ہندوستانی " زبان اُردو کے واسطے استعمال کیا اور جبھی سے یہ لفظ مروّج ہوگیا ۔ گوکہ اس کا پتہ بعض قدیم کتابوں میں ۱۶۱۶ئ تک ملتا ہے جبکہ مسٹر پول نے سب سے پہلے اس کو استعمال کیا تھا " اردو معلّی " کا معزز خطاب شاہجہاں نے اس کو دیا جب کہ زبان ادبی خدمات انجام دینے کے قابل اچھی طرح ہوگئی تھی ۔

لفظ " ریختہ " (یعنی وہ زبان جس میں دیسی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال ہوں) بعد کے مصنفین نے اس غرض سے استعمال کیا کہ ادبی زبان و ریختہ

اور بول چال کی زبان (اُردو) میں جو بازاروں اور جاہل فوجی سپاہیوں میں مروج تھی، فرق ہو جائے۔ لفظ ریختہ زبان کے متعلق اب بہت کم استعمال ہوتا ہے ابتدا میں نظم کے واسطے یہی لفظ استعمال کیا جاتا تھا اس وجہ سے کہ نثر کا رواج اس زمانے میں بہت کم تھا میر اور مصحفی تک کے زمانے میں اُردو کو بمقابلہ فارسی کے "ہندی" کہتے تھے جس سے ملک کی دیسی زبان مراد تھی۔

اُردو کا رسم الخط اُردو کے حروف تہجی بالکل وہی ہیں جو فارسی اور عربی کے ہیں۔ البتہ بعض مخصوص حروف جن سے ہندوستانی زبان کی خاص خاص آوازیں ظاہر ہوتی ہیں جو فارسی اور عربی میں نہیں پائی جاتیں اضافہ کر دیے گئے ہیں مثلاً ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ ڑ۔ ڑھ۔ ان حروف کے لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ت۔ د۔ ر۔ پر یا تو چھوٹی سی (ط) بنا دیتے ہیں یا چار نقطے دیدیتے ہیں۔

نظم اُردو نظم اُردو کا عروض فارسی اور عربی کے عروض کا تابع ہے لفظ کے کسی جزو پر زور دے کے پڑھنا جس کو انگریزی میں "ایکسنٹ" کہتے ہیں اُردو میں نہیں ہے البتہ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح اُردو میں بھی حروف علت کی آوازیں کھینچ کر پڑھی جاتی ہیں اور اُس کو "اشباع" کہتے ہیں۔ نظم اُردو میں ردیف اور قافیہ بہت ضروری چیز ہے۔ مروجہ بحریں اُنیس ہیں جن میں سے بعض عربی کے لیے مخصوص ہیں اور بعض میں اتنی ترمیم ہو گئی ہے اور اُن کی صورت ایسی بدل گئی ہے کہ وہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ وزن شعر کے لیے خاص ارکان جو قدما نے مقرر کر دیے تھے اُن کی تکرار یا تغیر و تبدل سے مختلف بحریں قائم ہو گئی ہیں۔ یہ الفاظ عموماً عربی افعال کے مادے ہوتے ہیں اور انھیں سے اشعار کی تقطیع کی جاتی ہے اور بڑی یا چھوٹی بحریں انھیں سے قائم ہیں تقطیع کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو وہی رکن بار بار دہرایا جاتا ہے مثلاً فعولن فعولن فعولن فعولن یا ارکنوں میں ردوبدل ہوتا ہے جیسے فعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔ تقطیع کے خاص قواعد مقرر ہ

ہیں تحریر شدہ حروف کے ساتھ اُن حرفوں کا بھی شمار ہوتا ہے جو پڑھے جاتے ہیں گو تحریر میں نہیں آتے۔ وہ حروف جو پڑھے نہیں جاتے بلکہ محض تحریر میں آتے ہیں تقطیع میں شمار نہیں کیے جاتے۔ الف ممدودہ شروع لفظ میں جب آتا ہے، دو حرف کے برابر اور اضافت جو کھینچ کے پڑھی جائے ایک حرف کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ اُن الفاظ کو جن سے تقطیع کی جاتی ہے "رکن" کہتے ہیں جس کے معنی ستون کے ہیں جس پر عمارت یا خیمہ قائم ہوتا ہے پورے شعر کو "بیت" اور نصف شعر کو "مصرع" کہتے ہیں۔ مصرع کے لغوی معنی "دروازے کا ایک پٹ" ہیں۔ نظم کی مختلف قسمیں جو فارسی میں متداول ہیں اور جو اُردو میں اختیار کی گئی ہیں حسب ذیل ہیں۔

غزل اور قصیدہ یہ سب سے زیادہ مشہور اصناف نظم ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف مضمون اور طول کا ہوتا ہے مگر بحر اور ردیف و قافیہ کی پابندی دونوں میں یکساں طور پر ہوتی ہے۔ غزل کا رنگ عموماً عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے اور تعداد اشعار عموماً ۱۰ سے ۱۲ تک گو کہ اس کی پابندی بہت کم کی جاتی ہے۔ قصیدہ میں عموماً کسی کی مدح یا ہجو ہوتی ہے اور نصیحت آمیز فلسفیانہ رنگ کا بھی ہو سکتا ہے۔ تعداد اشعار عموماً کم از کم ۲۵۔ اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۰ تک مگر اس کی بھی پابندی کون کر سکتا ہے۔

قطعہ جس کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اس کو قصیدے یا غزل کا ایک حصہ سمجھنا چاہیئے۔ تعداد اشعار کم سے کم دو اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ پہلے دو مصرعوں کے لیے ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں لیکن اشعار میں قافیہ کی پابندی لازمی ہے۔ قطعات میں اکثر پند و نصائح کے مضمون بیان کئے جاتے ہیں اور مطلب پورا ہو جاتا ہے۔

رُباعی۔ اس میں دو شعر یا بیت ہوتے ہیں اسی وجہ سے اُس کو دوبیتی بھی کہتے ہیں پہلا، دوسرا، اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں اور زیادہ تر ایک ہی سی بحروں میں کہی جاتی ہے۔ رباعی کے لئے خاص کسی مضمون کی تخصیص نہیں لیکن چوتھے مصرعہ کو

عموماً مؤثر معنی خیز اور زور دار ہونا چاہیئے۔

مثنوی۔ یہ صنف رزم و بزم، حسن و عشق، قصے اور افسانہ نگاری کے لیے مخصوص ہے اس میں ہر شعر کے دونوں مصرعوں کو ہم قافیہ ہونا چاہیئے۔ ردیف ہو یا نہ ہو تعداد محدود نہیں ہے۔ مثنوی کے لیے عموماً پانچ بحریں مروج ہیں مگر بعض کے نزدیک سات ہیں۔ مستزاد اسکو کہتے ہیں کہ جب ہر مصرع کے آخر میں کچھ زائد لفظ بڑھائے جائیں یہ زائد لفظ اُسی بحر میں ہوتے ہیں جو اصلی مصرع کے دو آخری رکنوں کی ہوتی ہے۔ مگر اُن کا قافیہ کہیں علیحدہ بھی ہوتا ہے۔ ترجیع بند اور ترکیب بند، یہ بھی نظم کی قسمیں ہیں ان میں بہت سے بند ہوتے ہیں۔ اور ہر بند میں برابر یا بعض وقت مختلف تعداد ابیات کی ہوتی ہے جو ہم قافیہ ہوتے ہیں، ہر بند کے آخر میں ایک بیت ہوتا ہے جو اوپر کے بند کو نیچے کے بند سے جُدا کرتا ہے اور قافیہ میں بھی اُن سے علیحدہ ہوتا ہے اگر ہر بند کے بعد ایک ہی بیت بار بار آئے تو ایسی نظم کو ترجیع بند کہتے ہیں، ورنہ اگر بیت بدلتا جائے تو ترکیب بند کہلاتی ہے۔ ترجیع بند یا ترکیب بند میں تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ مربع چو مصرعی نظم کو کہتے ہیں، جس میں سب مصرع ہم قافیہ ہوں، مخمس میں بجائے چار کے پانچ مصرع ہوتے ہیں، پانچویں مصرع کا قافیہ بدلا ہوتا ہے اور باقی صورت مربع کی سی ہے مسدس کی شکل بھی قریب قریب ایسی ہی ہے فرق اتنا ہے کہ پہلے چار مصرع یا دو بیت ہم قافیہ اور باقی دو مصرع علیحدہ ہوتے ہیں ان کے علاوہ دیگر اصناف سخن مسبع وغیرہ بھی اسی طرز کے ہیں۔

واسوخت نظم کی وہ قسم ہے جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی، ظلم وستم رقیب کے ساتھ بیجا محبت اور جُدائی کی مصیبت و تکلیف کی شکایتیں کرتا ہے۔ گویا معشوق کو دھمکاتا ہے کہ اگر اُس کا طرز تغافل اور ستم شعاریاں اسی طرح باقی رہیں تو پھر اُسکے ہاتھ سے عنان صبر چھوٹ جائے گی اور وہ معشوق سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

تاریخ نظم کی وہ قسم ہے جس میں کسی واقعہ کے اعداد سنہ حروف ابجد کے حساب سے

نکالے جاتے ہیں۔

فرد۔ کسی تمام یا ناتمام غزل کے کسی ایک شعر کو کہہ سکتے ہیں جو کبھی مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔
قصیدہ اور غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص
نظم کرتا ہے۔ نظم کی کتابوں میں اکثر پہلے حمد و نعت پھر بادشاہ یا ممدوح کی تعریف
اس کے بعد سبب تالیف اور کچھ فخریہ اشعار آخر میں مناجات و خاتمہ ہوتا ہے۔
مجموعۂ نظم کو کلیات کہتے ہیں جس کی ترتیب عموماً اس طور پر ہوتی ہے۔ قصائد۔ غزلیات
قطعات۔ رباعیات۔ مثنویات وغیرہ۔

نثر کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) عاری جو بالکل سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔ (۲) مرجز
جس میں بحر ہوتی ہے مگر قافیہ نہیں ہوتا۔ (۳) مسجع جس میں بحر نہیں ہوتی مگر قافیہ کی
پابندی ہوتی ہے۔ نثر مسجع کی بھی تین قسمیں ہیں (۱) متوازی (۲) مطرف (۳)
متوازن۔ نثر متوازی میں دو فقروں کے آخری الفاظ ہموزن اور ہم قافیہ ہونے چاہئیں
مطرف میں آخری الفاظ کے ہموزن اور ہم قافیہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ متوازن میں
ہموزن ہوتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہوتے۔ یہ تمام قسمیں اب متروک ہیں کیونکہ اُنیسویں
صدی کے آخر میں اس قسم کی مصنوعی عبارت اور قافیہ پیمائی کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ "تذکرہ"
میں شعراء کے سوانح و حالات مختصراً بیان کیے جاتے ہیں اور "گلدستہ" مجموعۂ نظم کا نام ہے۔

باب ۲

اَدب اُردو کی ترقی کے ابتدائی دور

نظم کا تقدم نثر پر۔ اس کے وجوہ اور اس کا تعلق خاص ادب اُردو کے ساتھ

دنیا کے تمام ادبوں کی ابتدا شاعری سے ہوئی شعر
ایک زندہ قوت ہے جس کا وجود نثر سے بہت پیشتر

معلوم ہوتا ہے۔ قافیہ پیمائی اور تک بندی انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ انسان کو پہلے جذبات کا حس ہوتا ہے پھر وہ دماغ کو کام میں لاتا ہے اور سوچتا ہے اسی وجہ سے ارتقاے تہذیب انسانی میں جو مظہر جذبات ہے نثر پر مقدم ہے جو فکر دماغی کا نتیجہ ہے سب سے پہلے جب کہ فن تحریر کی ایجاد نہیں ہوئی تھی شعر ہی اپنے زبردست اثر سے دماغ میں محفوظ رہ سکتے تھے اور قوت حافظہ کی مدد سے مجمع میں سنانے (انشاد) کے قابل بھی شعر ہی ہو سکتے تھے گو کہ ظاہر انثر ہمارے اظہار خیالات اور گفتگو کا آسان ترین اور فطری ذریعہ معلوم ہوتی ہے مگر غور کرنے کے بعد اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ضبط خیالات اور رسمی تحریروں کے واسطے موزوں ہے۔

زبان اُردو کی دیوی اپنے ساز طرب سے آراستہ و پیراستہ اس طرح نمودار ہوئی کہ ادب اُردو جو در اصل فارسی کا متبع اور ناقل ہے اُس کو اپنے پیشرو کی تقلید بہ نسبت نثر کے نظم میں زیادہ آسان اور دلچسپ معلوم ہوئی کیونکہ نقل و ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں نثر میں اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ فی الحقیقت نظم میں ہوتا ہے۔ اور چونکہ اُردو اپنی ارتقائی منزلوں میں جبکہ اُس کا ادب ہنوز عالم طفلی میں تھا قوت تخئیل اور اظہار جذبات کے واسطے ایک زبردست سرمایہ الفاظ کا اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی لہذا جب اُس کی پیدایش کا وقت آیا تو وہ اپنے اُستادوں کے دماغوں سے منروا[1] کی طرح دفعۃً نکل آئی اور اظہار خیالات و جذبات کے لیے چونکہ نثر عام طور پر نہیں پسند کی جاتی ہے۔ لہذا متقدمین اُردو نگار بھی اس صنف کے استعمال سے شروع میں پرہیز کرتے رہے۔

زبان اُردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ اتنا دھندلا نظر آتا ہے کہ اُس کے خط و خال صاف طور پر نمایاں نہیں مگر اس میں کوئی	سب سے پہلا اُردو شاعر امیر خسرو دہلوی

[1] یہ یونانی دیو مالا کی طرف اشارہ ہے جس میں مرقوم ہے کہ منروا جو یونانیوں میں عقل و علم اور جنگ کی دیوی مانی جاتی تھی جیوپیٹر کے سر سے نہایت مکمل اور آراستہ دفعۃً پیدا ہوئی تھی۔

شک نہیں کہ سب سے پہلا شاعر زبان اُردو کا اس دُھندلکے میں جو صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے وہ حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں جن کی شہرت بحیثیت ایک فارسی شاعر کے کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں۔ ان کا لقب اسی شاعری کی مناسبت سے "طوطیٔ ہند" ہے انھوں نے سب سے پہلے اُردو الفاظ ادبی اغراض سے استعمال کیے اور سب سے پہلے[۱] اُردو میں شعر کہا، سب سے پہلی غزل اُردو بھی امیر خسرو ہی کی طرف منسوب ہے مگر اُسکی ترکیب اس طرح ہے کہ اس کا ایک مصرع فارسی ایک اُردو ہے اور بحر فارسی ہے اُسکے علاوہ اکثر پہیلیاں، مکریاں، انملیاں، دوسخنے دوہرے وغیرہ جو آج تک مشہور ہیں ان کی طرف منسوب ہیں۔ بعض شعر ایسے بھی ہیں جس میں ٹھیٹھ ہندی الفاظ جو بمشکل اُردو کہے جا سکتے ہیں سنسکرت بحروں میں بندھے ہیں، گو فارسی الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال ہوئے ہیں حضرت امیر خسرو تیرھویں صدی عیسوی میں ضلع ایٹہ (ممالک متحدہ آگرہ و اودھ) میں پیدا[۲] ہوئے اور متعدد شاہان دہلی مثلاً غیاث الدین بلبن، معزالدین کیقباد وغیرہ کے درباروں میں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ وہ مشہور صوفی و مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے مرید و محبوب خاص تھے جن سے ان کو اتنی محبت و عقیدت تھی کہ جب پیر کے انتقال کا حال سُنا تو اسی غم میں چند روز کے بعد سنہ ۱۳۲۵ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔ بلبن اُن کی بڑی قدر کرتا تھا اور اُن کے کلام کا دلدادہ تھا۔ امیر خسرو فن موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے فارسی بحور اُردو میں استعمال کیں اور اُن کی کتاب "خالق باری" جس کے مطلع کے ابتدائی الفاظ یہی دو لفظ "خالق" اور باری" ہیں ابتک ہمارے ہیاں ایک مشہور

---

[۱] فارسی میں ایک نئی صنعت ایجاد کی ہے جس کا نام ترجمۃ اللفظ رکھا ہے یعنی فارسی لفظ کا ترجمہ اُردو میں کر دیا ہے مثلاً" سودا اے رُخ تو کشت مارا" کشت کے معنی اُردو میں مار اکے ہیں۔

[۲] مقام ولادت پٹیالی ضلع ایٹہ ہے اور سنہ ولادت سنہ ۶۰۵ھ ہے۔

درسی کتاب سمجھی جاتی ہے. جس کو بچے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں. امیر خسرو کی شہرت زبان اردو کے شاعر یا ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ وہ اُسکے موجد و مخترع کہے جا سکتے ہیں. اُن کے زمانے میں زبان میں روانی پیدا ہو چلی تھی مگر پختگی ہنوز نہیں آئی تھی اور متانت الفاظ بھی بہت محدود تھی. مختصر یہ کہ اُن کا دور ابتدائی دور ہے اور گو اُسوقت تک زبان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی مگر آیندہ ترقیوں کی داغ بیل اسی زمانہ میں پڑ گئی تھی۔

اردو کی پختگی کا زمانہ

امیر خسرو کے زمانہ سے لے کر دکن کے شعرائے اردو کے عہد تک بڑا فصل ہے مگر زبان نے گو اس طویل عرصہ میں جو تین صدیوں سے کم نہ تھا کوئی نمایاں ترقی نہیں کی پھر بھی یہی مدت اس کے حقیقی نشو نما اور مضبوطی کی کہی جا سکتی ہے. زبان اب تک غیر منظم حالت میں تھی اور قوت، لوچ، اور وسعت کی اس کو سخت ضرورت تھی. سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بلند انشا پردازی کی اغراض کے لیے اُس کے لغات میں معتدبہ اضافہ ہونا چاہئیے تھا اسی وجہ سے مناسب فارسی الفاظ کو اُس نے اپنے آغوش محبت میں بے تکلف اور بڑے شوق سے جگہ دی. چنانچہ ملک محمد جائسی (۱۵۴۰ء) کی پدماوت جو فارسی حروف میں تحریر ہوئی تھی کبیر (۱۴۴۰ء لغایت ۱۵۱۸ء) کے بھجن اور بابا تلسی داس (۱۵۵۰ء لغایت ۱۶۲۴ء) کی تصانیف میں ایسے الفاظ کا بخوبی پتہ چلتا ہے.

زرین عہد اکبری زبان اردو کی توسیع کے جو لوگ شائق تھے انھیں اس زبان کو مختلف طبقوں کے لوگوں تک پہونچانے اور اُس کو پھیلانے کے لیے دونوں قسموں کے الفاظ یعنی ملکی اور غیر ملکی دونوں کے استعمال کرنے کی ضرورت تھی. اس کوشش کی رفتار عہد اکبری ہی میں بہت تیز تھی شہنشاہ اکبر کا دل چاہتا تھا کہ ملک کی مفتوح رعایا اور باہر کے فاتح زبان کے ذریعہ سے شیر و شکر ہو جائیں. چنانچہ وہ خود بھی کبھی کبھی دیسی زبان یعنی ہندی میں شعر کہتا تھا اور اُس کے اہل دربار بھی اس کی تتبع میں ہندی میں کہتے تھے اور ہندی شاعروں کی بڑی قدر کرتے تھے. اس کے درباری شاعر سنسکرت

سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے۔ فیضی نے اکثر ہندی دوہرے کہے او عبد الرحیم خاں خانخانان دربار اکبری کا رکن اعظم اور فارسی کا مشہور شاعر ہندی کا بھی اچھا خاصہ شاعر تھا۔ چونکہ فاتح اور مفتوح دونوں قوموں میں دلی یکجہتی اور اتحاد تھا اس وجہ سے زبانوں میں بھی اتحاد پیدا ہوا اور کئی زبانوں سے مل کر ایک نئی زبان پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں راجہ ٹوڈر مل نے ایک بڑا کام کیا جو اُردو کی اشاعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ملک کے مالی حسابات پہلے دیسی زبان میں لکھے جاتے تھے جن کو مسلمان افسران صیغۂ مال اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے اور حساب کی جانچ پرتال میں ان کو مجبوراً مترجم سے مدد لینا پڑتی تھی اور اس طرح دیسی حساب نویسوں اور غیر ملکی حساب فہموں میں ایک بعد رہتا تھا جس کو راجہ ٹوڈر مل نے اس طرح رفع کیا کہ مسلمان افسروں کو ہندی زبان اور ہندو محاسبوں کو زبان فارسی سیکھنے کی سخت تاکید کی اور اسکا حکم دیدیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان فارسی کی تعلیم حصول ملازمت اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کے واسطے بہت ضروری قرار پا گئی۔ کسی قسم کی ترقی اور دربار رسی بغیر بادشاہ کی زبان جاننے ہوئے ممکن نہ تھی۔ ٹوڈر مل نے حکم دیدیا کہ صیغۂ مال میں جو لوگ ملازمت کرنا چاہیں اُن کے لیے زبان فارسی کی تحصیل لازمی ہے پس جس چیز کی ابتدا اکبر کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی وہ شاہجہاں کے عہد میں درجۂ تکمیل کو پہونچی اور اب زبان اس قابل ہو گئی کہ وہ ادبی اغراض میں کام آسکے۔ ترقی اور درستی اور اصلاح کا کام بیشک زبان مین برابر جاری رہا بلکہ ہمارے نزدیک اب تک جاری ہے۔

قدیم شعرائے دکن اور دربار شاہان گول کنڈہ و بیجاپور

امیر خسرو کے زمانہ کو زبان اُردو کی نمود کے واسطے صبح کاذب کہنا بجا ہے جس کی صبح صادق ہمارے نزدیک ملک دکن کے مطلع پر مسلمان شاہان بیجاپور و گول کنڈہ کے عہد میں نمودار ہوئی جس کے اسباب کو ہم نے اس کتاب میں آگے چل کے وضاحت سے لکھا ہے۔ بادشاہان مذکور خود

صاحبان علم وفضل اور اہل علم کے بڑے قدردان تھے۔ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۱-۱۶۱۱ء)، سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱-۱۶۲۵ء)، عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵-۱۶۷۲ء)، ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۷۲-۱۶۸۲ء) جو ۱۷۰۰ء میں قید میں مرا) یہ سب خود بھی شاعر اور شاعروں کے بڑے مربّی اور قدردان تھے۔ محمد قطب شاہ۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن زبان دکھنی میں شعر کہتے تھے جو اُردو ہی کی ایک شاخ ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی ان سب نے غزل، رباعی، مثنوی، قصیدے اور مرثیے لکھے جو اس زمانہ میں موجود مگر بہت کمیاب ہیں۔ اسی طرح بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰-۱۶۲۶ء) اور علی عادل شاہ اول (۱۵۵۸-۱۵۸۰ء) خود بھی قابل بادشاہ تھے اور اہل فن کے بڑے قدردان تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فن موسیقی پر زبان ہندی میں ایک مشہور کتاب لکھی ہے جس کا دیباچہ بزبان فارسی اُس کے دربار کے مشہور شاعر و نثار ملا ظہوری ترشیزی متوفی ۱۶۱۷ء کا لکھا ہوا زبان فارسی کی ایک بے مثال تحریر سمجھا جاتا ہے اور آگے چل کر اکثر اُردو نثاروں نے اسکی نقل کی بڑی کوشش کی ہے۔ اسی طرح علی عادل شاہ اول بھی بڑا قابل بادشاہ تھا جس کے دربار کے مشہور شاعر نصرتی کی اکثر تصانیف موجود ہیں جن میں مثنوی گلشن عشق اور علی نامہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے بلکہ کثرت سے زبان دکھنی کے الفاظ اور قدیم متروک الفاظ کے خلط ملط سے اکثر جگہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کتابوں کی وقعت اس قدر ضرور ہے کہ وہ زبان وادب اُردو کی تدریجی ترقی کی قابل قدر مثالیں ہیں۔

ولی دکھنی ۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء

جب ولی کا نیّر اقبال چمکا تو چھوٹے چھوٹے تارے جو افق شاعری پر اُس وقت ضیا فگن تھے سب ماند پڑ گئے۔ ولی کو ریختہ کا موجد۔ گویا اُردو کا چاسر[1]

[1] چاسر زبان انگریزی کا بہت قدیم شاعر ۱۳۴۰ء تا ۱۴۰۰ء اُس کی مشہور تصنیف کنٹربری ٹیلیس (کنٹربری کے قصے) کی زبان قدیم ہے اور مروّجہ زبان سے بہت مختلف ہے۔

نواب خان خاناں

خیال کرنا چاہیئے ۔ اسی زمانہ میں اُردو شاعری کا سنگ بنیاد باقاعدہ طور سے رکھا گیا۔
ولی کا کلام شمالی ہند کے تمام نظم نگاروں کے واسطے نمونہ بن گیا اور اسی کو دیکھ کر اور اپنے
سامنے رکھ کر اسوقت کے تمام شعرائے دہلی نے ترقی کرنا شروع کی ۔ ولی کا کلام نہایت
صاف، سادہ فصیح اور پیچیدہ استعارات اور دور از کار تشبیہوں سے پاک ہے تصوف کا بھی
رنگ جھلکتا ہے ۔ فارسی الفاظ اور خیالات کی کثرت ضرور ہے مگر غلبہ نہیں ہے ۔ ہندی
لفظ بھی فارسی الفاظ کے ساتھ جا بجا ملے جلے ہیں جو بعد کو متروک ہو گئے ۔

قدیم شعرائے دہلی حاتم، آبرو، آرزو

دیوان ولی کی اشاعت کے ساتھ ہی مرکز شاعری گویا دکھن سے منتقل
ہو کر دہلی میں آگیا اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگوں کو ایک خاص دلچسپی
شعر و شاعری کے ساتھ پیدا ہو گئی سیکڑوں تبع ولی کے پیدا ہو گئے جو اُن کے کلام کی بڑی
قدر کرتے تھے اور اسی طرز پر کہتے تھے ۔ اب اُردو شاعری فارسی کے دوش بدوش ترقی
کرنے لگی گویا اسکی مدمقابل اور حریف بن گئی گو ابھی تک اس میں وہ کہنگی اور پختگی نہیں
پیدا ہوئی تھی جس سے اسکی حریف زبان فارسی کو کوئی اندیشہ ہوتا نظم اُردو اب تک ایک
کھلونا سمجھی جاتی تھی جس کو لوگ پسند ضرور کرتے تھے اور فارسی کلام کی محنت و دماغ سوزی
کے بعد اُسی سے دل بہلاتے تھے سلطنت مغلیہ گو بہت کمزور ہو گئی تھی مگر اب تک اس میں
جان باقی تھی اور درباری زبان اب تک فارسی ہی تھی ۔ اُردو کے کمزور اور نوخیز بچہ کو اتنی
قوت کہاں تھی کہ فارسی کے شہزور پختہ کار پہلوان سے مقابلہ کر سکے ۔ اس لیے اُسے
مقابلہ کی جرات نہ ہوتی تھی ۔ قدیم شعرائے اُردو سب سے بڑے بڑے فارسی داں اور
فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے ۔

ولی کے تبع ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء) خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء)
ناجی مضمون، آبرو اور بہت سے اور شعراء پیدا ہوئے جن کو اُردو شاعری کے آبا سمجھنا چاہیئے
ان کا کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا بہت صاف و سادہ اور تصنع و تکلف سے بہت کچھ

پاک وصاف ہے نشست الفاظ میں بہت زورِ طبع دکھایا گیا ہے اور فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں۔ دلی کے یہاں جو ہندی الفاظ تھے وہ ان لوگوں کے یہاں نہیں یا بہت کم ہیں ان کی جگہ فارسی لفظوں نے لے لی ہے۔ فارسی بحریں اُردو نظم میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بہت خوبی سے بندھی ہیں۔ ان کے زورِ طبیعت اور قدرت کلام میں کسی کو کلام نہیں اور ان کی مشّاقی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور نقش اول سے نقش ثانی یقیناً بہتر ہے گو فارسیت کا رنگ اور تصنّع بہ نسبت دکھنی شعرا کے ان میں زیادہ ہے۔ مقامی رنگ گو بالکل غائب نہیں مگر رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے ہندی دوہروں کا بھی کچھ اثر اشعار میں پایا جاتا ہے۔ قدیم شعرائے دہلی کا کلام اُردو کی تدریجی ترقیوں کی منزل میں ایک نمایاں نشان ہے۔

میر و سودا کا زمانہ۔ اس زمانہ کی ترقیاں، زباں اور شاعری میں اصلاحیں

یہ زمانہ اُردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس میں محبوبۂ شاعری مع اپنی تمام کرشمہ سازیوں کے زینت الفاظ اور جدّتِ خیال سے آراستہ و پیراستہ ہو کر دنیا کے سامنے نمودار ہوئی۔ یہ میرؔ اور سوداؔ کا زمانہ ہے جو اُردو شاعری کے رکن رکین اور اُستاد اعظم مانے جاتے ہیں یہ دونوں بزرگ اپنے حسن ادا حلاوت زبان قدرت الفاظ اور نزاکت زبان کی وجہ سے اپنے تمام ہمعصر اور نیز ماسبق حریفوں پر گوے سبقت لے گئے اِن کے مبارک زمانہ میں غزل اور قصیدہ دونوں معراج ترقی پر پہونچ گئے۔

مرزا مظہر جانجاناں، میر دردؔ، سوزؔ، قائمؔ، یقینؔ، بیانؔ، ہدایتؔ، قدرتؔ اور ضیاؔ ان کے ہمعصر ہیں جو سب علاوہ اُردو کے نظم فارسی کے بھی اُستاد تھے۔ چونکہ ان سب پر فارسی کا رنگ غالب تھا لہذا وہ قدرتًا ہندی الفاظ پر فارسی کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ وہی اُن کو اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں زبان بہت کچھ ایسے الفاظ اور بندشوں سے پاک ہوگئی جو ولی اور اُن کے ہمعصر شعرائے دہلی کے

یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ بہت سے خوبصورت اور مناسب فارسی لفظ اور محاورے خواہ بجنسہ یا بصورت ترجمہ زبان میں داخل کر لیے۔ ان کا کلام اُردو اور فارسی کی آمیزش سے گنگا جمنی ہے۔ حسن و عشق کے معاملات جس خوبصورتی اور مؤثر طریقہ سے ان حضرات نے باندھے اس سے پیشتر کسی نے نہیں باندھے تھے۔ ان کے کلام کو دیکھ کے تعجب ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی لغات کا خزانہ انھوں نے کھنگال ڈالا جس میں سے صدہا جواہر ریزے منتخب کر کے زبان میں داخل کیے گئے ہیں۔ گل و بلبل اور قمری و شمشاد کے عشق کے افسانے جس کو فارسی شعرا مدت سے باندھتے چلے آتے تھے اب اُردو میں بھی داخل ہوے اور جدید خیالات اور نئی ترکیبوں کے ساتھ بڑے حسن و خوبی سے برتے گئے ...... فن شعر میں بھی ایک نمایاں ترقی ہوئی نقائص اور معائب سے کلام پاک ہونے لگا۔ غزلیں ایسی بحروں میں کہی جانے لگیں جو اس سے پیشتر مروج نہ تھیں اور کانوں کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے اور صنائع بدائع جن کو اب تک کلام میں جگہ نہیں ملی تھی بکثرت استعمال ہونے لگے مگر اُسی حد تک کہ ان سے شعر کے حسن اور ادائے مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ وہ کلام میں گھل مل جاتے تھے اور بدنما نہیں معلوم ہوتے تھے۔ نئے نئے اصناف شعر بھی اسی عہد میں رائج ہوے۔ مثلاً واسوخت، مرثیہ، مخمس، ہجو، مثلث، مربع اور مستزاد وغیرہ اور یہ سب فارسی سے لیے گئے اور خوب خوب کہے گئے۔ جو اصناف سخن پیشتر سے مروج تھے ان میں بھی ترقی ہوئی صنعت ایہام جو قدما میں جاری تھی اس زمانہ میں کم ہو گئی گو بعد کو پھر رائج ہو گئی میر کو یہ صنعت کم پسند تھی لیکن اگر بلا تکلف اور کسی دوسری صنعت کے ساتھ بندھتی اور کلام کا حسن بڑھتا تو مضائقہ بھی نہ تھا مظہر اور اُنکے اکثر معاصرین اور متبعین نے بھی اس معاملہ میں میر ہی کا مسلک اختیار کیا۔ اس زمانہ کے شعرا بعض اصناف سخن کے محض موجد ہی نہ تھے بلکہ

انھوں نے اس میں بڑی بڑی ترقیاں کیں اور آیندہ ترقی کی راہ بتا گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی ایجادیں فارسی ترکیبوں سے ماخوذ تھیں اور انھیں پر مبنی تھیں اس عہد میں زبان اُردو نے علی العموم زبردست ترقی کی اس میں قوت وسعت اور لوچ باحسن وجوہ پیدا ہوا اور نئے نئے لفظ اور محاورے اور ترکیبیں زبان میں داخل ہوئیں جن سے آئندہ ترقی کا دروازہ کھُل گیا۔

انشا اور مصحفی کا دور اُن کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ

ایک دوسرا دور بعد کے شعرائے دہلی سے شروع ہوا جس میں آثر میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، ناسخ، لقا، حسرت، رنگین اور فراق مشہور زمانہ ہوے۔ اس زمانہ میں بھی وہی پرانی ترکیب ہندی الفاظ خارج کرنے اور اُن کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ داخل کرنے کی برابر جاری رہی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ہندی اور بھاشا لفظ جو خارج کیے گئے بدنما اور ثقیل ضرور تھے اور نظم کی صنعت نازک ان کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی مگر اُن کے ایک قلم نکال دیے جانے سے دیسی زبان کی ترقیوں کو سخت نقصان پہونچا ایسے جواہر ریزے جو سنسکرت اور پراکرت کے خزانوں سے زبان اُردو کے قبضے میں ایک عرصۂ دراز سے چلے آتے تھے فارسیت کے غلبہ سے اب خارج ہو گئے۔ قدیم اُردو شاعر سنسکرت اور ہندی سے ناواقف تھے اسی لیے اُنھوں نے ہندی الفاظ کی کوئی قدر نہیں کی اُن کو زبان سے خارج کر دیا اور ان جگہ پر فارسی اور عربی الفاظ رکھ دیے۔ اس کارروائی کو وہ لوگ اور نیز اس زمانے کے مسلمان مصنفین جو فارسی کا ذوق رکھتے تھے "زبان کی اصلاح اور پختگی" سے تعبیر کرتے ہیں اسی عہد میں ایک اور ترقی یہ بھی ہوئی کہ پرانے متروکات جو میر و سودا کے زمانے میں باقی رہ گئے تھے نکال دیے گئے اور اُن کی جگہ جدید خوبصورت لفظ اور ترکیبیں داخل کی گئیں۔ ہندی اور فارسی محاورے اور ترکیبیں باہم ملا دی گئیں۔ طرز عبارت میں کچھ فرق نہیں ہوا مضامین میں بھی کوئی خاص جدت نہیں ہوئی البتہ ابتذال اور شہوت پرستی کا رنگ پیدا ہو گیا

اس دور کی شاعری اُس زمانہ کی اخلاقی حالت اور دہلی کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا پورا نمونہ ہے۔ معشوق کے حُسن ظاہری کی تو عام طور پر تعریف کی جاتی تھی مگر بعض شعرا نے کھلم کھلا ایک اور رنگ اختیار کیا جس کو اصطلاح میں "معاملات" یا "معاملہ بندی" کہتے ہیں۔ جرأت، انشا اور رنگین اس خاص رنگ کے بادشاہ تھے۔

ریختی یہ حُسن پرستی اور شہوت پرستی بعد کو ایک خاص طرز میں ظاہر ہوئی جس کا نام "ریختی" یعنی عورتوں کی زبان رکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ریختہ سے نکلا ہے اور اس کا مؤنث ہے۔ عورتوں کی زبان بالذات کوئی مذموم بات نہیں، مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کے اشعار جذبات نفسانی برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہے جاتے تھے اور اسی وجہ سے وہ نہایت فحش اور مخرب اخلاق اور شرفا کے کانوں تک کو ناگوار ہوتے تھے۔ ایسی کل چیزیں جو عورتوں کے پڑھانے کے قابل نہیں ہوتیں غیر مہذب اور فحش ہوتی ہیں عورتوں کی تعلیمی ترقی ہر ملک اور ہر قوم میں زبان کی اصلاح اور ترقی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ ریختی کی مثالیں پرانے شعرا کے کلام میں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں، مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری اور سید محمد قادری ہمعصر ولی کے کلام میں بھی اس رنگ کا کچھ پتہ چلتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو یہ بالکل متروک ہوگیا تھا۔ اس کو دوبارہ سعادت یار خاں رنگین اور اُن کے دوست انشا نے زندہ کیا۔ سب سے بڑے ریختی گو میر یار علی خاں متخلص بہ جان صاحب سمجھے جاتے ہیں۔ انشا مختلف طرز کے شعر کہتے تھے۔ کبھی ریختی بھی کہہ جاتے تھے مگر جان صاحب نے اس کو ایک فن قرار دیا اور سوائے اس رنگ کے کچھ نہیں کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ صنف شاعری زمانہ کے ساتھ بہت کچھ بدل گئی ہے اور اب تقریباً متروک ہے۔

اس دور کے شاعر غزل کے اُستاد تھے اور مثنوی اور قصیدہ بھی خوب کہتے تھے لوگوں میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ بزم مشاعرہ اکثر گرم ہوتی تھی۔ اس عہد کے اکثر شاعر

اپنا وطن مالوف دہلی چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل گئے اکثر لکھنؤ پہونچے جہاں دربار شاہی میں شعرا کی بڑی ہی قدر کی جاتی تھی۔ اس زمانہ کی مشہور یادگاریں میر حسن اور خواجہ میر درد کے بھائی میر اثر کی مثنویاں ہیں۔ علی الخصوص میر حسن کی مشہور آفاق مثنوی "سحر البیان" جس کی روانی، سادگی، شیرینی اور رنگینی کا جواب نہیں۔

غالب اور ذوق کا زمانہ اور اس کے خصوصیات

اس دور کی ابتدا شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن اور ظفر سے ہوتی ہے۔ اس میں وہ رہے سہے ہندی الفاظ بھی جو قدما سے باقی رہ گئے تھے نکل گئے اور فارسیت کو اور ترقی ہوئی۔ غالب اور مومن فارسی میں بھی خوب کہتے تھے۔ چنانچہ اُن کی اکثر تصانیف اس زبان میں موجود ہیں غالباً یہی وجہ ہوگی کہ اس زمانہ میں زبان میں فارسی الفاظ کی بھرمار ہوگئی جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا شاہ نصیر کو دور سابق (مصحفی و انشا) اور دور حال (ذوق و غالب) کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیئے۔ یہی زمانہ نظیر اکبر آبادی کا بھی ہے جن کا رنگ سب سے علیحدہ ہے اور ادب اُردو میں ایک نہایت نمایاں اور خاص رنگ ہے۔ غالب و مومن کے یہاں ہم کو ان مشکل اور دقیق فارسی ترکیبوں اور محاوروں کی ابتدا ملتی ہے جو استادوں کے قلم سے تو بُرے نہیں معلوم ہوتے مگر معمولی قابلیت والوں کے ہاتھ میں وہ بالکل غارت ہو جاتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اس قسم کی زبان جس پر فارسی کا اتنا رنگ غالب تھا زیادہ رواج پذیر نہیں ہوئی۔ ورنہ پھر اُردو اور فارسی میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ اسی فارسیت کے غلبہ کی وجہ سے مومن اور غالب کا اکثر کلام سمجھ میں نہیں آتا۔ ذوق گو بلحاظ شاعری غالب سے ذہانت و طباعی میں کم ہیں مگر زبان پر اُن کی قدرت مسلّم ہے اور محاورات و امثال میں تو ضرب المثل ہیں۔ اُن کا کلام نہایت صاف اور بہت مزے کا ہوتا ہے۔ ظفر کے یہاں کچھ خاص خوبیاں ہیں وہ غالب و ذوق کے ہم پلہ نہیں بلکہ اُن سے اصلاح لیتے تھے۔ ظفر اور ذوق کے کلام میں بہت مشابہت ہے جس سے بعض لوگوں کو شبہ

ہوتا ہے کہ یہ ظفر کا کلام ہی نہیں بلکہ اُن کے اُستاد ذوق کا کہا ہوا ہے۔ اس زمانے میں غزل اور قصیدے میں بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ ذوق اور غالب کی غزلیں اور قصیدے اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سنگلاخ زمینوں میں اشعار کہے گئے اور جدید اور مشکل بحریں جو اب تک رائج نہیں ہوئی تھیں استعمال ہونے لگیں۔ شعرا اپنا کمال فن دکھانے کے لئے مشکل قافیے اور ردیفیں باندھتے اور غیر معمولی بحریں اختیار کرتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے مگر اس قسم کا کلام حقیقی شاعری کی لطافت و معنویت سے خالی ہوتا تھا۔ الغرض اس زمانہ میں ہندی الفاظ زبان سے اکثر نکل گئے، فارسی ترکیبیں بکثرت داخل ہو گئیں، خیالات میں جدت اور مضامین میں ندرت پیدا ہوئی جس کا بہترین نمونہ غالب کے کلام کو سمجھنا چاہیئے۔

شعرائے لکھنؤ کا نیا دَور اور اُس کے خصوصیات ناسخ اور آتش کا زمانہ اُن کی خدمات زبان کے ساتھ

ناسخ اور آتش کے زمانہ سے لکھنؤ میں ایک جدید دور شروع ہوتا ہے۔ دہلی پر جب زوال آیا تو وہاں کے اکثر اہل کمال نے لکھنؤ کا رخ کیا اور یہاں آکر پناہ لی۔ دہلی کی شمع سخن سے لکھنؤ کی شاعری کا چراغ جلا اور وہاں بھی بکثرت شاعر پیدا ہونے لگے۔ ناسخ اور آتش کا تعلق بالکل لکھنؤ سے تھا وہاں کے شاہی دربار میں شاعری کی اتنی عزت اور ایسی قدر ہوئی کہ اس سے پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی۔ لوگ شاعری کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ مشاعرے گھر گھر ہوا کرتے تھے۔ قدردانوں کی تعریفیں دل بڑھاتی اور نئی اُمنگیں پیدا کرتی تھیں۔ مشاعرے ماہوار و ہفتہ وار کیا بلکہ اکثر روزمرہ ہوتے تھے۔ اسی کثرت اور مشاقی نے شاعری کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا اور اُس میں طرح طرح کی جدتیں اور رنگینیاں پیدا کیں مختلف اصناف سخن پر قدرت حاصل ہو گئی۔ شاعری کے ساتھ ظاہر ہے کہ زبان بھی صاف ہوتی گئی اور ترقی کرتی گئی۔ جو ہندی الفاظ پیشتر کی تراش خراش اور قطع و بُرید سے بچ گئے تھے وہ بھی اب نکل گئے اور اُن کی جگہ فارسی و عربی

الفاظ نے لی۔ اسی طرح پرانی بندشیں اور ترکیبیں بھی جو زبانوں پر جاری تھیں ترک کی گئیں۔
ناسخ کو یہ فخر حاصل ہے کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج اُنہی کے مبارک ہاتھوں سے پورے ہوئے واقعی اُن کو متروکات کا "ناسخ" کہنا بالکل بجا ہے۔ اُن کے زمانہ سے ایک نیا رنگ شاعری شروع ہوا جس کی خصوصیات یہ ہیں۔ الفاظ شان دار عبارت میں تعقید و تکلف صنائع و بدائع اور دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت فضول مبالغے فرسودہ تشبیہیں جذبات اور اثر کی بہت کمی۔ مگر باوجود اسکے اس رنگ کے بھی بعض شعر مزے کے ہوتے ہیں یہ رنگ بھی اپنے زمانہ میں بہت مقبول ہوا۔ علاوہ ناسخ کے بحرؔ، وزیرؔ، صباؔ، سحرؔ، رشکؔ وغیرہ اپنے زمانہ کے اُستاد مانے جاتے تھے قبولیت کا سہرا اسی رنگ کے سر پر رہا یہاں تک کہ یہ رنگ ایک مرتبہ پھر بدلا اور اشعار میں بے تکلفی۔ سادگی۔ نیچر کی جھلک سوز و گداز اور اثر پسند کیے جانے لگے۔

ناسخ ہی کے ہمعصر آتش بھی تھے جن کا رنگ بالکل علیحدہ تھا۔ وہ غزل کے مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں۔ ہر چند اُن کی درسی تعلیم اور وسعت معلومات ناسخ سے کم کہی جاتی ہے مگر اُن کا کلام ناسخ کے کلام سے کہیں زیادہ شیریں اور مؤثر ہے۔ وہ اپنے خاص رنگ یعنی شستگی الفاظ، چستی بندش، بلند مضامین، میں قدما کے متبع کہے جا سکتے ہیں۔ اُن کے اشعار سوز و گداز اور اثر سے مملو ہیں۔ بلحاظ علمیت وہ ناسخ سے کم ہوں مگر شاید یہ کمی علم ہی زیادتی اثر و کیفیت کا باعث ہے۔ صفائی زبان پر اُن کا بھی بہت بڑا احسان ہے مگر حق یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم کو ناسخ کا زیادہ ممنون احسان ہونا چاہیئے۔ اِن دونوں پہلوانان سخن کے شاگردوں اور پیرؤوں میں بھی اکثر زور آزمائیاں اور مقابلے ہوا کرتے تھے جو ترقی زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔

مراثی اور اُن کا تعلق زبان کے ساتھ

مرثیہ ایک قدیم صنف شاعری ہے۔ اُردو مرثیہ گوئی کو قدما نے نظر استحسان سے نہیں دیکھا اس وجہ سے وہ عرصہ تک ایک

کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی یہاں تک کہ میر خلیق اور اُن کے لائق فرزند میر انیس اور انیس کے معاصر دبیر کے زمانہ میں وہ از سرِ نو زندہ ہوئی اور اُن کے بعد سے تو مرثیہ گو بکثرت پیدا ہونے لگے۔ مرثیہ بہت پرانی چیز ہے عربوں میں یہ پیشتر سے موجود تھی وہاں سے یہ اہل فارس میں آئی اور فارسی سے اُردو میں اس نے رواج پایا۔ قدیم شعرائے دکن نے بھی اُردو میں مرثیے کہے مگر اُن کی زبان کچی اور ابتدائی حالت میں تھی مرثیہ گوئی کی اصلی ترقی لکھنؤ میں ہوئی جہاں اس میں ایک نئی روح پھونکی گئی۔ لکھنؤ کے اکثر امراء اور رؤسا شیعہ مذہب رکھتے تھے جو اعتقاداً شہدائے کربلا کے مصائب پر گریہ و بکا اور اظہار غم والم کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ زمانہ عزاداری اب بجائے دس دن (عشرہ) کے چالیس دن (اربعین) ہو گیا تھا اور اس زمانہ میں پورا لکھنؤ رنج و غم اور حسرت و ماتم کی ایک زندہ تصویر بن جاتا تھا۔ اس غم والم اور حسرت و ماتم کے اظہار کا بہترین ذریعہ شعرا کے پُرزور اور درد انگیز مراثی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے فن مرثیہ گوئی نے جو ترقی اس دور میں کی وہ اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی خود بادشاہ بھی مرثیے کہتے تھے اور مجلسوں میں اپنا پُر اثر اور رقت خیز کلام سناتے تھے۔ فلک مرثیہ گوئی کے سب سے درخشاں تارے میر انیس اور مرزا دبیر تھے جن کا کلام نہایت مؤثر اور قدرتی شاعری کا پرتو ہے۔ ان دونوں بزرگواروں کا کلام اُردو شاعری کے سر کا تاج ہے۔ اس کی چند خصوصیتیں یہ ہیں۔ کلام میں اخلاقی تعلیم کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ ناسخ اور ان کے زمانہ کی بداخلاقیوں سے بالکل پاک ہے قصائد کی سی بیکار لفاظی اور دور دراز کا رمبالغے اس میں مطلق نہیں۔ مناظر قدرت (جس کو سماں باندھنا کہتے ہیں) اور جذبات قلبی کے سچے فوٹو مؤثر الفاظ میں کھینچے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ نگاری کو اُردو شاعری کا نیا دور سمجھنا چاہیئے۔

مابعد کے شعرا امیر و داغ کا زمانہ	معزولی سلطان عالم واجد علی شاہ اور زمانۂ غدر کے بعد اکثر نامور شاعر مثل امیرؔ، داغؔ، جلالؔ اور تسلیمؔ وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر اسلامی

ریاستوں میں چلے گئے بعض نے رامپور اور حیدر آباد کا رخ کیا۔ اس وجہ سے کہ وہ زبان اُردو کے قدردان سمجھے جاتے تھے اس زمانہ کے شعرا کا کوئی خاص رنگ نہیں بلکہ قدما کے متبع تھے۔ درباریں اور رؤسا کے گھروں پر مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ غزلیں، رباعیاں، قصیدے، قطعات اس زمانہ میں اکثر کہے گئے۔ امیر مینائی اپنے پیش رووں کے مقلد تھے اُن کا کلام ناسخ کے زمانہ کی اکثر بے اعتدالیوں سے پاک ہے داغ کے یہاں طباعی، بیساختگی اور روزمرہ بہت ہے مگر متانت اور بلندی مضامین کم ہے جلال کا کوئی خاص رنگ نہیں مگر وہ فن عروض کے اُستاد اور صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور قدما کے پیرو تھے۔ اس دور میں اُردو شاعری نے بحیثیت شاعری کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔

جدید رنگ
آزاد اور حالی کا زمانہ۔ اُن کی خدمات زبان کے ساتھ

زمانۂ حال میں نظم اُردو نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ اس کے رُکن رکین آزاد، سرور، اور حالی ہیں۔ نئے مضامین اور نیا طرز انشا زبان ہیں داخل ہوا۔ قومی نظمیں، خیالی نظمیں اور بیانیہ نظمیں لکھی گئیں جو پرانی قیود اور قواعد کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہیں۔ نظم کا دائرہ وسیع ہوا، میدان شاعری کو وسعت دی گئی، سادگی، بے تکلفی اثر اور جذبات اس رنگ کی نظموں کے خاص جوہر ہیں۔ نئی چیزوں پر طبع آزمائی کی جانے لگی۔ ہمارے نزدیک اس تغیر کا بڑا سبب انگریزی تعلیم اور انگریزی علم ادب کا شوق نقل ہے۔ حالی قومی شاعر ہیں۔ آزاد نیچرل شاعری کے موجد ہیں سرور کا تخیل اور طرز بیان بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اکبر کا رنگ خاص ہے جس کو اُنھوں نے شروع کیا اور انھی پر ختم ہو گیا۔ اقبال کے کلام میں فلسفہ اور نیچرل مضامین کا لطف ہے۔ حسرت میں زمانۂ حال کی بہت سی خوبیاں ہیں اس جدید دور میں غزل گوئی میں بھی بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس رنگ نے نظم اُردو کو پرانی قیدوں اور پابندیوں سے بہت کچھ آزاد کر دیا اور آئندہ ترقی کے واسطے نئے راستے کھول دیے۔

نثر اُردو — فورٹ ولیم کالج کلکتہ

جدید نثر اُردو کی ابتدا انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے اسی نئی تعمیر کا سنگ بنیاد ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے اہتمام سے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں رکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اُس وقت فورٹ ولیم کالج کے افسر اعلیٰ تھے۔ اُنھوں نے شمالی ہند سے قابل قابل لوگوں کو اس غرض سے اپنے یہاں جمع کیا تھا کہ انگریز افسروں کے واسطے جو تازہ وارد ہوتے تھے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن سے انتظام ملکی اور ہندوستانیوں کے ساتھ میل جول اور ربط و ضبط بڑھانے میں آسانی ہو۔ اس مشہور کالج کے قیام کے پیشتر بھی نثر اُردو کی بعض کتابیں موجود تھیں مگر وہ مذہبی رنگ کی یا قصّے کہانیاں تھیں اور کچی اور ابتدائی زبان میں فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔ عبارت کی درستی اور قواعد صرف و نحو کا ان میں کچھ خیال نہ تھا۔ "مجلس" اور "نوطرز مرصع" اسی عہد کی یادگاریں ہیں۔ وہ خاص لوگ جو انگریزوں کے واسطے سنسکرت اور فارسی سے ترجمہ کرنے یا نئی کتابیں سادہ اور بے تکلف زبان میں لکھنے کی غرض سے جمع کیے گئے تھے سید محمد حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، میر امنؔ، حفیظ الدین احمد مظہر علی ولا، اکرام علی، اور مرزا علی لطف وغیرہ ہیں جن کی تصانیف صاف سادہ اور دلکش عبارت میں ہیں۔ ان کتابوں سے اکثر ثقیل اور غیر مانوس فارسی اور سنسکرت الفاظ نکال دیے گئے ہیں یہی کتابیں نصف صدی تک نثر اُردو کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی تھیں اور زمانہ حال کی جو ترقیاں زبان میں ہو رہی ہیں اُن کا بھی زیادہ تر دارو مدار انھیں پر ہے "ڈاکٹر گلکرسٹ ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ دیسی زبان (اردو) سرکاری زبان ہو گئی اور یہ استعداد اس کو حاصل ہو گئی کہ بجائے مروّجہ فارسی کے وہ عدالتوں اور گورنمنٹ کی زبان قرار دی جائے" ڈاکٹر گلکرسٹ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اُردو لغات اور صرف و نحو کی کتابیں بھی ان کے زمانہ میں تیار ہوئیں۔

نثر مقفّٰی — رجب علی بیگ سرور

سادہ نثر کے مقابلہ میں جس کی ابتدا کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے

ہوئی تھی وہ نثر مقفےٰ ہے جو ظہوری اور بیدل کی فارسی نثر کے طرز پر لکھی جاتی تھی۔ اسکی عبارت مقفےٰ اور جملے بالکل نپے تلے ہوتے تھے۔ صنائع بدائع استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کچھ کام لیا جاتا تھا جملے طولانی پیچیدہ اور قافیہ بندی کی رعایت کی وجہ سے اکثر جگہ مطلب سمجھنے میں دقّت واقع ہوتی تھی، اسی وجہ سے پوری عبارت کے پڑھنے اور مطلب سمجھنے میں بھی وقت ہوتی تھی۔ عرصہ تک اسی قسم کی رنگین اور مقفےٰ عبارت لکھنؤ اور دہلی میں مقبول عام رہی۔ خطوط تک اسی قسم کے مرصع اور باتکلف عبارت میں لکھے جاتے تھے۔ کتابوں کے دیباچے، تمہیدیں، تقریظیں، خواہ بزبان فارسی یا اُردو سب اسی قسم کی رنگین عبارت میں لکھنے کا دستور تھا۔ اس عبارت کے بہترین نمونے مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف "فسانۂ عجائب" جس طرح اپنی انشاپردازی میں مشہور ہے اسی طرح لکھنؤ کی اس زمانہ کی معاشرت کی بھی ہوبہو تصویر ہے۔

دریائے لطافت انشا اور قتیل کی "دریائے لطافت" کو گویا فارسی اور اُردو کا مجموعہ کہنا چاہیئے۔ وہ ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف صرف و نحو اُردو کی پہلی کتاب ہے، جو ایک ہندوستانی کے قلم سے نکلی ہے بلکہ اس میں یہ بھی خوبی ہے کہ مختلف قسم کی زبانیں اور بولیاں جو اُسوقت ملک میں رائج تھیں اور جن کا اثر زبان اُردو پر پڑ رہا تھا اور نیز وہ محاورے اور اصطلاحیں جو بعض مخصوص طبقوں اور جماعتوں میں مروّج تھیں ان سب کے نمونے بھی اس میں بکثرت موجود ہیں۔

اُردوئے معلّی اور عود ہندی ایک بہت بڑی شخصیت نثر اُردو کی تاریخ میں مرزا غالب کی ہے۔ ان کی مشہور تصانیف "اُردوئے معلّی" اور "عود ہندی" ایک دلچسپ مجموعہ اُردو خطوط کا ہیں جس کی عبارت نہایت سادہ سلیس، بے تکلف اور نہایت دلآویز ہے ان میں ایک خاص قسم کی پُرلطف ظرافت اور عبارت میں شگفتگی ہے دونوں کتابیں نثر اُردو کی سادگی

وسلاست کا بہترین نمونہ ہیں ان میں ان کے ذاتی حالات کی طرف جا بجا جو اشارے ہیں اُن کو پڑھ کر دل بہت محظوظ ہوتا ہے غالب کے طرز نے اُردو کی نثر نگاری میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا اور ایک نئی روح پھونکی جس کا اثر زمانۂ مابعد کے نثر نگاروں پر بھی بہت کچھ پڑا۔ غالب بھی اپنے زمانہ کے مروّجہ رنگ سے نہ بچ سکے کیونکہ ان کی اکثر تحریروں میں وہی پُرانے رنگ کی مقفّےٰ اور مسجع عبارت پائی جاتی ہے جو اُن کے زمانہ میں عام تھی۔

عیسائی پادریوں کی تحریروں کا اثر

عیسائی پادریوں کی تصانیف نے بھی نثر اُردو پر ایک خاص اثر ڈالا۔ اُن لوگوں نے عموماً اور خاص کر ان پادریوں نے جو سیرام پور واقع بنگال میں قیام گزیں تھے بائبل کا ترجمہ ملک کی دیسی زبانوں میں کر کے اُس کی اشاعت عوام الناس میں بکثرت کی۔ اس کے علاوہ صدہا مذہبی چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں اُردو میں شایع کیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دیسی زبان میں اخبار نویسی کی ابتدا بھی اسی زمانے سے ہوئی۔ سب سے قدیم ترجمے بائبل کے جو ۱۸۰۵ء سے ۱۸۱۴ء تک شایع ہوے وہ زیادہ تر اردو ہی میں ہوے تھے۔

سر سید اور اُن کے رفقاء کا زرّین عہد

نثر اُردو کی ترقی کا زرّین عہد اُنیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کو سمجھنا چاہیے جس میں سر سید اور ان کی جماعت کے لوگوں نے اُردو نثر نگاری میں ایک خاص رنگ پیدا کیا۔ اس زمانے میں جس قدر مذہبی مناظرے خواہ مسلمانوں کے آپس میں یا مسلمانوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے درمیان ہوتے تھے اُن سے بھی اُردو کو ترقی اور ایک خاص قسم کی تقویت حاصل ہوئی ایسی جملہ کتابیں اور رسائل علی العموم نہایت سادہ اور پُر زور عبارت میں لکھے جاتے تھے اور گو کہ وہ ایک عارضی اور وقتی اثر اور دلچسپی رکھتے تھے مگر پھر بھی اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اُردو نثر نویسی میں سادگی اور پختگی پیدا ہو گئی۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی کی مذہبی اصلاحیں ۱۷۸۲ء لغایت ۱۸۳۱ء اور وہ مختلف فیہ مسائل جن کو وہ ملک میں پھیلانا

چاہتے تھے اُن کے اوپر متعدد رسالے اور کتابیں لکھی گئیں۔ قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ زبان اُردو میں ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔ جو اصلاحیں کہ مولوی سید احمد شہید بریلوی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھیں اُن کی ترقی نمایاں طور پر سر سید احمد خاں کے ہاتھوں ہوئی جن کی متعدد تصانیف سے جو تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، فلسفیانہ، مذہبی، سیاسی جریدہ نگاری غرضکہ ہر صنف و قسم کی تحریر سے تعلق رکھتی تھیں زبان اُردو کو اتنا فائدہ پہنچا اور وہ اس قدر مالامال ہوئی کہ اور کسی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔ سر سید مرحوم ایک ایسے طرز تحریر کے موجد ہوئے جو جامع تھا اور جمیع اقسام مذکورہ بالا کے بخوبی کام آسکتا تھا۔ ان کی تمام تصانیف اور علی الخصوص وہ بیش بہا مضامین جو تہذیب الاخلاق اور اُس وقت کے دیگر مشہور جرائد میں چھپے ہیں ہزارہا تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔

سر سید مرحوم کے رفقائے کار نے، جن کو زبان اُردو کا نورتن سمجھنا چاہیئے زبان اور ادب اُردو کے ساتھ احسان عظیم کئے اور بیش بہا خدمتیں انجام دیں۔ مولانا حالی کی قومی نظمیں اور تنقیدی مضامین، علامہ شبلی اور مولوی ذکاءاللہ کی تاریخی تصانیف، مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے اخلاقی اور پولٹیکل مضامین و لکچر، مولانا نذیر احمد کے اخلاقی ناول اور دیگر تصانیف جن میں ادب آموزی کے ساتھ ایک لطیف ظرافت کا بھی رنگ ہے، ان سب سے نہ صرف لائق مصنفین کے اہل قوم و مذہب ہی کو فائدہ پہونچا بلکہ وہ تمام ملک کے واسطے یکساں طور پر مفید ثابت ہوئے۔ اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کی جادو نگاری (جس کا ان سب سے جدا اور ایک خاص رنگ ہے) درحقیقت نہایت ہی لطیف اور دل آویز ہے۔ ان کی تصانیف کو خزانۂ اُردو کے بیش بہا جواہر سمجھنا چاہیئے۔

تعلیم انگریزی کا اثر اُردو پر چھاپہ کی ابتدا۔ اُردو سرکاری زبان قرار دی گئی

اُنیسویں صدی کے نصف آخر سے انگریزی تعلیم کا نمایاں اثر زبان اُردو پر پڑنے لگا۔ اس سے ادب اُردو کی وسعت اور معلومات اور بڑھ گئی اور مختلف اصناف سخن اس میں داخل

ہونے لگے۔ چھاپہ کی وجہ سے اشاعت کتب کو بہت مدد ملی۔ قدیم و جدید ہر قسم کی کتابیں چھپنے لگیں اور اُن کی نشر و اشاعت آسان ہوگئی۔ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے اُردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار دی گئی جس سے اُس کا پایۂ اعتبار اور بلند ہوا اور عدالتی دفاتر کی نئی نئی اصطلاحات کے شمول سے اُس کے لغات اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔

ناول نویسی کی ابتدا افسانہ نویسی، تاریخی ناول اور اخبار و جرائد کو تعلیم انگریزی کا لازمی نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ مضمون ضروری اور اہم ہے چنانچہ اس کی تفصیل آئندہ ابواب میں مناسب مقامات پر کی گئی ہے۔ زمانۂ حال میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جس نے زبان اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا ہے اور مولانا شبلی مرحوم کے دارالعلوم ندوہ کا قیام اس امر کی بیّن مثالیں ہیں کہ زبان کس قدر ترقی کر رہی ہے۔ نیز یہ کہ اُردو کو ہندوستان کی ادبی زبان بننے کا فخر باحسن وجوہ حاصل ہوگیا۔

اُردو ڈراما یہ بالکل نئی اور مقامی چیز ہے اس وجہ سے کہ فارسی میں اس کا وجود ہی نہ تھا۔ اس صنف جدید کا ابھی بچپن ہے۔ ہنوز اس کو پختگی اور کمال حاصل نہیں ہوا۔ ہمارے ملکی ڈراما نگاروں میں ابھی پختہ کاری نہیں آئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے کریکٹر نامکمل اُن کے پلاٹ اکثر ناقص اور ناتمام ہوتے ہیں، اُن کی تحریروں میں صرف لفظی اور سطحی باتیں ہوتی ہیں۔ شکسپیر اور دیگر یورپی جادو نگاروں کے ڈراما البتہ ترجمہ ہوگئے ہیں اور ہندوستانی اسٹیج کے حسب حال ان میں کچھ تغیر و تبدل بھی ہوگیا ہے۔ اُردو ڈراما نویسی کے سامنے ایک درخشاں مستقبل ضرور ہے۔

باب ۳

اُردو شاعری کی عام خصوصیات

اُردو شاعری فارسی شاعری کی مقلد ہے

اُردو شاعری دیسی پیداوار نہیں ہے وہ فارسی سے پیدا ہوئی اور فارسی کے نمونے اس کے پیش نظر تھے۔ فارسی علم عروض نے جو عربوں کی ایجاد تھا اُردو شاعری پر بہت بڑا اثر کیا۔ اسی طرح فارسی بحور اور قواعد عروض میں بھی فارسی کا اتباع کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ غیر ملکی پودھا جڑ پکڑ گیا اور اُس کو اس ملک کی آب و ہوا راس آئی۔ بحروں کے علاوہ شعرائے اُردو نے فارسی ہی کی تشبیہیں اور وہی مضامین اخذ کیے اور یہ سب چیزیں بلالحاظ ملکی ضروریات کے اور بلا امتیاز اس کے کہ اُردو زبان کی اصل کیا تھی اور اس میں استعداد کس قدر تھی داخل زبان ہو گئیں اور ہمارے شعرائے اُردو کا مایۂ انبساط بن گئیں۔ اس تتبع میں فائدہ اور نقصان دونوں مضمر تھے۔ نقصان یہ کہ اُردو شاعری کو وہ مدارج ارتقاطے کرنا نہیں پڑے جن کی رفتار تو ضرور سُست تھی مگر ایک نئی زبان کی ترقی کے واسطے وہ ازبس ضروری تھے۔ مثال کے لئے انگریزی شاعری کو دیکھو کہ جس نے یہ منازل ارتقا بتدریج طے کر کے معراج ترقی حاصل کی۔ اُردو میں اسی کمی کی وجہ سے وہی پُرانی فرسودہ باتیں اور وہی مضامین جو فارسی شاعری میں بکثرت پائے جاتے تھے اور جن کو کوئی تعلق اس ملک سے نہ تھا دفعتاً سنگ بنیاد بن گئے شروع میں تو اکثر اُردو اشعار فارسی اشعار کا لفظی ترجمہ ہوتے تھے اور اب بھی ہمارے شعرا صائب حافظ نظیری اور بیدل وغیرہ کی تقلید کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔

تقلید کے بُرے نتائج

اس حریصانہ جذب اور کورانہ تقلید سے یہ بڑا نتیجہ پیدا ہوا کہ اردو شاعری سے اصلیت مفقود ہو گئی اور لبا او قات ابتذال پیدا ہو گیا۔ سرزمین

ہندوستان ان مضامین سے نا آشنا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق، شیریں فرہاد کی محبت، رستم واسفند یار کی بہادری، مانی اور بہزاد کی نقاشی، جیحوں وسیحوں کی طغیانی، بیستون اور الوند کی بلندی وغیرہ وغیرہ یا جانوروں میں بلبل، درختوں میں سنبل وغیرہ یہ سب غیر ملکی چیزیں ہیں جن کو یہاں کے لوگوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اسی تتبع کی وجہ سے شاعری واقعیت سے ہٹ کر صرف نقالی رہ گئی۔ ہندوستانی بادشاہوں کے عدل کی جب تعریف کی جاتی ہے تو اُن کا مقابلہ نوشیرواں سے کیا جاتا ہے سخاوت میں وہ حاتم بتائے جاتے ہیں۔ حرماں نصیب عاشقوں کی مثال کے واسطے سوائے مجنوں کے کوئی نہیں ملتا اور اُن کی معشوقہ ہمیشہ لیلیٰ ہوتی ہے ایک حسین آدمی کی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ یوسف کی طرح ماہ کنعاں ہو اور معشوق کے سخت احکام کی تعمیل کرنے والا کوہکن، خطاب پاتا ہے۔ قد کی تشبیہ کے لئے سرو و شمشاد۔ آنکھوں کے واسطے نرگس۔ زلف کے لئے سنبل۔ بیرحمی اور سفاکی کے لئے ترک، گل کی عاشق بلبل، سرو کی دلدادہ فاختہ باد صبا کی اٹکھیلیاں، چاند کو دیکھ کر کتاں کا پارہ پارہ ہونا یہ سب فارسی سرمایہ اُردو کے واسطے مخصوص بلکہ اُس کی مِلک ہو گیا اور اُن کی وہ بھرمار ہوئی کہ شاعری اپنی اصلیت کو بھول گئی اُس کو اپنے ملک کی تشبیہات سے نفرت پیدا ہو گئی اور اپنے وطن کی حسین سے حسین چیزوں کی قدر کرنے کا احساس تک اُس سے فنا ہو گیا مثلاً ہندوستان کی بہار اس کا موسم برسات ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری اُردو شاعری میں اس کے صحیح اور دلکش مناظر کا کہیں پتا نہیں، ایسے ہی ہندوستان کا موسم گرما، موسم بہار، ہمالیہ کی سر بفلک برف زار چوٹیاں، گنگا اور جمنا کے خوبصورت گھاٹ، اُن کا ہمارے قدیم شاعروں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ زبان بھاشا کی خوبصورتی اور شیرینی کو دوسری زبان کی دلفریبیوں پر قربان کر دیا۔ مختصر یہ کہ اُردو شاعری نے فارسی شاعری کی تقلید آنکھ بند کر کے جزئیات تک میں کی سر چارلس لائل اسی تقلید کی نسبت لکھتے ہیں۔

اُردو شاعری محض نقالی ہے

اُردو شاعری فارسی شاعری کا کامل اتباع کرتی ہے اور وہی مضمون بار بار دہراتی ہے جن کو خود اساتذہ فارس نے بارہا پامال کیا ہے مضامین اور الفاظ دونوں ابتدا سے آج تک جیسے تھے ویسے ہیں۔ اُن میں کوئی جدت یا اصلیت نہیں پائی جاتی اور اسی کمی کی وجہ سے ان کو ایک نہایت مہتم بالشان اور مستقل علم معنی و بیان کی بنیاد رکھنا پڑی جبکہ کوئی چیز جو کسی شاعر کو کہنا ہو اور اُس کو اُس سے پیشتر سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہہ گئے ہوں تو ظاہر ہے کہ اُس کے واسطے یہ بہت ضروری ہے کہ اُس چیز کے کہنے کا اپنے واسطے ایک خاص اسلوب مقرر کرے۔ بس یہی اسلوب یا بہ الفاظ دیگر علم معنی و بیان نہ کہ جذبات شعرا اُردو شاعری کا مایۂ ناز ہو گئے۔ اسی وجہ سے نہایت دلچسپ مبالغے نئی نئی بندشیں اور ترکیبیں، صنعت تضاد اور اسی قبیل سے دیگر صنائع و بدائع اُردو شاعری کی روح رواں بن گئیں۔

اُردو شاعری صرف رسمی رہ گئی اُردو شاعری میں نہ صرف تکلفات ظاہری ہی کی کثرت ہے بلکہ وہ محض رسمی اور لکیر کی فقیر ہے۔ وہی استعارے و تشبیہیں جو بارہا لکھی جا چکی ہیں پھر دہرائی جاتی ہیں۔ آئینۂ فطرت کے مشاہدہ کا اس میں کہیں پتہ نہیں اسی وجہ سے مضامین میں کسی قسم کی تازگی نہیں اور نہ کوئی نیا پیغام ہوتا ہے پُرانے شعرا کی کشکولیں مضامین کی تلاش میں بار بار ڈھونڈھی جاتی ہیں۔ اور مقررہ قواعد کے بموجب پھر انھیں باتوں کا اعادہ کیا جاتا ہے، شاعری محض نپی تلی چیز ہو گئی نہ کبھی کم ہوتی ہے نہ زیادہ ہر شاعر اپنے کلام میں اُسی آموختہ کو رٹتا ہے اور اسی وجہ سے اُردو شاعری کا بازار تصنعات اور بے مزگی سے بھرا ہوا ہے۔

قافیہ پیمائی فارسی کی تتبع میں اُردو میں بھی ایک قافیہ اور بعض اوقات دو قافیوں کی پابندی لازمی ہے۔ قافیہ گو کہ کانوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اظہار خیال میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مدت ہوئی کہ یورپ کی شاعری اس بار گراں سے سبکدوشی

حاصل کرکے آزاد ہوگئی۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ قافیہ پہلے ذہن میں آتا ہے جو مضمون کی طرف رہبری کرتا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئیے کہ مضمون خود قافیہ پیدا کرے۔ غرضکہ انھیں قیود سے اُردو شعرا کے تمام دواوین بھرے پڑے ہیں اب اس بدمزگی کا احساس خود ہمارے شعرا کو پیدا ہو چلا ہے۔

خلاف نیچر مضامین

علاوہ نقائص مذکورۂ بالا کے سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اُردو شاعری میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف باندھے جاتے ہیں مثلاً مرد کا عشق مرد کے ساتھ جس کے لئے کوئی معقول وجہ یا عذر بھی نہیں پیش کیا جاتا۔ ایک لڑکے کو معشوق تصور کرکے اس کے گھونگروالے بال اس کی زلفیں اس کا سبزۂ خط اُس کی بھیگی مسیں اُس کے خد و خال اس لطف سے بیان کئے جاتے ہیں کہ جس کی تہذیب حال کبھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس رنگ کو ہمارے قدیم شعرائے اُردو نے شروع کیا جس کا تتبع آج تک کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں تہذیب اور متانت کے اعتبار سے بھاشا کو اُردو پر اس معاملہ میں فوقیت حاصل ہے۔ بھاشا میں شاعر اپنے کلام میں عشق اس طرح ظاہر کرتا ہے جیسے ایک عورت اپنے شوہر یا عاشق کے فراق میں گریہ کرتی ہے یا جیسے اس کا خیالی معشوق اُس کے جذبات کا احترام نہیں کرتا برخلاف اُس کے ہمارے اُردو شعراء بسا اوقات عشق کا اظہار اپنے ہمجنس کے لئے کرتے ہیں اسی اختلاف کی وجہ سے بھاشا کی شاعری حقیقی اور موافق فطرت ہے اور دل میں گھر کرتی ہے اور خیالات میں بلندی اور رفعت پیدا کرتی ہے۔ بخلاف اُس کے اُردو کے اکثر عاشقانہ اشعار میں زنان بازاری کے حسن و دلفریبی کا ذکر ہوتا ہے جس سے خیالات میں پستی اور عبارت میں ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی ایک چیز اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ اُردو شاعری فارسی کی سراسر پیرو ہے یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری اور زبان کو پھیلنے اور ترقی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ وجہ بھی ہوئی کہ لوگوں نے

اُردو شاعری کو محض تفنّن طبع سمجھا اور جب کبھی فارسی شعر گوئی سے اُن کو فرصت ہوئی تو تھوڑا سا وقت دل بہلانے کے لیے اس میں بھی صرف کر دیا۔ بڑی قباحت یہ ہوئی کہ وہ لوگ عموماً ہندی اور سنسکرت سے ناواقف تھے جس کی وجہ سے وہ ان دونوں زبانوں کی برکتوں سے منتفع نہ ہو سکے۔ فارسی چونکہ سرکاری اور درباری زبان تھی اور اُس وقت کے بڑے بڑے رئیس و امیر عالم و فاضل اور شاعر سب اسی کو پسند کرتے تھے اور یہی زبان رائج تھی لہذا قدرتی طور پر ہندی الفاظ اس کے مقابلہ میں اُن کو بھدّے اور اجنبی معلوم ہوئے اور اسی وجہ سے وہ ترک کر دیے گئے۔ ہمارے ذہن میں فارسی تتبع کی بڑی وجہیں صرف دو ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ زبان فارسی کا بازار اُس وقت گرم تھا دوسرے یہ کہ وہ لوگ سنسکرت اور بھاشا سے ناواقف تھے انھیں وجوہ سے زمانۂ قدیم میں اُردو کی بے قدری تھی۔ چنانچہ متقدمین اساتذہ اُردو سب فارسی گو شاعر تھے یہاں تک کہ مرزا غالب بھی فارسی کے مقابلہ میں اپنے اُردو کلام کو ہیچ سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

فارسی بین تا ببینی نقشہاے رنگ رنگ	بگذر از مجموعہ اُردو کہ بیرنگ من است

گزشتہ زمانہ کے عربوں میں یہ دستور تھا کہ عاشق اپنی معشوقہ کو بنت العم کے خطاب سے یاد کرتا تھا اور اپنے عشقیہ اشعار اُس کی شان میں نظم کرتا تھا اور بالآخر اسی کے ساتھ اس کا عقد ہو جاتا تھا۔ اس رسم کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات معشوقہ کا نام ظاہر ہو جانے سے جھگڑا اور فساد برپا ہوا اور کبھی کشت و خون تک نوبت پہونچی، لہذا اس خرابی کے دُور کرنے کے لیے محض فرضی اور خیالی عورتوں کے نام تجویز کیے گئے۔ پردہ کے رواج نے عورتوں کے کھلّم کھُلّا نام لینے کو ممنوع قرار دیا جس کی وجہ سے یا تو اُن کے واسطے کسی مشہور معشوقۂ سلف کا نام لیا جانے لگا اور یا وہ صیغۂ تذکیر کے ساتھ یاد کی جانے لگیں۔ فارسی میں صیغۂ تذکیر و تانیث میں فرق نہ تھا اسی وجہ سے شاید یہ صورت اختیار کی ظاہر ہوئی۔ یہ عذر بادی فارسی میں جہاں تذکیر و تانیث کا کوئی امتیاز نہیں ہے مقبول ہو سکتا ہے۔

مگر اُردو میں جس کہ افعال و اسماد سب میں تذکیر و تانیث کی تفریق موجود ہے اور پورا لحاظ رکھا جاتا ہے یہ عذر لنگ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے ہر ملک کا ادب وہاں کی سوسائٹی کے اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے یعنی سوسائٹی کی اخلاقی خرابیاں کسی ملک کے ادب سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کے جواب میں یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے اگرچہ بظاہر تذکیر کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں مگر حقیقتًا ان سے مراد ہی فرقہ اناث ہوتا ہے جس میں حقیقی معشوقہ بننے کی قابلیت موجود ہے مگر سچ پوچھیے تو تہذیبی اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ جواب بھی ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ پردہ کی وجہ سے شریف عورتیں سامنے نہیں آسکتیں پس لامحالہ جس حسن کا ذکر ہوگا وہ بازاری عورتوں کا شمار کیا جائے گا۔

اصناف سخن اُردو شاعری میں اصناف ذیل پر طبع آزمائی کی جاتی ہے۔
غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ۔

غزل اور اُس کا رنگ ان میں سب سے مشہور صنف شاعری غزل ہے جس کا رنگ زیادہ تر عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے۔ اساتذہ متقدمین کے کلام میں تصوف کا رنگ سب رنگوں پر غالب تھا قرون وسطیٰ میں مذہبی بیداری کی ایک لہر تمام ہندوستان میں دوڑ گئی تھی بھگتی کا عقیدہ۔ رام و کرشن کے روایات جنھوں نے ادب ہندی پر بہت بڑا اثر ڈالا اسی مذہبی بیداری کے علامات ہیں۔

تصوّف تمام قدیمی شعرائے اُردو صوفی تھے اور ان بزرگوں کی اولاد میں سے تھے۔ جو مجاہدین اسلام کی فوجوں کے ہمراہ خود آتے تھے یا اس زمانہ کے چند روز بعد ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان میں مذاق تصوّف اُن کے اسلاف سے وراثتًا چلا آتا تھا۔ اور لوگ ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ چنانچہ اُردو کا سب سے پہلا شاعر ولی دکنی ایک بہت بڑا صوفی تھا اور دلی کے ایک مشہور بزرگ شاہ سعد اللہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا۔ اسی طرح شاہ مبارک آبرو شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے جو ہندوستان میں

ایک بہت مقدس بزرگ گزرے ہیں شیخ شرف الدین مضمون گویا ایک سپاہی پیشہ شخص تھے مگر آخر میں دنیا چھوڑ کر فقیر ہو گئے تھے۔ شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں بھی مشہور صوفیائے کرام سے گزرے ہیں خواجہ میر درد جو کہ خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد میں تھے علاوہ شاعری کے دولت فقر سے بھی مالامال تھے۔ ان کے علاوہ مشہور پہلوانان سخن میر، سودا اور اسی طرح ان کے ہمصروں کے کلام میں بھی تصوف کا رنگ نمایاں ہے فارسی شاعری چونکہ مضامین تصوف سے مملو تھی لہذا یہ بہت قدرتی بات تھی کہ اردو نے منجملہ اور چیزوں اس میں بھی اُس کی پیروی کی۔ تقدس، ریاضت نفس ترک ماسوی اللہ، و دنیاوی نمایش اور ریاکاری سے اجتناب، تعیش اور حصول دولت واقتدار سے بیزاری کہ ان چیزوں کے لئے اہل دنیا ساعی رہتے ہیں۔ عزلت گزینی اور اپنی ہستی کو عبادت الٰہی کے لیئے وقف کردینا۔ ان کو تصوف کا بنیادی اصول سمجھنا چاہیئے۔ شعرائے صوفیہ حُسن مجازی کی تعریف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اُس کو حُسن حقیقی کا زینہ سمجھتے ہیں اور عشق حقیقی کا ذوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کے واسطے انھیں ظاہری نقوش و علامت سے کام لیتے ہیں۔ اُن کا مقولہ ہے۔

متاب از عشق رو گرچہ مجازی است	کہ آن بہر حقیقت کارسازی است

ایران اور ہندوستان کی عاشقانہ شاعری میں روحانی اور شہوانی جذبات کی عجیب آمیزش انھیں نکات تصوف کی بدولت ہے۔

عاشقانہ | غزل میں عاشقانہ رنگ کی بنیاد تصوف اور اہل دربار کی عیش پرستی اور فارسی شاعری کے تتبع پر پڑی۔ غزل اُردو شاعری کی جان ہے انگریزی میں اگر اُس کے مقابل کوئی چیز ہے تو سانٹ ہے غزل کے لغوی معنے عورتوں سے باتیں کرنا ہیں غزل میں چند اشعار ہوتے ہیں اور ہر شعر بہ اعتبار مطلب کے مکمل ہوتا ہے یہی چیز غزل اور سانٹ میں مابہ الامتیاز ہے یعنی غزل میں ہر شعر بجائے خود مکمل اور ایک دوسرے سے

بے نیاز ہوتا ہے اور سانٹ میں سب اشعار مربوط و مسلسل کسی ایک مضمون پر ہوتے ہیں۔
اصناف شاعری میں سب سے سہل اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ برتے جانے والی
چیز غزل ہے۔ غزل میں تسلسل کا لحاظ کم رکھا جاتا ہے مضامین غزل محدود ہیں اور اسی
وجہ سے شاعر کو ایک شعر پر اپنی پوری قوت صرف کر کے طبع آزمائی کا موقع ملتا ہے
اگرچہ بلحاظ مضامین تنوع بھی ہوتا ہے۔ جن مضامین میں غزلیں عام طور پر کہی جاتی ہیں
وہ حسب ذیل ہیں۔ عاشق کی حرماں نصیبی، وصل کی جستجو، معشوق کے جور و جفا، گل و بلبل کے
راز و نیاز، وحشت و جنون، عشق کی بلا انگیزی، معشوق کے سراپا کی تعریف، باغ و بہار
کے مناظر، بادۂ گلفام کی تعریف و طلب، رقیبوں کے شکوے، عاشقانہ شاعری دنیا
کی تمام ادبی تصانیف میں موجود ہے۔ کیونکہ عشق ایک فطری جذبہ ہے جس کا اظہار ہر زبان
سے ہوتا ہے تصوف حسن مجازی کو عشق حقیقی کی اول منزل سمجھتا ہے جیسا کہ چند سطریں
پیشتر بیان کیا گیا۔

اہل دربار کا اثر اردو شاعری پر اردو شاعری اہل دربار میں ہمیشہ مرغوب اور ہر دلعزیز رہی اور امرا
اور رؤسا کے درباروں میں اس کی ترقی اور نشو و نما ہوئی۔ دلی، حیدرآباد
لکھنؤ اور رام پور شاعری کے مرکز رہے ہیں اور یہیں کے فرمانرواؤں نے اردو شاعری
کو پروان چڑھایا۔ مگر درباری اثر شاعری پر دو حیثیت یعنی نفع اور نقصان کی صورت
میں مترتب ہوا۔ نفع اس معنی میں کہ شعرا کو اُن کی جانکاہی کے صلہ میں انعام و اکرام
خوب دیا گیا اور اُن کی محنت ٹھکانے لگی۔ نقصان اس صورت میں کہ مضامین شاعری
محدود ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ شعرا کو رئیس و اہل دربار کے مذاق کی پیروی کرنا پڑی۔
دلی اور لکھنؤ کی سلطنت کا مٹ جانا اردو شاعری کے زوال یا کم از کم اُس کے ضعف کا
خاص باعث ہوا۔ عاشقانہ رنگ فرمانروایان اودھ کے دربار میں خصوصیت کے ساتھ
مقبول تھا اس وجہ سے کہ اُن لوگوں کے دلوں میں خود تعیش کے جذبات موجود تھے۔

اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر اُس زمانہ کے شاعروں کے کلام کا بیشتر حصہ اس رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ قصائد اور غزل دونوں بکثرت کہے جاتے تھے ایک میں کسی نواب یا وزیر کی تعریف تو دوسرے میں کسی اصلی یا فرضی معشوق کا ذکر ہوتا تھا۔ چونکہ ان لوگوں کو خوش کرکے شعرا کو اپنی کاربرآری کرنا ہوتی تھی اسی لئے وہ ان دونوں رنگوں میں مشغول رہتے تھے۔ انگریزی شاعر اسکاٹ[۵۱] کے یہ دو نوں شعر اسی حالت کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں ؎

اپنے رنگ عیش و عشرت کے لیے سب بادشاہ — شاعران نکتہ رس سے لیتے ہیں محنت مدام
تھوڑی سی تنخواہ کے لالچ میں یہ کرتے ہیں طرح — لیکن اپنی روح کو کر لیتے ہیں پابند دام

اسی درباری وابستگی اور ہم آہنگی کا یہ بُرا نتیجہ ہوا کہ ہماری اُردو شاعری سے وہ تنوع پرکاری وسعت، اور جدت مفقود ہوگئی جو دنیا کے شاعری کی جان ہے۔

دیہاتی اور قدرتی مناظر کی اُردو شاعری میں کمی

اُردو شاعری کا دائرہ محدود ہے قدرتی مناظر جو شعرائے مغرب کے دلوں میں عجب عجب اُمنگیں پیدا کرتے ہیں ہمارے اُردو شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے۔ اُردو میں برائنٹ[۵۲] ہوٹیر[۵۳] اور ٹامسن[۵۴] کی طرح کے شعرا کا پتہ نہیں اور نہ ورڈسورتھ کا ایسا کوئی نیچر کا عاشق ہے۔ اُردو شاعری میں اصلی قدرتی

---

[۵۱] سروالٹر اسکاٹ گزشتہ صدی کا نہایت نامور انگریزی شاعر اور ناولسٹ گزرا ہے اس کے اکثر ناول اور نظمیں داخل درس ہیں اور ان کا ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں ہوگیا ہے۔ اس کی نیچرل بیانیہ شاعری زبانِ انگریزی میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ اُس کے وطن اصلی یعنی اسکاٹ لینڈ میں اس کی اس قدر شہرت اور قدر ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اُس کے کسی ناول یا کیریکٹر کے نام سے کوئی چیز بطور یادگار منسوب ہے۔ [۵۲] برائنٹ امریکہ کا شاعر اور اخبار نویس تھا اکثر مشہور اخباروں اور رسالوں کا ایڈیٹر رہا ہومر کی الیڈ اور اڈیسی کا منظوم ترجمہ اس نے کیا ہے۔ [۵۳] ہوٹیر یہ بھی امریکن شاعر اور جریدہ نگار ہے اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی پرزور نظموں کے ذریعہ سے انسداد غلامی میں بڑی مدد کی چنانچہ اس کو وہاں انسداد غلامی کا ملک الشعرا کہتے ہیں۔ [۵۴] ٹامسن ۱۷۰۰ء لغایت ۱۷۴۸ء (

(بقیہ حاشیہ بصفحہ آیندہ)

مناظر مثلاً بہتا ہوا دریا لہلہاتے کھیت ۔ گاتی ہوئی چڑیاں ۔ اس قسم کی چیزوں کا ذکر بہت کم ہوتا ہے گو کہ مصنوعی اور فرضی مناظر باغوں چشموں بلبل و گل، قمری و سرو وغیرہ کا ذکر کثرت سے ہے ۔ شعرائے اُردو کے سرود میں صرف ایک ہی تار ہے اور وہی بار بار بجایا جاتا ہے یہاں تک کہ بے سُرا ہو جاتا ہے۔ سمندر کی نظمیں آزادی کے راگ حسن کی صحیح تصویریں ۔ اُردو شاعری میں نہیں ہیں ۔ وہی پامال مضامین جن کو بادشاہ اور اہل دربار پسند کرتے تھے مثلاً شراب و کباب، قیبوں کے شکوہ و شکایت، عاشقوں کی حرماں نصیبی، فلک کے جور و ستم، تقدیر کی گردشیں بکثرت ہیں ۔ البتہ تھوڑے دنوں سے جب سے کہ انگریزی تہذیب و تعلیم کا چرچا پھیلا نیچرل مضامین پر بھی طبع آزمائی کی جانے لگی اور

انگلستان کا خوشگو نیچرل شاعر ہے اسکا مجموعۂ نظم موسوم بہ سیزنس (موسم) مشہور ہے جس میں زمستان تابستان بہار خزاں چاروں فصلوں کا حال نہایت شاعرانہ پیرایہ میں لکھا ہے ۔ چند ڈرامے بھی لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوئے اُس کی دیگر تصانیف میں رول برطانیہ اور کیسل آف انڈولینس بہت مشہور ہیں ۔ ۵ ولیم ورڈسورتھ (۱۷۷۰ء لغایت ۱۸۵۰ء) نہایت مقبول انگریزی شاعر ہے اس کا اُن لوگوں میں شمار ہے جن کو زبان انگریزی میں "لیک پوئٹ" یعنی جھیل کے شعرا کہتے ہیں اس وجہ سے کہ ورڈسورتھ اور اسکی بہن ڈارو تھی اور کولرج وغیرہ ایک ایسے مقام پر رہتے تھے جس کا نام گراسمیر ہے اور جو اپنے نام کی ایک جھیل کے پاس واقع ہے ۔ ورڈسورتھ کو انقلاب فرانس کے زمانہ میں آزادی پسند جماعت سے جو "جائرانڈسٹ" کہلاتے تھے بہت ہمدردی تھی مگر جب نپولین نے اصول جمہوریت کو توڑ کر جبر و استبداد شروع کیا تو اُس کی ہمدردی اُس جماعت سے بالکل منقطع ہو گئی ۔ ورڈسورتھ کی تصانیف کثرت سے ہیں منجملہ جن کے اُس کی فلسفیانہ نظم رکلوس (راہب) بڑی اعلیٰ پیمانہ کی ہے اُس کے علاوہ ایکس کرشن (گلگشت) اوڈ ٹو ڈیوٹی (غزل بر فرائض انسانی) وڈ انڈی ٹیمیشنس آف امارٹلٹی (ازل کی یاد) وغیرہ حال کی انگریزی شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں ۔ کولرج کا قول ہے کہ ورڈسورتھ نے خاص کام یہ کیا کہ دنیا کی معمولی چیزوں کو ایک فلسفی شاعر کی نظر سے دیکھا اور اُن میں وہ باتیں پیدا کیں جو ہر شخص کو نہیں سوجھتیں، دوسری بڑی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ وہ عالم نباتات میں ایک روح کا قائل تھا اور اُن کو ذی حیات تصور کرتا تھا ۔ ورڈسورتھ علاوہ شاعری کے فن تنقید کا بھی اُستاد تھا ۔ سودے کے بعد خطاب ملک الشعرا اسی کو ملا تھا ۔

اُن کی مقبولیت سے اُمید ہے کہ اس صنفِ جدید میں بہت جلد ترقی ہوگی۔

اُردو شاعری حزن ویاس کی شاعری ہے

کُل مشرقی شاعری جس میں اُردو کی شاعری بھی داخل ہے حزن ویاس کے مضامین سے مملو ہے ایک یورپین نقاد کی رائے ہے کہ "اہلِ مشرق اپنی طبیعت کی اُفتاد سے افسردہ خاطر پُراسرار سوچ بچار میں وقت گزارنے والے اور تقدیر کے قائل واقع ہوئے ہیں۔ دنیائے عمل میں وہ بہت کم حصہ لیتے ہیں ان کی زندگی میں زیادہ تر حزن ویاس درماندگی وبیچارگی زندگی سے تنفّر دنیا کی بے ثباتی کا ہر دم تصوّر دنیاوی ترقی اور مرفہ الحالی سے اجتناب شامل ہے اسی دنیا کی بیزاری کی وجہ سے وہ اکثر اوقات باوجود اپنے ارادوں کے بھی مذہب اور تصوف کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگنا تقدیر سے مقابلہ کرنے کو بیکار سمجھنا انسانی قوت ارادی کو بالکل معطل وبیکار سمجھنا زمانہ اور آسمان کی شکوہ وشکایات یہ سب باتیں اہل مشرق کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ علاوہ مذکورہ بالا باتوں کے جو تمام مشرقی مصنفین کے یہاں بالعموم پائی جاتی ہیں ہندستان میں اس پابندی قسمت اور مجبوری کا ایک اور بھی سبب ہے جو ان کی فطری حزن ویاس کی رنگ کو اور گہرا کر دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کا اخترِ سعادت واقبال غروب ہوگیا۔ اور ان کی گزشتہ عظمت وجبروت کے واقعات خواب وخیال ہوگئے۔ اُردو میں خوشی اور مسرت کے نغمہ سرائی کرنے والے مثل براوننگ[1]

[1] رابرٹ براوننگ (۱۸۱۲ء لغایت ۱۸۸۹ء) دورِ وکٹوریہ کا نہایت نامور شاعر تھا۔ اُنیسویں صدی یعنے کوئن وکٹوریہ کے عہد میں جس کو انگریزی شاعری کا دورِ متاخرین بلکہ آخری دور کہنا چاہیئے تین نامور شاعر گزرے ہیں ورڈسورتھ ٹینیسن اور براوننگ اور ان تینوں کا انداز بیان ایک دوسرے سے الگ ہے براوننگ کے یہاں روحانیت کا عنصر غالب ہے مضامین نہایت بلند خیالات نہایت پاکیزہ۔ گو عبارت میں کسی قدر پیچیدگی ہوتی ہے جیسے فارسی میں مرزا بیدل کے کلام میں۔ ایک قابل ذکر بات اسمیں یہ بھی کہ

(بقیہ صفحہ آیندہ)

بہت کم ہیں مگر کہا جا سکتا ہے کہ اسی مایوسی اور مجبوری کی وجہ سے مشرقی شعرا کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد و اثر پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام مقبول خاص عام ہے

قصائد | قصائد نویسی میں بڑے بڑے اساتذۂ فارس مثلاً انوری و خاقانی، عرفی و قاآنی اور ظہیر فاریابی وغیرہ کی پیروی کی گئی۔ اُردو کے مشہور قصیدہ گو سودا، ذوق اور امیر وغیرہ ہیں قصیدہ کے انداز میں بھی فارسی کا تتبع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اُس میں شکوہ الفاظ اور علو مضامین کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ وہی فارسی ترکیبیں اور استعارے تشبیہیں، مبالغے وغیرہ عام طریقہ سے برتے جاتے ہیں چونکہ قصیدہ کسی خاص شخص کی تعریف میں کہا جاتا ہے لہذا ممدوح کی صفات کو نہایت مبالغہ کے ساتھ ہر ممکن طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض قصائد بہ لحاظ مضمون و زبان اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مشکل بحریں، سخت قوافی قصیدہ گو کی قابلیت پر دال ہوتے ہیں اکثر قصائد صنائع بدائع سے بھرے ہوئے ہیں۔

مثنوی | شعراء اُردو میں یہ صنف بہت مقبول رہی ہے اس میں بھی بحروں اور فارسی قواعد نظم وغیرہ کی پابندی کی جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ انگریزی شاعری میں جو دو مشہور صنفیں معروف بہ ایپک اور ڈراما ہیں اُردو میں صنف مثنوی اُن کا جواب ہے مگر ہماری رائے میں مثنوی اور اصناف مذکورہ میں فرق ہے اُردو کے مشہور مثنوی نویس میر، میر حسن، مومن خاں نسیم، قلق نواب مرزا شوق اور شوق قدوائی ہیں اور سب سے زیادہ

اس کی بیوی بھی نہایت مشہور اور صاحب تصنیف شاعرہ تھی۔ تمام قوموں میں دستور ہے کہ ہمعصر شعرا ایک دوسرے کے کلام کے متعلق مذاق و طنز آمیز باتیں کرتے ہیں چنانچہ براؤننگ کی مشہور کتاب سارڈلو جب نکلی تو اُس کے دوست ٹینیسن نے دیکھ کر کہا کہ میں اُس کے صرف دو شعر سمجھ سکا ہوں یعنی پہلا اور آخری اور وہ بھی صحیح نہیں ہیں اور کارلائل نے جب یہ کتاب اپنی بیوی کی زبان سے سنی تو کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سارڈلو کسی آدمی کا نام ہے یا کسی شہر کا یا کتاب کا ۱۲

مشہور مثنویاں سحر البیان اور گلزار نسیم سمجھی جاتی ہیں۔ وہی یورپین نقاد مثنوی کے بارہ میں یوں رقمطراز ہے: "مثنوی یا بیانیہ نظموں میں بھی نفس قصہ دوسرے درجہ پر اور الفاظ کے ماتحت ہوتا ہے اکثر صورتوں میں قصہ کی روش ایک ہی ہوتی ہے اور پڑھنے والا اُسکے جزئیات تک سے واقف ہوتا ہے ہرچند کہ اشخاص قصہ کے نام بدل دیے جاتے ہیں مگر اصل قصہ پُرانا ہوتا ہے۔ جدت صرف وہیں ہوتی ہے جہاں ختم قصہ کے قریب افشائے راز ہوتا ہے۔ واقعات جو ایک محدود دائرہ میں بیان کیے جاتے ہیں بدمزگی کے ساتھ بار بار دُہرائے جاتے ہیں"۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو میں ڈراما کی کمی کو مثنوی پورا کرتی ہے مگر حق یہ ہے کہ جو لوگ ڈراما کے فن سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مثنوی اور ڈراما میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وجہ سے کہ مثنوی میں نہ تو کیریکٹر نویسی ہے نہ پلاٹ قائم کیا جاتا ہے عمدہ مواقع جو ڈراما میں پیدا کیے جاتے ہیں اُن کا مثنوی میں کہیں پتہ نہیں اور نہ وہ دلچسپ مکالمے ہیں جو ڈراما کی جان ہیں۔ واقعات کی حرکت نہایت آہستہ اور عمل معدوم ہوتا ہے۔ اُردو مثنویاں محض رسمی اور قواعد قدیمہ کی پابند ہیں۔ شاہنامہ فردوسی اور سکندر نامۂ نظامی کی اُن کو ہوا بھی نہیں لگی۔ البتہ جیسا کہ بیان کیا گیا مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم باعتبار فصاحت و بلاغت روانی اور سلاست جیسی بندش وغیرہ کے بے نظیر ہیں۔

مراثی مراثی ادب اُردو کی ایک نمایاں صنف ہے ان میں مناظر خوب خوب دکھائے جاتے ہیں۔ ہرچند کہ پیروی فطرت پوری طرح نہیں کی جاتی پھر بھی معرکۂ کارزار مبارزین کی جانبازی، صبح اور شام کا سماں، جنگلوں اور میدانوں کے منظر، دھوپ اور گرمی کی شدت وغیرہ کے مکمل نقشے الفاظ میں بے مثل طریقہ سے کھینچ دیے گئے ہیں۔ پرزور اور فصیح بیانیہ نظموں کی یہ بہترین صنف ہے اس کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک آئندہ باب میں بیان کیا جائے گا۔

قطعہ اور رباعی ان اصناف سخن کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہے ان میں نصیحت آمیز خیالات اور عمدہ عمدہ مضامین نظم کئے جاتے ہیں۔ تمام بڑے بڑے شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں جن میں انیسؔ و دبیرؔ اور حالیؔ کی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔

استاد و شاگرد کا تعلق اُستاد اور شاگرد کا تعلق اب اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے ابتدائی کلام اُستاد کو دکھا لیا جاتا ہے اور شعرا سے اس فن میں ایک باقاعدہ قواعد لی جاتی ہے۔ چنانچہ شعرائے اُردو ایک بڑے سلسلہ میں وابستہ ہیں۔ شاگرد عموماً اپنے اُستاد کا تتبع کرتے ہیں استاد سے انحراف کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اس اتباع کی وجہ سے قدرتی ذہانت اور طباعی کا خون ناحق ہوتا ہے اور شاعری وہی رسمی رہ جاتی ہے کبھی کبھی البتہ کوئی خاص آدمی اس دائرہ اتباع سے علیحدہ ہو کر شہرت حاصل کر لیتا ہے

مشاعرے مشاعرے میں سخن گو اور سخن سنج سب جمع ہوتے ہیں اور کسی طرح پر طبع آزمائی کی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ اس سے اُردو شاعری کو بہت ترقی ہوتی ہے اس قسم کی کوئی چیز یورپ میں نہیں ہے۔

تخلص شاعر اپنے کلام میں اپنے واسطے اپنے نام کے علاوہ ایک خاص نام اختیار کر لیتا ہے جس کو تخلص کہتے ہیں بعض اوقات استاد شاگرد کے واسطے تخلص کا انتخاب کرتا ہے کبھی کبھی اپنے مختصر نام سے تخلص کا کام لیا جاتا ہے۔

اُردو شاعری کے خصوصیات باوجود اُن نقائص کے جو اوپر بیان ہوئے اُردو شاعری جذباتی شاعری ہے اور ہمارے فطری جذبات میں کشش پیدا کرتی ہے۔ ماسوا اس کے شیریں اور لطیف اور اپنے طرز خاص میں بے مثل ہے وہ عشق میں شرابور ہے نغمہائے غم عشق کی ناکامیاں، حسرت و ارمان ہجر کا قلق یہ اور اس قسم کے بیسیوں مضامین جو اُردو شاعری کی جان ہیں ہمارے قلب پر ایک خاص اثر کرتے ہیں۔ اس میں ایسے جواہر بے بہا شامل ہیں جو اپنی آب و تاب سے انگریزی کیا بلکہ دنیا کے علم ادب سے علو خیال

نزاکت الفاظ، موسیقیت، حسن تخیل، محویت وغیرہ میں بے تکلف مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس میں کسی کو کوئی کلام نہیں کہ بہت سا کلام ناقص اور بے مزہ ہے مگر یہی حال دنیا بھر کی شاعری کا ہے اُردو کی نظم و نثر کو وجود میں آئے ہوئے ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا اگر زمانۂ حال کی تہذیب و تعلیم کا اثر اس پر اچھا پڑ رہا ہے اس وجہ سے کہ اب اس میں قومی ترانے اور جوشیلی اور نیچرل نظمیں اور انگریزی نظموں کے ترجمے بہ کثرت ہونے لگے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب طبائع پرانی لکیر کے فقیر رہنے کو پسند نہیں کرتیں اور جدید راہیں نکالتی ہیں۔ بہر حال اُردو کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے کیونکہ مشرق و مغرب دونوں کے قابل اور با اثر لوگ اُس کی فلاح و ترقی میں دل سے کوشاں ہیں۔

باب ۴

قدیم شعرائے دکن

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اُردو شاعری کی ابتدا مسلمان فرمانروایان دکن کے دربار میں دکھنی زبان میں ہوئی۔ اس معاملہ کو زیادہ تفصیل سے لکھنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ یہ دریافت کیا جائے کہ دکھنی سے کیا مُراد ہے اور اس میں اور زبان اُردو میں کیا فرق ہے۔

دکھنی کیا چیز ہے دکھنی زبان ہندوستان کی ایک شاخ ہے جس کو مسلمانان دکن بولتے ہیں۔ اُردو کے مانند وہ بھی فارسی نستعلیق خط میں لکھی جاتی ہے مگر اس میں فارسی الفاظ کی کثرت نہیں ہے اس میں بعض خصوصیتیں ہیں جب مسلمان فوجیں اپنے ساتھ اپنی زبان کو ملک دکن میں لے گئیں اُس وقت اس میں بہت سے ایسے محاورے داخل ہوگئے جو اب ادب اُردو سے متروک ہو گئے ہیں جب اس نئی زبان کا میل اطراف و جوانب کی زبانوں میں یعنی مرہٹی، ٹامل اور تلنگی سے ہوا تو اس کے محاورے اور ساخت

میں کسی قدر فرق آگیا مثلاً حالت فاعلیت میں اسم یا ضمیر کے بعد اور فعل ماضی سے قبل حرف "نے" استعمال نہیں کیا جاتا جیسے کہ مغربی ہندی کی شاخوں میں قاعدہ ہے۔ اسی طرح بجائے "مجھ کو" کے "میرے کو" بولتے ہیں یہ اور اسی قسم کے چند خصوصیتیں شمالی ہندوستان میں بھی پہونچیں جہاں صفائی زبان کی تدریجی رفتار میں ان میں سے اکثر متروک ہوگئیں۔ نظر بریں دکھنی کو ایک خراب قسم کی ادبی اردو خیال کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اُس کو اُردو کی شاخ سمجھنا چاہیئے جس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں میں نشو ونما پائی اور ولی اور اُس زمانہ کے مشہور شعرا کی کوشش سے اس کو ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔

زبان دکھنی کی ابتدا ملک دکن کی فتح خلجیوں کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ جس نے ملک دکن پر حملہ کیا اور اُس کو فتح کر کے سلطنت دہلی کا ماتحت بنایا سلطان علاء الدین خلجی ہے۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کا دو مرتبہ دکن جانا بھی اہمیت سے خالی نہیں۔ کیونکہ سلطانی حکم کے بموجب اکثر باشندگان دہلی کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ بڑے بڑے علمائے کبار اور صوفیائے عظام معمولی لوگوں کے ساتھ بادشاہ کے ہمرکاب تھے۔ اس کے بعد بھی سلسلۂ آمد و رفت جاری رہا مگر اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی تباہ ہوگئی چنانچہ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے "چوں مردم اطراف کہ در دولت آباد بہ تکلیف ساکن شدہ بودند پراگندہ گشتند۔ پادشاہ مدت دو سال در انجا ماندہ ہمت بر تعمیر دولت آباد گماشت و مادر خود مخدومہ جہاں را با سائر حرم ہا و امرا و سپاہی روانہ دولت آباد گردانید۔ واحدے از مردم دہلی را کہ بہ آب و ہوائے آنجا خو گرفتہ بودند بحال خود نگذاشتہ طرا بدولت آباد فرستاد و دہلی نوعی ویران گشت کہ آواز ہیچ متنفسے بجز شغال درو باہ وجانوران صحرائی بگوش نمی رسید" مختصر یہ کہ دہلی کے باشندے اب دکن کے باشندے ہوگئے۔ اور دلی کا نقصان دولت آباد کا فائدہ ہوا۔ امتداد زمانہ کے باعث آب و ہوا کے

اثرات، زبانوں کے اختلاط، اور مقامی باشندوں کے ساتھ ربط وضبط نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ جو زبان دلی والے اپنے ساتھ لے گئے تھے اس میں نمایاں تغیر ہو گیا۔ اور آخر ان دونوں زبانوں میں معتد بہ فرق معلوم ہونے لگا۔

دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے اسباب

اس امر کی تحقیقات کہ دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے کیا اسباب ہوئے بہت دلچسپ ہے قرین قیاس یہ تھا کہ اُس کی نشو نما دلی میں ہوتی جو اس کا اصلی گھر تھا. مگر بجائے اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم شعرا اُردو کا گہوارہ دلی سے اتنا دور دراز مقام یعنی دکن ہے۔ اِس کی کیا وجہ ہے. اس ضروری سوال کا جواب. دینے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے اس کے صحیح جواب کے لئے ایک اہم واقعۂ تاریخی کی طرف حوالہ دینا ضروری ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مشہور خاندان بہمنی کا بانی ایک برہمن گنگو نامی کا ایک چیلا تھا جب کہ انقلاب زمانہ سے وہ تخت نشین ہوا تو اُس نے نہ صرف شگون نیک کے واسطے اپنے گرو کا نام تعظیماً اپنے خاندان کے نام میں شامل کیا بلکہ اُس کو اپنا وزیر مال بھی مقرر کیا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ یہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ گنگو پہلا برہمن ہے جس نے ایک مسلمان بادشاہ کی ملازمت اختیار کی اُس سے قبل برہمن لوگ معاملات ملکی میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ اُن کی زندگی امور مذہبی کی خدمت کے واسطے وقف تھی۔ گنگو کے زمانہ سے یہ رسم نکل آیا کہ وزارت مال تمام فرمانروایان دکن کی مملکت میں برہمنوں کو تفویض ہوتی ہے ہندوؤں کے صیغہ مال میں تقرر سے یہ نتیجہ ہوا کہ زبان ہندی نے جلد ترقی کرنا شروع کی اور نیز ان دو بڑی جماعتوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ارتباط بڑھ گیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے بجائے دوسرے ممالک کے لوگوں کے دکھنیوں کو اپنی ملازمت میں رکھنا شروع کیا اور اُس کے حکم سے ملکی حسابات جو اب تک فارسی میں لکھے جاتے تھے

---

[۱] دیکھو تاریخ فرشتہ ترجمہ مسٹر برگ جلد ۲ صفحہ ۲۹۲۔

وہ برہمنوں کے زیر نگرانی ہندوی یعنی ہندی ہی میں لکھے جانے لگے[۱] اس سے دیسی زبان کو بڑی تقویت پہونچی۔ کیونکہ اب وہ سرکاری اور درباری زبان ہو گئی اور اس نے بڑی ترقی کرنا شروع کی۔ ہندوؤں کی تعداد ملک دکن میں کم نہ تھی یہ جماعت اپنی کثرت تعداد ہی کی بدولت مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگیوں میں فاتح اور برسر اقتدار شخص کو بہت مدد دیتی تھی کبھی ایک مسلمان حاکم اُن سے میل کرنا چاہتا تھا اور کبھی اُس کا حریف بعض اوقات چند مسلمان حکمران کسی ہندو راجہ کے خلاف بھی آپس میں میل کر لیتے تھے مگر اس ارتباط اور میل جول کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ باہمی معاملات سے زبان فائدہ اُٹھاتی رہی اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تین سو برس کے عرصہ میں یعنی جب تک بیجاپور اور گولکنڈہ خود مختار سلطنتیں رہیں ان دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں اتنا میل جول تھا کہ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان محض معمولی برتاؤ اور رواداری نہ تھی بلکہ ہندو رعایا اپنے مسلمان بادشاہوں کے ساتھ دلی محبت اور خلوص سے پیش آتی تھی اور یہ حالت برابر قائم رہی یہانتک کہ زوال سلطنت بیجاپور کے بعد مرہٹوں کے ساتھ ظلم و تعدی نے اُس کا خاتمہ کر دیا[۲]۔ باہمی ارتباط اور محبت و یگانگت کی حد یہ تھی کہ مسلمان بادشاہ اور امرا ہندو عورتوں سے شادی کرتے تھے اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی مسلمان عورتوں سے شادی کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ انتظام ملکی میں بہ کثرت ہندوؤں کا دخیل ہونا رواداری کی پالیسی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ گو کہ باہمی خانہ جنگیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سلاطین گجرات اور بہمنی بادشاہوں کو امن و امان سے سلطنت کرنے اور انتظام ملکی کو قائم رکھنے کے لئے سلاطین دہلی کی بہ نسبت زیادہ موقعے حاصل تھے جہاں کہ شمال سے برابر حملے ہوا کرتے تھے اور رعایا کی فلاح

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۸۰۔

[۲] دیکھو تاریخ دکن مصنفہ مسٹر کربیل جلد ۱ صفحہ ۲۹۴۔

اور بہبود مفقود تھی پس مختصراً ہنود و مسلمانوں کا باہمی ارتباط، مسلمان فرمانرایان دکن کی سلطنت میں ہندوؤں کا عروج، حساب کتاب کا زبان ملکی میں تبدیل کر دیا جانا، یہ سب اسباب ال کر اس کا باعث ہوئے کہ دیسی زبان جو دکھنی کے نام سے مشہور تھی وہ ترقی کر کے ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ اس کے علاوہ ملک دکن میں اکثر بزرگان دین اور اولیاء اللہ بھی رہتے تھے جو ہندو اور مسلمانوں کی زبان اور مذہب میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ عوام الناس کے ساتھ میل جول کے خیال سے دیسی ہی زبان کو پسند کرتے تھے چنانچہ اکثر قدمائے اردو صوفی منش اشخاص تھے اور اُن سب کے اشعار بہت صاف اور عام فہم زبان میں ہوتے تھے۔ اس مختصر بیان سے اُردو شاعری کی نشو و نما کا کچھ حال تو معلوم ہو گیا مگر اُس زمانہ کے شعرا کے حالات مکمل اور یکجا کسی معاصر تذکرہ میں نہیں دیکھے گئے تذکروں میں صرف بعض شعرا کے نام ملتے ہیں اور اُن کے کلام کا بھی کچھ نہ کچھ نمونہ موجود ہے مگر یہ تذکرے بہت بعد کی تصنیف ہیں، غنیمت ہے کہ اس زمانہ میں اس مسئلہ خاص میں کافی دلچسپی لی جا رہی ہے۔ اور ہم کو امید ہے کہ قابل لوگوں کی توجہ سے اس پر کافی روشنی پڑے گی۔

شاہان بہمنی کا زمانہ ۷۴۸ھ لغایت ۹۳۲ھ

آٹھویں صدی ہجری سے دکن میں علم و ادب کی ابتدا ہوتی ہے اُس زمانہ کی تصانیف کے جو نمونے اس وقت موجود ہیں وہ زیادہ تر مذہبی کتابوں کی صورت میں ہیں۔ اور اُن کے مؤلف اُس وقت کے صوفی مشرب لوگ تھے جن میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام حسب ذیل ہیں گنج الاسلام شیخ عین الدین (متوفی ۷۹۵ھ) خواجہ سید گیسو دراز شاہ میرانجی، مولانا وجہی اور سید شاہ میر وغیرہ۔ یہ لوگ زیادہ تر نثار تھے۔ ان کا کچھ مختصر حال ہم اس کتاب کے حصۂ نثر میں بیان کریں گے۔

قطب شاہیوں کا عہد ۹۱۶ھ تا ۱۰۹۸ھ

سلطنت بہمنی کے زوال کے بعد بیجاپور گولکنڈہ

اور احمد نگر کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں اس زمانہ میں دکھنی زبان کو بہت ترقی ہوئی ہندو رانیوں کی وجہ سے جو شاہی محلوں میں تھیں ویسی زبان کو اور بھی تقویت پہونچی یوسف عادل شاہ کی بیوی جو بوبوجی کے نام سے مشہور تھیں، مکند راؤ مرہٹہ کی بہن تھیں، بھاگ متی سلطان محمد قلی شاہ کی محبوب بیوی تھیں احمد نظام شاہ والی احمد نگر کی ماں بھی ہندو تھیں۔

شاہان گولکنڈہ و بیجاپور نہایت قدردان فن مہذب اور قابل بادشاہ تھے شعرا کی قدردانی کے ساتھ خود بھی فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو کو دکن میں دکھنی کہتے ہیں اُن کے دربار میں ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ اس نئی زبان کے اطراف وجوانب میں تلنگی مرہٹی اور کنٹری زبانیں بولی جاتی تھیں مگر بے میل ہونے کی وجہ سے اُن سے اُردو کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا تھا اس کے علاوہ نئی زبان کے ترویج و اشاعت کا انحصار ایسے لوگوں پر تھا جو فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں سے ناواقف تھے اسی وجہ سے اس نئی زبان یعنی دکھنی کی ترکیب، زبان فارسی کے مطابق ہوئی دربار گولکنڈہ اُس وقت کے شعرا اور اُدبا کا مجمع تھا جن میں مندرجہ ذیل شعرا کے نام تذکروں میں ملتے ہیں مگر حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ غواصی، ملا قطبی، ابن نشاطی، جنیدی، طبعی، نوری، فائز، شاہی، مرزا، شعور، بیچارہ، طالب، مومن۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ ۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۱۱ء یہ سلطنت ۱۵۱۸ء میں قائم ہوئی اور ترقی کی معراج پر پہونچ گئی سلطان قلی قطب شاہ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر جو ۱۵۸۰ء میں واقع ہوئی بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا ۱۵۸۷ء میں سلطان مذکور نے ابراہیم عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور کے ساتھ صلح کی اور اپنی بہن کا نکاح اُن کے ساتھ کردیا۔ وہ شہنشاہ اکبر اور شاہ عباس صفوی کا ہمعصر تھا گولکنڈہ سے کچھ فاصلہ پر اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام سے ایک شہر بھاگ نگر آباد کیا۔ مگر تھوڑے عرصے

کے بعد اس نسبت کو بدل کر اسی شہر کو حیدر آباد کے نام سے موسوم کیا جو موجودہ فرمانروائے
دکن کا مشہور دارالسلطنت ہے۔ قطب شاہ کو علاوہ شعر و شاعری کے دیگر فنون
لطیفہ کا بھی بہت شوق تھا چنانچہ فن تعمیر سے بھی اُن کو دلچسپی تھی دو مشہور عمارتیں
مشہور بہ خداداد محل اور بارگاہ خسروی تعمیر کرائیں۔ اُن کے دربار میں بڑے بڑے صاحب
کمال اور استادان فن عرب و ایران سے اُن کی داد و دہش اور قدر دانی کا حال سُن کر آتے
تھے اور اُن کی فیاضی سے مستفیض ہوتے تھے۔ بادشاہ نے ایک خاص وقت مقرر کیا تھا
جبکہ علما و شعرا میں مناظرے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ خوشنویسی کا بھی اُن کو بہت ذوق تھا
چنانچہ مشہور خطاط ایران و عراق کے اُن کے دربار میں جمع ہو گئے تھے علاوہ دیگر باکمالوں
کے دو مشہور عالم اُن کے دربار میں میر محمد مومن استرآبادی اور میر جملہ تھے قطب شاہ کا
مذہب شیعہ تھا اور وہ اکثر مناظرے اپنے مذہب کی حمایت میں اہل دربار میں منعقد کراتے
تھے۔ اسی مذہبی شوق کی وجہ سے بہت سے مرثیے اس عہد میں کہے گئے علاوہ قدردان فن
ہونے کے خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ چنانچہ ان کا کلام بزبان دکھنی و تلنگی و فارسی ایک
ضخیم کلیات کی صورت میں جس کے اٹھارہ سو صفحے ہیں موجود اور محفوظ ہے۔ اشعار فارسی
میں قطب شاہ اور دکھنی میں معانی تخلص کرتے تھے ان کی کلیات میں حسب ذیل
اصناف سخن موجود ہیں۔ مثنویاں قصیدے ترجیع بند۔ مراثی بزبان فارسی و دکھنی اور
رباعیات دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے تھے سادگی
اور شیرینی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ تصوف اور عاشقانہ رنگ بھی ان کے اشعار میں پایا جاتا
ہے۔ مرقع نگاری اور مناظر قدرت کی بنیاد انھیں کی رکھی ہوئی ہے جو سودا اور نظیر اکبر آبادی
کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچی۔ اکثر مثنویاں خاص ہندوستانی پھلوں اور ایک ہندوستانی
ترکاریوں اور ایک شکاری چڑیوں کے متعلق ہے بعض نظموں میں شادی بیاہ اور ولادت
کے رسم و رواج ہنود اور مسلمانوں کے مذہبی تہوار مثلاً ہولی دیوالی عید بقرعید بسنت وغیرہ

بعض میں ہندوستان کے موسم برسات کا ذکر نہایت دلچسپی سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دلچسپ مکالمہ صراحی و ساغر کا منظوم کیا ہے۔ ایک قصیدہ باغ محمد شاہی کی تعریف میں اور اکثر قصائد حمد و نعت اور منقبت میں ہیں۔ معرکۂ کربلا کے مؤثر مراثی بھی لکھے ہیں۔

قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں جن کا کلام اردو مجموعی صورت میں موجود ہے۔ ان کی زبان میں کافی پختگی اور ترقی پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے ان سے بھی پیشتر کچھ لوگ گزرے ہوں جنھوں نے شعر کہا ہو مگر ان کے کلام کا اس وقت تک کہیں پتہ نہیں ملا۔ کچھ مذہبی مثنویاں قطب شاہ سے پیشتر کی موجود ہیں مگر وہ کسی معنی میں ادبی تصنیفات نہیں کہی جا سکتیں۔ قطب شاہ ہی کا کلام اب تک ایسا کلام کہا جا سکتا ہے کہ جس میں ایک ادبی شان موجود ہے۔ انھوں نے سب سے پیشتر فارسی کے تتبع میں شعر کہے اور ایک دیوان بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا اور یہ سہرا اب تک عدم تحقیق کی وجہ سے ولی کے سر تھا۔ علاوہ متعارف مضامین کے ان کے کلام میں قابل تعریف بات یہ ہے کہ اصلیت اور جدت ہے اور بعض مقامی دلچسپیوں کو بھی انھوں نے قلمبند کیا ہے۔ فارسی کے وہ پورے تتبع نہیں ہیں کیونکہ ان کے کلام میں ہندی کا بھی بہت بڑا اثر پایا جاتا ہے۔ ہندی الفاظ اور ترکیبیں، ہندی استعارے اور تشبیہیں، ہندو فارسی الفاظ ضد اکی تعریف ٹھیٹ بھاشا میں ہندو سورماؤں اور بہادروں اور ہندوستان کی روایات کا ذکر، اظہار عشق عورت کی جانب سے مرد کے واسطے، جو ہندی شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ یہ سب باتیں ان کے کلام کی خصوصیات ہیں معشوق سے طریقۂ خطاب جو بعد میں الٹ گیا ان کے یہاں صحیح طریق پر پایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ فارسی کا اتباع بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ کیونکہ قواعد نظم الفاظ، محاورات، ترکیبیں، مضامین تشبیہات اکثر ان کے کلام میں موجود ہیں۔ وہ اپنی قابلیت کا اظہار نہیں کرتے اور فارسی عربی الفاظ کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے روزمرہ میں مشہور ہیں) عام اس سے کہ وہ لغوی طریق پر صحیح ہوں یا غلط۔ فی الحال چونکہ وہ قدیم زبان متروک ہو گئی ہے اور لوگوں کو

اُس میں کوئی لطف نہیں آتا اس لئے ان کا کلام دلچسپی سے نہیں پڑھا جاتا مگر جب نظر تحقیق وسیع ہو گی تو اُن کے کلام کی قدر کی جائے گی۔ مختصراً یہ کہ قلی قطب شاہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور اُردو کو ایسا وسیع کیا کہ آئندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ اُنھوں نے ایک ایسے ادب شعر کی بنیاد رکھی جس کے پیرو اور مختتم میرؔ و سوداؔ انیسؔ و دبیرؔ ذوقؔ و غالبؔ وغیرہ ہوئے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

دل نانگ خدا کن کہ خدا کام دوے گا		تمنن کی مرادن کے بھرے جام دویگا
کرتے ہیں دعوائے شعر کا سب اپنی طبع سوں		بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

سلطان محمد قطب شاہ ۱۶۱۱ء لغایت ۱۶۲۵ء	سلطان محمد قطب شاہ سلطان قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین تھے اُن کی ولادت گولکنڈہ میں ۱۵۹۱ء میں ہوئی اور اُن کی

شادی اپنی چچازاد بہن یعنی سلطان قلی قطب شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ نہایت متشرع اور پابند مذہب سخی اور فن تعمیر کے دلدادہ تھے منجملہ دیگر تعمیرات کے الٰہی محل۔ جامع مسجد معروف بہ مکہ مسجد۔ محمدی محل۔ دال محل مشہور ہیں۔ نظم و نثر فارسی و اُردو دونوں خوب لکھتے تھے۔ اُن کے دو دیوان ہیں ایک فارسی اور ایک دکنی جن میں اکثر اصناف سخن موجود ہیں۔ فارسی میں **ظل اللہ** اور اُردو میں **قطب شاہ** تخلص کرتے ہیں۔ اسی توافق تخلص کی وجہ سے ان دونوں بادشاہوں کے کلام میں خلط ملط ہو گیا ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کا تخلص اُردو کلام کے واسطے اور سلطان قلی قطب شاہ کا فارسی کے واسطے مخصوص تھا۔ ان کے دونوں دیوان حیدرآباد میں نواب سر سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں بھی شیرینی، صفائی لطافت پائی جاتی ہے نمونہ کلام یہ ہے۔

	سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ		محبت پر نظر رکھ کر لبسر غیظ	

دولب ترے رنگیلے یاقوت کو دیے رنگ
لے بھیک رنگ عقیقاں رنگیں ہوے یمن میں

سلطان عبداللہ قطب شاہ ۱۶۲۵ء لغایت ۱۶۷۴ء	عبداللہ قطب شاہ سلطان محمد قطب شاہ کے بیٹے اور سلاطین قطب شاہی میں چھٹے بادشاہ تھے۔ ۱۶۱۴ء

میں پیدا ہوے اور اپنے باپ کی وفات کے بعد ۱۶۲۵ء میں تخت نشین ہوے انھوں نے شاہ جہاں کے سامنے گردن اطاعت خم کی اور ایک سالانہ رقم بطور خراج کے دینا منظور کیا۔ ۱۶۵۶ء میں جب شاہجہاں اُن سے ناراض ہوے تو شاہزادہ اورنگ زیب نے جو اُس وقت ممالک محروسۂ دکن کے صوبہ دار تھے حیدر آباد پر چڑھائی کر کے اس شہر کو تہ وبالا کر دیا۔ عبداللہ نے اپنی شکست قبول کر کے تمام شرائط صلح منظور کر لیے اور اس وقت سے وہ سلطنت مغلیہ کے ایک باجگزار کی حیثیت سے ہو گئے۔ یہ بھی مثل اپنے باپ کے شعر و شاعری کے دلدادہ تھے اور اُنھیں کی طرح اُن کو بھی فن تعمیر کا بڑا شوق تھا ان کا دربار بھی فارس اور عرب کے عالموں فاضلوں سے بھرا رہتا تھا اور وہ سب اُن کی فیاضی سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ اکثر کتابیں اس عہد میں اُن کے نام سے لکھی گئیں مثلاً برہان قاطع اور ایک لغت موسوم بہ لغات فارسی یہ فارسی اور دکھنی دونوں میں شعر کہتے تھے اور تخلص عبداللہ تھا۔ ان کے دیوان فارسی اردو دونوں میں موجود ہیں۔ ان کے اشعار بہت صاف اور شیریں ہوتے ہیں آصفی ملکاپوری نے اپنے تذکرۂ شعرائے دکن میں ان کے اکثر اردو اشعار بطور نمونہ پیش کیے ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تری پیشانی پر ٹیکا جھمکتا
تماشا ہے اُجالے میں اُجالا

آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا
کرتے ہیں جھ سے خضر علیہ السلام بحث

جو کچھ راز پردہ میں ہیں غیب کے
سو مخفی نہیں اُس پہ ہیں آشکار

ابن نشاطی	اِس زمانہ کے شعرائے دکن میں ابن نشاطی بہت مشہور ہوے ہیں

یہ گولکنڈہ کے رہنے والے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے انکے حالات زندگی کچھ معلوم نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ ایک مثنوی موسوم بہ "پھول بن" کے مصنف ہیں جو زبان دکنی میں ہے اور عشق و عاشقی کا قصہ ہے اس کا نام اسکی ہیروئن کے نام پر رکھا گیا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک فارسی کتاب بساتین کا ترجمہ ہے اس میں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایات بھی ہیں اور ایک فرضی شہر مشہور بہ کنچن پاٹن کا حال ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ تقریباً ۱۳۰ صفحہ کا ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ معمولاً حمد و نعت و منقبت سے ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تعریف ہے پھر اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ قصہ میں انسانوں کے قالب بدلنے اور جانوروں کے قالب میں آجانے کا ذکر ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ سرور نے اسی کے مطالعہ کے بعد فسانہ عجائب لکھی ہو۔ اس کی تصنیف ۱۰۶۶ھ میں ہوئی[1]۔

غواصی کا قصہ "سیف الملوک" غواصی نے بزبان دکھنی ایک مثنوی لکھی ہے جسمیں سیف الملوک شاہزادہ مصر اور بدیع الجمال شاہزادی چین کے عشق کا حال ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے۔ غواصی مذہب کا شیعہ تھا۔ اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا شاعر تھا قصہ سیف الملوک غالباً الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ شروع میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد بادشاہ کی تعریف ہے جس کا ذکر کتاب کے اٹھارھویں شعر میں ہے۔ انھوں نے ایک اور مثنوی بھی لکھی ہے جس کا نام طوطی نامہ ہے اور یہ ۱۰۴۹ھ میں تمام ہوئی اور جس کو سر چارلس لائل غلطی سے ابن نشاطی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ در اصل یہ قصہ ضیاء بخشی کے فارسی طوطی نامہ سے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اردو میں ترجمہ ہوا تھا اس وجہ سے کہ دیباچہ میں انھیں کی بہت زیادہ تعریف ہے۔ اس کا ماخذ اصلی سنسکرت کی کتاب "سوکا سپتتی" بتایا جاتا ہے۔ غواصی کے اس قصہ سے مولوی حیدر بخش نے جو

[1] "دکن میں اردو" ۱۲

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مدّرس تھے اپنا مشہور طوطی نامہ ۱۸۰۱ء میں تیار کیا۔ غواصی نے اپنا تخلص ایک ترجیع بند میں ظاہر کیا ہے۔ اور سنِ تصنیف دیباچہ سے ۱۶۲۹ء (مطابق یکم رجب ۱۰۴۹ھ پایا جاتا ہے۔ ملا غواصی گولکنڈے کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر ہیں۔ نصرتی نے گلشن عشق میں ان کا تذکرہ کیا ہے ؎

کیا تازہ باغ بدیع الجمال		پڑی کچھ غواصی تنی کر خیال	

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "غواصی تخلص در وقت جہانگیر ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۷ھ بود طوطی نامہ بخشی را نظم نمودہ است، بزبان قدیم نصفے فارسی نصفے ہندی بطور بکٹ کہانی سرسری دیدہ بودم شعر آں نظم یاد نیست۔

سبرس مصنفۂ مولانا وجہی | ایک ضروری کتاب موسوم بہ سبرس کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے جس کو نثر دکنی میں مولانا وجہی نے تصنیف کیا تھا۔ مولانا موصوف سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر اور غواصی کے معاصر تھے۔ یہ کتاب سلطان عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے ۱۰۴۰ء یا ۱۰۴۵ء میں تصنیف ہوئی۔ قدیم نثر دکنی کے نمونے سبرس سے پیشتر کے بھی موجود ہیں مگر وہ سب مذہبی رنگ یا تصوف میں ہیں۔ سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے بتلایا ہے کہ جن کی کوششوں سے یہ کتاب پبلک کی نظروں میں آئی یہ ہے کہ یہ ایک مسلسل قصہ ہے نیز یہ کہ اس کی عبارت ادبی شان رکھتی ہے اور نثر مقفٰے ہے جیسا کہ فارسی میں ظہوری کا رنگ ہے۔ زبان بہت صاف اور سادہ ہے اور قصہ میں روانی پائی جاتی ہے نفس قصہ مختصر ہے جس میں جابجا اشعار حسب موقع عشق، عقل، شجاعت، حرص وغیرہ کے موضوع پر لائے گئے ہیں۔ اس کی زبان بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ قطب شاہیوں کے کلیات کی ہے۔

تحسین الدین | ممکن ہے کہ یہ نام ہو یا کوئی خطاب۔ غرضکہ ان بزرگ نے ایک مثنوی لکھی جس کا نام "کامروپ کلا" ہے۔ کلا شاہ لنکا کی بیٹی قصہ کی ہیروئن ہے اور کامروپ،

شاہ اودھ کا بیٹا ہیرو ہے۔ قصہ یہ ہے کہ یہ دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے جیسا کہ الف لیلہ میں چین والی شہزادی کی نسبت لکھا ہے۔ کامروپ اپنی نادیدہ بلکہ خواب دیدہ معشوقہ کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا ہے جہاں اس کو عجب عجب واقعات پیش آتے ہیں اور بالآخر اُس کی شادی کلا کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ مصنف مسلمان ہے اور اشخاص قصہ سب ہندو ہیں۔ اسی مثنوی کو گاسن ڈیٹاسی نے ۱۸۳۶ء میں قصۂ کامروپ کے نام سے شایع کیا تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مشہور جرمن شاعر گیٹے نے اس نظم کو ترجمہ کرا کے سنا اور اُس سے بہت محظوظ ہوا۔

ملا قطبی | اُنھوں نے ۱۰۴۶ھ میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ زبان فارسی سے دکھنی میں کیا۔ یہ کتاب شیخ یوسف دہلوی نے ۷۹۵ھ میں اپنے بیٹے کی تعلیم کے واسطے تصنیف کی تھی یہ ۸۶۷ بند کا ایک قصیدہ ہے جسے ملا قطبی نے اُسی بحر اور اسی ردیف و قافیہ میں ترجمہ کیا ہے۔

جنیدی | ان کی نسبت کچھ اور معلوم نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک مثنوی ماہ پیکر کے مؤلف ہیں جس کا سنہ تصنیف ۱۰۶۴ھ ہے۔

طبعی | گولکنڈہ کے رہنے والے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ ان کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" ہے جس کا مضمون ہفت پیکر نظامی سے ماخوذ ہے۔ سنہ تصنیف ۱۰۸۱ھ ہے۔ دیباچہ شاہ راجو حسینی کے نام سے ہے۔ جو گولکنڈہ کے ایک بہت بڑے بزرگ اور اولیاء اللہ سے تھے۔ اور خاتمہ پر ابوالحسن تانا شاہ کی تعریف ہے یہ تقریباً تیرہ چودہ سو شعر کی مثنوی ہے۔

ابوالحسن قطب شاہ ۱۶۷۲ء لغایت ۱۶۸۷ء متوفی ۱۷۰۴ء | ابوالحسن قطب شاہ مشہور بہ تانا شاہ گولکنڈہ کا سب سے آخری تاجدار نہایت عیش پسند اور نازک دماغ تھا یہ خود بھی نہایت قابل اور قابلوں کا قدردان تھا۔ ایک شعر تذکرۂ گلشن ہند میں اُس کی طرف

منسوب ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا اور اس کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ جب گولکنڈہ سات ماہ کے محاصرہ کے بعد ۱۶۸۷ء میں فتح ہوگیا اور سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ قرار پایا تو ابوالحسن قید کر لیا گیا اور اس کی باقی عمر قید میں گذری مشہور ہے کہ اس کو حقہ کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے حقہ پینے کی اجازت قید خانہ میں بھی طلب کی تھی شعرائے ذیل ابوالحسن تاناشاہ کے زمانہ میں یا اُن کے دربار کے شاعر تھے۔

نوری | سید شجاع الدین نوری گجرات کے معزز خاندان سادات سے تھے وہ سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے وزیر کے بیٹے کو پڑھاتے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اُن کا ذکر کیا ہے۔ ان کو ان ملا نوری سے نہ ملانا چاہیئے جو فیضی کے دوست تھے اور جن کا ایک شعر قائم نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے۔ گارسن ڈیتاسی اور سرچارلس لائل نے نام کے التباس کی وجہ سے دھوکہ کھایا ہے اور دونوں کو ایک سمجھا ہے۔

فائز | یہ گولکنڈہ کے رہنے والے تاناشاہ کے عہد کے شاعر تھے ۱۰۹۴ھ میں انھوں نے قصۂ رضوان شاہ و روح افزا کا ترجمہ نثر فارسی سے نظم دکنی میں کیا۔ یہ مثنوی قصۂ رضوان شاہ کے نام سے مشہور ہے مگر کتب خانۂ آصفیہ میں مثنوی روح افزا کے نام سے ہے۔

شاہی | شاہ قلی خاں نام اور بھاگ نگر (موجودہ حیدرآباد دکن) کے رہنے والے تھے شاہی ملازمت کرتے تھے رفتہ رفتہ تاناشاہ کے ندیم خاص ہوگئے۔ شمالی ہند کی بھی سیر کی تھی تذکرۂ میر حسن میں ان کا ذکر ہے۔

مرزا | ابوالقاسم متخلص بہ مرزا حیدرآباد کے رہنے والے تاناشاہ کے مصاحب تھے تاناشاہ کے انتزاع سلطنت کے بعد یہ فقیر ہوگئے اور حیدرآباد میں بقیہ عمر بسر کی اور وہیں انتقال کیا۔ تذکرۂ میر حسن میں ان کا ذکر ہے۔

عادل شاہیوں کا زمانہ ۸۹۵ھ لغایت ۱۰۹۷ھ | سلطنت عادل شاہی کی بنیاد پڑنے سے

مدتوں پیشتر بیجاپور میں اردو زبان عام ہو گئی تھی امیر غریب ادنی اعلیٰ سب اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے سلاطین بہمنیہ نے یہاں کے شاہی دفتر کو بھی اسی زبان میں کر دیا تھا لیکن یوسف عادل شاہ اور اُس کے فرزند اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنے زمانہ میں شاہی دفتر کو فارسی میں منتقل کر دیا۔ کم و بیش پچاس سال فارسی عروج پر رہی۔ ابراہیم عادل شاہ اوّل نے جب تاج و تخت حاصل کیا تو اس نے حسب سابق فارسی کے عوض شاہی دفاتر میں زبان اردو کو رواج دیا اور یہ زبان سلطنت کی زبان قرار پائی۔ مورخ خافی خان نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ علی عادل شاہ اول نے اپنے زمانے میں فارسی زبان کو مروج کیا لیکن جب ابراہیم عادل شاہ ثانی حکمراں ہوا تو شاہی دفاتر میں پھر اُردو زبان جاری ہو گئی اور سلطنت عادل شاہیہ کی تباہی تک برابر جاری رہی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۲۶ء

مثل بادشاہان گولکنڈہ کے سلاطین بیجاپور بھی نہایت تعلیم یافتہ روشن خیال علم دوست بادشاہ تھے۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کو بھی شعر و شاعری اور فن تعمیر سے بڑا شوق تھا۔ فارسی کا مستند شاعر ظہوری جو ۱۵۸۰ء میں ہندوستان آیا اور ۱۶۱۶ء میں وفات پائی اسی دربار کا بڑا مشہور شاعر تھا۔ ظہوری کی دو کتابیں "خوان خلیل" اور "گلزار ابراہیم" اسی ابراہیم عادل شاہ کے نام پر ہیں اور اس کی تین مشہور فارسی نثریں جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہیں ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف نورس کا دیباچہ ہیں جو ہندی نظم میں فن موسیقی کی ایک مشہور کتاب ہے میر سنجر اور ملک قمی بھی اسی دربار کے بڑے شاعر تھے۔ سید شمس اللہ صاحب قادری لکھتے ہیں "ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی میں بے حد مہارت حاصل تھی۔ خاص کر سرود ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اُس عہد کے تمام گوئیے اُسے جگت گرو کہا کرتے تھے۔ اُس نے علم موسیقی پر (دھرپد) ایک کتاب لکھی تھی جس میں سرود ہندی کے قواعد و ضوابط قلمبند کئے تھے اور اس نام نورس نامہ رکھا تھا۔ یہ کتاب نظم دکھنی میں ہے۔ ملا ظہوری نے

اس پر دیباچہ لکھا تھا جو اس وقت سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے مصنف گل رعنا رقمطراز ہیں "کہ موسیقی کا شوق ایسا بڑھا کہ اطراف ہندوستان سے بلا کر تین چار ہزار گوئیے بیجا پور میں جمع کئے اور ۱۰۰۰ھ میں بیجا پور کے قریب نورسپور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس میں گرو اور چیلوں کے لئے بڑی بڑی محلسرائیں بن کر تیار ہو گئیں۔ شاہی محلسرا کا نام نورس محل۔ شاہی مُہر پر نورسی سکہ پر نورس۔ علم و نشان کے نام نورسی بعض شاعروں نے اپنا تخلص بدل کر نورسی قرار دیا۔

علی عادل شاہ ثانی
۱۶۵۶ء لغایت ۱۶۷۲ء

اس بادشاہ کے دربار میں بھی مشہور شاعر اور ادیب جمع تھے۔ بلکہ امن و سکون شیواجی مشہور سردار مرہٹہ کے متواتر حملوں سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ شیواجی نے اکثر قلعے فتح کر لیے اور افضل خاں کو جو بیجا پور کا سردار تھا۔ قتل کر دیا۔ اسی عادل شاہ کے زمانہ کا مشہور شاعر نصرتی جس کا نام محمد نصرت اور فرمانروائے کرناٹک کا رشتہ دار تھا۔ کرناٹک سے بیجا پور آیا جہاں علی عادل شاہ نے اس کو عہدہ منصب داری عطا کیا اور اپنا رفیق اور مصاحب بنایا۔ علی عادل شاہ ثانی کو دکھنی سے نہایت دلچسپی تھی اور وہ دکھنی شعرا کی نہایت قدر کرتا تھا بقول خافی خان " بادشاہے بود باہوش سپاہ دوست و در سخاوت و شجاعت و وسعت خلق مشہور۔ در حق شاعران ہندی زیادہ مراعات می فرمود۔ در عہد او ترجمۂ یوسف زلیخا تالیف ملا جامی و ترجمۂ روضۃ الشہدا و قصۂ منوہر و مدمالت کہ عاقل خاں خوانی بہ نظم در آوردہ مُلا نصرتی و دیگر شاعران بیجا پور بہ زبان دکنی تالیف نمودہ از نقد و جنس صلہ افروز خور سلاطین یافتند "۔ اس عہد کے مشہور شعرا یہ ہیں۔

رستمی۔ نصرتی۔ شاہ ملک۔ امین۔ سیوا۔ مومن۔ ہاشم۔ مرزا۔

رستمی | رستمی کا نام کمال خاں ولد اسمٰعیل خاں۔ دربار بیجا پور سے اس کا تعلق تھا۔ رستمی نے خدیجہ سلطانہ شہر بانو بیگم کی فرمایش سے ۱۰۵۹ھ میں خاور نامہ کا فارسی سے نظم دکنی میں ترجمہ کیا۔ خاور نامہ میں جناب امیر علیہ السلام کے محاورات مذکور ہیں اور فردوسی

کے شاہنامہ کے طرز پر لکھا ہے۔ شہر بانو بیگم کا عقد سلطان محمد بن ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ ہوا تھا۔[1]

نصرتی اس کے حالات تحقیق سے معلوم نہیں ہیں بقول سید شمس اللہ قادری "نصرتی کا نام شیخ نصرت اور وطن بیجاپور ہے۔ ان کے آبا و اجداد بیجاپور میں فوجی ملازم اور والد رکاب شاہی کے سلح دار تھے چنانچہ خود نصرتی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ نصرتی کے بھائی شیخ منصور ایک اہل دل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے بیجاپور کے مشاہیر فقرا میں ان کا شمار ہوتا ہے گلشن عشق کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نصرتی نے محمد عادل شاہ کے زمانہ میں دربار میں رسائی حاصل کی اور علی عادل شاہ کے دور میں عروج پایا اور ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا"۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری نے اپنے تذکرۂ شعرائے دکن میں نصرتی کا اس طرح ذکر کیا ہے "نصرتی تخلص، محمد نصرت نام دکنی المولد ہے۔ حاکم کرناٹک کے قرابت داروں سے تھا۔ آپ کی گذر اوقات توکل و قناعت پر تھی۔ مدت تک کرناٹک میں رہا۔ پھر سیر کرتا ہوا بیجاپور میں آیا ۱۰۷۶ھ عیسوی میں دکنی زبان میں علی نامہ لکھا۔ اس پر ملک الشعرائی کا خطاب عطا ہوا ۱۰۹۵ھ میں فوت ہوا نصرتی سنی المذہب تھا۔ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کا مرید و معتقد تھا جیسا کہ شعر سے عیاں ہے"۔ یہ نہیں معلوم کہ مؤلف تذکرۂ شعرائے دکن نے یہ مواد کہاں سے فراہم کیا۔ نصرتی کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:-

مثنویاں

(۱) علی نامہ ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں نصرتی نے ایک طویل مثنوی لکھی جس کا نام علی نامہ ہے جس میں اپنے محسن علی عادل شاہ کے اکثر واقعات نظم کئے ہیں۔ اس میں علی عادل شاہ کے سوانحات و فتوحات اور مجالس عیش و طرب کے واقعات کا بھی ذکر

[1] ماخوذ از اردوئے قدیم ۱۲۔

ہے۔ ان کے ضمن میں مختلف مواقع پر قصائد مدحیہ بھی درج ہیں اس کتاب کو زبان دکنی میں سب سے پہلی کتاب سمجھنا چاہیئے جو ایک بادشاہ کی تعریف میں بصورت قصیدہ لکھی گئی۔

(۲) گلشن عشق۔ دوسری مثنوی کا نام گلشن عشق ہے اور یہ ۱۰۶۸ھ ہجری مطابق ۱۶۵۷ء میں تحریر ہوئی تھی۔ اس میں ایک شخص مسمّی بہ کنور منوہر پسر سورج بھان اور مدھ مالتی کے عشق کا ذکر ہے۔ اس قصہ کو مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے لکھا ہے۔ عاقل خاں رازی نے اسی قصہ کو فارسی میں نظم کیا ہے اور شمع و پروانہ اس کا نام رکھا ہے۔ یہ مثنوی اپنی رنگین تشبیہوں اور استعارات کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ گلشن عشق کے اشعار بعض تو نہایت صاف ہیں اور بعض نہایت اوق کہیں عربی و فارسی کی آمیزش نظر آتی ہے تو کہیں بھاشا کی بہتات ہے۔ اس کے دیباچہ میں حسب معمول اپنے محسن علی عادل شاہ کی تعریف کی ہے۔

(۳) گلدستۂ عشق مصنّفہ ۱۶۵۰ء لغایت ۱۶۷۰ء بقول سید شمس اللہ صاحب قادری یہ تیسری مثنوی ہے مگر بقول ڈیٹاسی یہ عاشقانہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ نصرتی کا ایک قصائد کا مجموعہ اور ایک غزلیات کا دیوان ہے۔ مؤلف گل رعنا نے نصرتی کا معراج نامہ بھی دیکھا ہے۔ یہ بزمانۂ محمد عادل شاہ لکھا گیا تھا ایک سو اکتیس شعر اس میں ہیں۔ بحر ایسی ہے جو فارسی اور ہندی میں مشترک ہے ابراہیم زبیری نے نصرتی کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے اور اُن کی مضمون آفرینی زور طبع اور اوج تخیل کو خاقانی کے ہم پایہ قرار پایا ہے۔ سر چارلس لائل کا خیال ہے کہ یہ برہمن تھے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

ہاشمی سید میران نام اور بیجاپوران کا وطن تھا۔ ہاشمی تخلص تھا سید شاہ ہاشم علوی کے مرید تھے اور اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے۔ ہاشمی مادر زاد اندھے تھے مگر نہایت طباع اور ذہین آدمی تھے۔ ہندی اشعار مزے کے کہتے تھے۔ اپنے مرشد کی فرمائش سے یوسف زلیخا نام ایک مثنوی دکنی میں لکھی اور یہ ۱۰۹۹ھ میں تمام ہوئی

اس میں چھ ہزار سے زیادہ ابیات ہیں اور دکنی لٹریچر میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے شمس اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ "ہاشمی نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا جس میں قصائد و غزلیات کے علاوہ مرثیے اور قطعات اور رباعیات بھی تھے۔ یہ مجموعہ اس وقت نایاب ہے لیکن جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں جس قدر غزلیات ہیں ان کا بیشتر حصہ ریختہ کے بجائے ریختی میں ہے" قدیم بھاشا کا رنگ ان کے کلام میں بہت ہے اکثر جگہ صنعت ایہام سے کام لیتے ہیں اور ہندی شاعری کی متابعت میں عورت کا عشق مرد کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ ہاشمی نے بقول قادری ۱۱۰۹ھ میں انتقال کیا۔

دولت | یہ بھی ایک دکنی شاعر ہیں۔ اُنھوں نے ۱۶۴۰ء میں ایک قصہ موسوم بہ شاہ بہرام و بانوے حسن تصنیف کیا۔ جس میں بہرام گور اور ایک پری موسوم بہ بانوے حسن کے عشق کا ذکر ہے اور شہر دیو سپید میں بہرام گور کو جو عجیب واقعات پیش آئے تھے اُن کا بھی ذکر ہے۔

شاہ ملک | اُن کا ذکر اُردوے قدیم میں ہے۔ شاہ ملک بیجاپور کے باشندے اور علی عادل شاہ کے معاصر تھے اُنھوں نے رسالہ احکام الصلوٰۃ کے نام سے نظم دکنی میں لکھا ہے اور اس میں نماز کے فرائض و احکام بیان کیے ہیں یہ رسالہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے اور ۱۰۸۱ھ میں تمام ہوا۔

شاہ امین | شیخ امین الدین اعلیٰ کا تخلص ہے۔ آپ بیجاپور کے اولیائے کبار سے ہیں اور علی عادل شاہ کے زمانہ میں تھے ۱۰۸۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا آپ پر شب و روز محویت و استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی اور اسی حالت میں آپ نظم ارشاد فرماتے تھے۔ مریدوں نے ان کے عرفان حقائق کو جمع کیا اور اس مجموعہ کا نام جواہر الاسرار رکھا۔ دو رسالے ان سے اور یادگار ہیں۔ رسالہ قربیہ۔ رسالہ وجودیہ۔

دکن میں مرثیہ کی ابتدا | مرثیہ نویسوں میں سب سے پہلے شیخ شجاع الدین نوری

بیجاپوری تھے۔ یہ اکبری دور کے شاعر تھے۔ آگرہ گئے اور ایک زمانہ تک ابوالفضل و فیضی کا ساتھ رہا۔ ان کے اور بھی مشہور مرثیہ گو گذرے جن کا ذکر ایک دوسرے باب میں ہوگا یہاں صرف اُن کے نام لکھے جاتے ہیں۔ ہاشم علی برہان پوری قطب شاہی دور کے کاظم علی۔ رام راو و سیوا سیوا نے روضۃ الشہداء و قانون اسلام لکھیں۔

شعرائے دکن مغلوں کے عہد حکومت میں بیجاپور و گولکنڈہ کو مغل بادشاہوں نے فتح کر لیا اور ان سلطنتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن شعرائے اُردو کی قدر و مراعات میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ زبان اُردو کے عام ہونے کی وجہ سے تمام ملک میں اُردو شعر و شاعری پھیل گئی۔ اس زمانہ کے مشہور اُردو شعرا ذیل میں درج ہیں۔

عاجز محمد علی تخلص عاجز۔ اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے زمانہ میں موجود تھے ان کی تصنیفات سے قصہ فیروز شاہ ہے جو اُردو میں محبوب القلوب کا ترجمہ ہے دوسری تصنیف قصہ لال و گوہر ہے اس میں لال، زمرد بادشاہ بنگال کے فرزند اور گوہر جواہر شاہ بنگال کی دختر کے عشق و محبت کا افسانہ مذکور ہے۔ قصہ ملکہ مصر بھی عاجز نے فارسی سے دکھنی میں نظم کیا۔ عاجز کا ذکر شرح طور پر اُردوے قدیم و تاریخ شعرائے دکن میں درج ہے۔

بحری قاضی محمود متخلص بہ بحری ولد بحرالدین دکن کے ایک صوفی مشرب بزرگ تھے ۱۰۹۵ھ کے قریب اپنے وطن سے بیجاپور چلے گئے اور وہاں سکندر عادل شاہ کے دربار میں دو سال رہے اور جب ۱۰۹۷ھ میں سلطنت تباہ ہوگئی تو حیدرآباد چلے آئے فارسی اور دکنی زبانوں میں مثنویات۔ غزلیات۔ رباعیات اور قصائد لکھے جن کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی مگر یہ سب ذخیرہ راستے میں تلف ہوگیا۔ آپ کی تصنیف "من لگن" تصوف میں ایک مثنوی ہے اور یہ زبان دکنی ۱۱۱۲ھ ہجری میں تکمیل ہوئی زبان اُس کی مشکل اور الفاظ سخت ہیں۔

امین شیخ محمد امین متخلص بہ امین عہد اورنگ زیب میں گزرے۔ اُنھوں نے یوسف زلیخا

کے فسانہ کو دکنی میں ۱۱۰۹ھ میں منظور کیا۔

ولی دکھنی سید محمد فیاضی نام۔ ملا محمد باقر آگاہ نے مراۃ الجنان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ویلوران کا وطن تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ دکن میں سات گڑ ایک تاریخی مقام ہے وہاں حراست خاں نام ایک امیر رہتا تھا۔ ولی عرصہ تک اُس کی رفاقت میں رہے پھر وہاں سے نکل کر کڑپہ میں چلے آئے۔ یہ واقعات ولی نے "رتن پدم کے دیباچے میں بیان کیے ہیں اس کو ولی نے سدھوٹ میں لکھا تھا۔ یہ مثنوی ضخیم ہے دوسری تصنیف "روضۃ الشہدا" ہے اس میں کربلا کے واقعات منظوم کیے ہیں اور یہ ۱۱۱۵ء میں لکھی گئی تھی۔ ان کے علاوہ ایک مناجات بھی لکھی ہے۔

وجدی بقول نصیر الدین ہاشمی مؤلف اُردوے دکن "اس تخلص کے دکن میں دو شاعر ہوے ہیں ایک وجدی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تھا جس نے تحفہ عاشقاں ۱۰۱۱ھ میں لکھی اور دوسرے وجدی جنھوں نے بارھویں صدی کئی ایک مثنویاں لکھیں اُس میں سے ایک پنچھی نامہ ہے جو شیخ فرید الدین عطار کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے جس کو وجدی نے ۱۱۵۵ھ میں ترتیب دیا"۔ بقول مؤلف اُردوے قدیم مثنوی تحفۂ عاشقاں شیخ فرید الدین عطار کی مثنوی گل و ہرمز کا ترجمہ ہے جو خسرو نامہ یا خسرو گل بھی کہلاتی ہے یہ مثنوی ۱۱۵۲ھ میں ختم ہوئی اور خاتمہ میں اسکی تعریف اس طرح مذکور ہے۔

دسے اسکی تاریخ مجھکوں عیاں		پچھا نوا ہے ۱۱۵۲ تحفۂ عاشقاں	

غالبًا مؤلف اُردوے قدیم کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے ان سے ایک اور ضخیم مثنوی یادگار ہے۔ اُس کا نام مثنوی باغ جانفزا ہے۔ ۱۱۴۵ھ میں تصنیف ہوئی اور باغ جانفزا" سے اس کی تاریخ نکالی ہے۔[۵]

[۵] ماخوذ از اُردوے قدیم ۱۲۔

آزاد | فقیر اللہ متخلص بہ آزاد حیدر آباد کے باشندے اور ولی اورنگ آبادی کے معاصر تھے۔ اِن کا ذکر تذکرہ شعرا میر حسن و نکات الشعرا میں درج ہے۔

شعرائے اورنگ آباد | اورنگ زیب جب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اُس نے کھر کی کو اپنا صدر مقام قرار دیا اور اُس کا نام اورنگ آباد رکھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب کی عمر کا بیشتر حصہ اسی شہر میں بسر ہوا اور ایک عرصہ تک یہ شہر سلطنت مغلیہ کا مرکز رہا۔ اس تقریب سے ہندوستان اور دہلی کے بڑے بڑے امرا و علما و مشائخین جن کو شاہی دربار سے کسی قسم کا بھی واسطہ تھا اورنگ آباد چلے آئے اور حیدر آباد و بیجاپور کی تباہی کے بعد یہاں کے باشندے بھی اورنگ آباد کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس دور میں بہت سے شاعر گزرے جن کے حالات سید عبدالولی عزلت کی بیاض، لچھمی نرائن شفیق کے چمنستان شعرا۔ میر بہاء الدین عروج کے بہار و خزاں۔ اور محمد افضل کے تحفۃ الشعراء تذکرۂ موسوی خاں میں تحریر ہیں میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

ولی ۱۶۶۸ عیسوی لغایت ۱۷۴۴ء | ولی کو اُردو شاعری کے ساتھ وہی نسبت ہے جو چاسر کو انگریزی کے ساتھ اور رودکی کو فارسی شاعری کے ساتھ ہے۔ یہی وہ بزرگ ہستی ہیں جن سے موجودہ اُردو شاعری کی بنیاد پڑی۔ آزاد مرحوم کے دعوے کے مطابق اب تک سب کا یہی خیال تھا کہ سب سے پہلے اُردو میں دیوان جمع کرنے والے ولی ہیں۔ مگر جب سے کہ قطب شاہیوں کے دواوین دستیاب ہو گئے اس وقت سے اس خیال کی تردید ہو گئی مگر اس واقعہ سے ولی کے کمال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اُردو شاعری کو ان کی وجہ سے جو تقویت پہونچی وہ کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔ ان کو ان کے معاصرین اور مابعد کے قریب العہد شعراء مثلاً شاہ حاتم وغیرہ سب نے اُستاد مانا ہے اور ان کے کلام کی بڑی قدر کی ہے۔

نام کے متعلق اختلاف | ولی کے نام میں اختلاف ہے۔ بعضوں کے نزدیک ان کا نام

شمس الدین اور تخلص ولی ہے اور بعض محمد ولی نام شمس الدین لقب اور ولی تخلص بتاتے ہیں. میر حسن دہلوی. مرزا علی لطف و نساخ و بلوم ہارٹ کے نزدیک شاہ ولی اللہ نام ہے - اور نواب علی ابراہیم یوسف علی و آزاد شمس ولی اللہ کہتے ہیں - ہمارے نزدیک اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسی عہد میں شمس ولی اللہ نام ایک صوفی احمد آباد میں رہتے تھے - جن کے توافق نام کی وجہ سے یہ خلط ملط واقع ہو گیا -

مقام پیدائش اور خاندان کے متعلق اختلاف | گارسن ڈیتاسی - بلوم ہارٹ - اور میر حسن کا یہ خیال ہے کہ ولی احمد آباد میں پیدا ہوئے مگر یہ صحیح نہیں ہے اُن کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں ہوئی جس کی تصدیق میر تقی میر کے تذکرۂ نکات الشعرا سے بھی ہوتی ہے ولی کا تعلق خاندانی شاہ وجیہ الدین علوی کے ساتھ صحیح نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہ اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ میں سے تھے. البتہ وہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان میں بیعت رکھتے تھے. کیونکہ جو قصائد اور ترجیع بند وغیرہ انھوں نے ان بزرگ کی شان میں لکھے ہیں اُن سے اُن کے حسنِ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے مگر شجرۂ اولاد شاہ وجیہ الدین علوی میں اُن کا نام کہیں نہیں پایا جاتا. اُن کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ گجراتی نہ تھے بلکہ دکنی تھے اور دکنی الفاظ بھی بہ کثرت استعمال کیے ہیں، جو لوگ اُن کے گجراتی ہونے کے مدعی ہیں وہ اپنے دعوے کی تائید میں ان کا ایک قصیدہ پیش کرتے ہیں جس میں اُنھوں نے گجرات سے مفارقت پر اظہار ملال کیا ہے. مگر ہماری رائے میں یہ کافی ثبوت اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ گجرات ان کا مولد و مسکن تھا. اسی طرح اس مثنوی سے بھی جو شہرت کی تعریف میں لکھی ہے اُن کا گجراتی الاصل ہونا پایا نہیں جاتا -

حالات زندگی | اورنگ آباد میں پیدا ہوئے جہاں بیس برس تک تحصیل علوم کرتے رہے بعد ازاں احمد آباد گئے جو اُس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز تھا - اور شاہ وجیہ الدین

علوی کے مدرسہ میں جہاں لوگ مختلف مقامات دور و دراز سے تحصیل علوم کے لیے آتے تھے داخل ہوئے اور تھوڑے عرصہ کے بعد اس خاندان کے مُرید ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد اپنے وطن آکر شعر و شاعری شروع کی اور اُس میں انھیں پورا انہماک ہو گیا۔ ان کا کلام تقریباً سب اصناف سخن میں موجود ہے۔ یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، مستزاد، رباعیات، ترجیع بند وغیرہ۔ پھر احمد آباد گئے۔ جہاں اُنھوں نے اپنے احباب کو اپنا کلام سنایا اور اُنھوں نے اُس کو بہت پسند کیا۔

ولی کے دو سفر

تذکروں میں ہے کہ ولی دو مرتبہ دلی آئے ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد یعنی سنہ ۱۷۰۰ء میں۔ اس مرتبہ شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی جنھوں نے فرمایا کہ "یہ سب مضامین جو بیکار فارسی میں بھرے پڑے ہیں ان کو زبان ریختہ میں کام میں لاؤ تم سے کون محاسبہ کرے گا" اس واقعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ولی میاں گلشن کے شاگرد ہوئے تھے۔ اُن سے عقیدت رکھتے تھے اور مذاق تصوف بھی انھیں کی صحبت میں حاصل کیا تھا۔ دوسری مرتبہ سید ابو المعالی کے ساتھ سفر کیا جس میں دلی اور سرہند کے مزارات کی زیارت کی۔ سید ابو المعالی سے ان کو کمال محبت تھی جو درجۂ عشق کو پہونچ گئی تھی۔ ولی کا یہ دوسرا سفر محمد شاہ کے عہد سلطنت میں سنہ ۱۱۳۴ھ مطابق سنہ ۱۷۲۲ء میں ہوا اس سفر میں ولی اپنے ساتھ اپنا دیوان ریختہ لائے تھے جس کی نہایت قدردانی کی گئی اور جو بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہوا۔ اور یہاں تک اس کی شہرت ہوئی کہ امرا کی محفلوں اور جلسوں اور کوچہ و بازار میں اُس کے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے اُن کے اشعار کو سُن کر لوگوں کو شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔

دہ مجلس

سنہ ۱۱۴۱ھ میں دلی سے اورنگ آباد واپس آئے جہاں شہدائے کربلا کی شان میں ایک مثنوی موسوم بہ دہ مجلس تصنیف کی جس کے ان دو آخری شعروں سے اُس کا سنہ تصنیف اور اُس کی زبان کا حال معلوم ہو جاتا ہے:-

تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال	ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال
ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول	کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول

اس مثنوی کو فضلی نے نثر کے قالب میں ڈھالا۔ جو اصل کتاب سے بھی زیادہ مقبول ہے۔ صاحب گلشن ہند لکھتے ہیں کہ ولی کا ایک ہندی دیوان بھی ہے مولانا آزاد اور مصنف گل رعنا کا بیان ہے کہ ولی نے دیوان کے علاوہ تصوف میں بھی ایک رسالہ نور المعرفت لکھا ہے لیکن وہ ناپید ہو گیا ہے۔

وفات ولی کو گجرات سے ایسی دلچسپی ہو گئی تھی کہ اورنگ آباد میں کچھ دنوں رہ کر پھر احمد آباد چلے گئے جہاں بقول تذکرۂ شعرائے دکن ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

ولی کے بہت سے دوست تھے جن سے ان کو خاص محبت اور خلوص تھا۔ مثلاً لالہ کھیم داس اورنگ آبادی۔ امرت لال۔ گوہر لال۔ اور محمد یار خاں دہلوی وغیرہ ان سب کا ذکر مناسب مقام پر ان کے اشعار میں موجود ہے۔ وہ گو کہ حنفی المذہب تھے جیسا کہ صحابۂ کبار کی تعریف سے ظاہر ہے جو اُن کے اشعار میں موجود ہے۔ مگر ساتھ ہی کسی مذہب و ملت سے اُن کو کوئی تعصب نہ تھا کیونکہ وہ ایک صوفی منش فقیر مشرب شخص تھے۔ انھوں نے بہت سیر و سیاحت کی تھی اور اکثر مقامات دُور و دراز کو دیکھا تھا۔ بنگال میں اُن کا جانا پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتا۔ مگر گارسن ڈیٹاسی اُن کے کسی شعر سے جس میں حسن بنگالہ کی تعریف ہے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بنگال بھی گئے تھے البتہ ستارا۔ دلی اور سورت کا سفر یقینی ہے اس وجہ سے کہ ان تمام مقامات کی تعریف اُن کے اشعار میں موجود ہے۔ مثلاً سورت کی تعریف میں ایک مثنوی میں کہتے ہیں:۔

بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر	عجب شہروں میں ہے پر نور اک شہر

کہ ہے مشہور اس کا نام سورت	کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت	ہر اک صورت ہے واں انمول صورت

ولی نے کسی امیر یا بادشاہ کی تعریف میں اشعار نہیں کہے مگر فارسی کے تتبع میں اپنی شان میں اکثر فخریہ اشعار کہے ہیں جن میں جابجا معاصرین پر چوٹیں ہیں۔

کلام پر رائے اُن کی تصانیف بہ اعتبار قدامت اور نیز بہ اعتبار زبان بہت دلچسپ ہیں عبارت آسان اور سہل ہے۔ شعرائے مابعد نے ان کا تتبع کیا ہے اور انھیں کی شاعری سے شمالی ہند میں شعر کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ سادگی سلامت اور ترنم انکے کلام کے جوہر ہیں۔ اشعار میں روانی، بے تکلفی اور آمد ہے اور صنائع بدائع بکثرت نہیں ہیں۔ بعض شعر تو ایسے صاف ہیں کہ بالکل زمانۂ حال کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً:۔

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے	زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے
دشمن دین کا دین دشمن ہے	راہزن کا چراغ رہزن ہے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کو	کرتی ہے نگہ جس قدر نازک یہ گرانی
عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں دلبر سے	سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ
گناہوں کی سیاہی سے کیا غم اُس پریشاں کو	جسے وہ زلف دستاویز ہو روز قیامت میں

خوب رو خوب کام کرتے ہیں	اک نگہ میں غلام کرتے ہیں
دل ہوا ہے مرا خراب سخن	دیکھ کر حسن بے حجاب سخن
بزم معنی میں سرخوشی ہے اُسے	جس کو ہے نشۂ شراب سخن
راہ مضمون تازہ بند نہیں	تا قیامت کھلا ہے باب سخن
گوہر اُس کی نظر میں جا نہ کرے	جس نے دیکھا ہے آب و تاب سخن
ہے سخن جگ منے عدیم المثل	جز سخن نہیں دوجا جواب سخن

دل ہوا ہے مرا کباب سخن مجھکو دیتے ہیں سب حساب سخن	شعر فہموں کی دیکھ کر گرمی عرفی و انوری و خاقانی

اے ولی درد سر کبھو نہ رہے جب ملے صندل و گلاب سخن

داؤد مرزا داؤد نام داؤد تخلص وطن اورنگ آباد ولی کے معاصر تھے اور ۱۱۶۸ھ میں انتقال کیا۔ ایک چھوٹا سا دیوان اِن سے یادگار ہے۔

سراج سید سراج الدین نام آپ سادات حسینی خاندان مشائخ سے تھے۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور وہیں تربیت و تعلیم پائی۔ غالباً آپ ۱۱۲۷ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنا حال منتخب دوادین کے دیباچے میں لکھا ہے۔ اس منتخب کا تاریخی نام "منتخب دیوانہا" ۱۱۶۹ھ ہجری ہے۔ سراج نے اس میں متقدمین و معاصرین شعرا کے فارسی کلام کا انتخاب کیا ہے۔ مجموعہ ضخیم ہے اور اُس میں کئی ہزار اشعار ہیں۔ دوادین فارسی کا اس طور پر انتخاب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نقادِ سخن تھے۔ سراج خود لکھتے ہیں "یہ فقیر بارہ برس کی عمر میں جوشِ جذبہ و غلبۂ شوق سے سات برس تک برہنہ تن و برہنہ سر رہا۔ اکثر اوقات عالم بیخودی میں حضرت شاہ برہان الدین غریب دولت آبادی کے روضہ کے اطراف میں گھومتا تھا۔ اسی حالت مستی میں اکثر اشعار فارسی زبان سے برآمد ہوتے۔ مگر تحریر کے دائرہ میں نہیں آئے اور اگر وہ تمام اشعار موجود ہوتے تو ایک ضخیم و بزرگ دیوان مرتب ہو جاتا۔ پھر مدت مذکورہ کے بعد حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمن چشتی المتوفی ۱۱۶۱ھ کی خدمت میں پہونچا۔ حسن ارادت سے مرید ہوا۔ ان دنوں میں بپاس خاطر عزیزی عبدالرسول خاں جو فقیر کے برادر طریقت تھے اکثر اشعار ریختہ زبان میں لکھے گئے خاں صاحب نے جواہر متفرق کو جو تخمیناً پانچ ہزار اشعار تھے

[1] ماخوذ از اُردوے قدیم ۱۲۔

حروف تہجی میں ترتیب دیا اور کامل دیوان شائقین کی خدمت میں بھیجا۔ پھر فقیری اختیار کی اور مرشد کے حکم سے شعر گوئی ترک کی ''سراج ایک درویش منش پاکباز بزرگ تھے۔ مسافر دوست و غریب نواز۔ گوشہ نشین و پاکیزہ دل ہفتہ میں ایک روز محفل سماع منعقد فرماتے تھے اُس میں شہر کے اکثر عمائد و مشائخ جمع ہوتے تھے قوال و گویے آپ کی غزلیں سناتے تھے۔ مجلس میں آپ کا وہ رعب و داب تھا کہ اہل مجلس باادب عالم سکوت میں ہوتے تھے۔ اس وقت دکن میں آپ کے معاصرین میں سے میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ عبدالوہاب افتخار دولت آبادی ظفر بیگ ظفر اورنگ آبادی۔ محمد فقیہ دردمند۔ مرزا محمد باقر شہید۔ وجان مرزا رسا۔ موسوی خاں جرأت اورنگ آبادی و عبدالقادر سامی اورنگ آبادی عارف الدین خاں عاجز۔ موسوی خاں فطرت۔ خافی خاں۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اور میر اولاد محمد ذکا بلگرامی وغیرہ شعرا و علما و مشائخ تھے خوب مشاعرے ہوتے تھے اور سراج باوجود گوشہ نشینی مشاعروں میں شریک ہوتے اور کبھی کبھی اصرار سے شعر کہتے۔

میر نے نکات الشعرا میں اور حسن نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ سراج کو سید حمزہ دکنی سے تلمذ حاصل تھا۔ مگر دکن میں کسی شاعر کا نام سید حمزہ یا سید حمزہ علی نہیں تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ سراج نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ سراج نے ایک دیوان فارسی کا اور ایک ریختہ کا جس میں پانچ ہزار اشعار ہیں اپنی یادگار چھوڑے منتخب دیوانہا کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ایک مثنوی بوستان خیال بھی لکھی جس میں ایک ہزار سات ابیات ہیں۔ اور گل و بلبل کے افسانے میں جذبات معرفت کی ترجمانی کی ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۷۲ھ میں تمام ہوئی۔

آپ کا کلام بھی ولی کی طرح ایہام و ذومعانی الفاظ سے پاک و صاف ہے۔ سیدھا سادہ بیان ہے۔ تکلف و بناوٹ کا نشان نہیں۔ اکثر غزلوں میں حسن و عشق کے کرشمے بعض اشعار میں توحید و معرفت کا نقشہ۔ مضامین میں شگفتگی خیالات میں بلندی اور پھر کلام

یں صفائی اور سادگی موجود ہے۔ ریختہ گوئی میں ولی کے قائم مقام تھے۔ دکن میں اُستادی کے رتبہ کو پہونچے۔ ولی نے اس زمین میں جو کچھ پودے جمائے تھے اور جو کچھ سبزے لگائے تھے سراج نے اُن کو اپنی توجہ کے پانی سے سیراب شاداب کیا آپ نے چوتھی شوال یوم جمعہ ۱۱۷۷ھ میں انتقال کیا۔ یہ غزل سراج کی بہت مشہور ہے۔

خبرِ تحیرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے ایک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زبان سیں بیاں کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بینوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

دیگر شعرا اس دور کے

اس دور میں بہت سے شاعر گذرے ہیں۔ جن کا ذکر بوجہ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اِن کے نام و حالات تذکرہ لچھمی نرائن، تذکرہ موسوی خاں و نکات الشعرا میر، تذکرہ شعرائے اُردو میر حسن۔ تذکرہ شعرائے دکن مؤلفہ عبد الجبار خاں

ملکاپوری: "دکن میں اردو" مولفۂ نصیر الدین ہاشمی سے معلوم ہو سکتے ہیں بعض مشہور شعرا اس زمانہ کے حسب ذیل ہیں:۔ عارف الدین عاجز۔ سید عبدالولی عزلت بار۔ محرم۔ ایما۔ داغ۔ رنگین۔ مہدی۔ عزیز۔ صارم۔ مہر۔ پناہ۔ رضا۔ عراقی۔ مہتاب شرافت۔ شہید۔ ضیا۔ کاظم۔ مبتلا۔ نجم۔ ہمدم۔ درد۔ حشمت۔ حاجی۔ قادر۔ فخر۔ فتوت قدر۔ ان میں عزلت اور عاجز زیادہ مشہور و نام آور ہیں اور جو حالات کہ مصنف گل رعنا نے ان شعرا کے درج کئے ہیں وہ زیادہ تر تذکرۂ شعرائے دکن سے ماخوذ ہیں۔

احاطۂ مدراس و آرکٹ کے شعرا

مولوی محمد باقر متخلص بہ آگاہ ویلور میں پیدا ہوئے اور انھوں نے اردو زبان میں سیر۔ عقاید۔ فقہ کی متعدد کتابیں لکھیں ۱۱۸۵ھ سے انھوں نے تصنیف کا کام شروع کیا۔ ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے بزرگان سلف وطناً بیجاپوری تھے مؤلف شمع انجمن لکھتے ہیں کہ "در خیابان کرناٹک ہیچ او نہالے سر بالا نکردہ واز گل زمین مدراس مثل او گل خوش رنگ نہ دمیدہ" اردو تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔ ہشت بہشت۔ تحفۃ الاحباب۔ تحفۃ النساء۔ فرائد در عقائد ریاض الجنان محبوب القلوب۔ روضۃ السلام۔ گلزار عشق۔ قصہ رضوان شاہ۔ روح افزا۔ خمسہ متحیرہ۔ مثنوی روپ سنگار۔ ارکاٹ کے دربار کے مدار المہام شرف الملک مولانا محمد غوث اور ان کے خلف مولانا قاضی بدر الدولہ نے بھی کئی کتابیں اردو میں لکھیں اس وقت کے شعرا کے نام ذیل میں رقم ہیں:۔ محمود۔ صبائی۔ احمد۔ اعظم[1]۔

---

[1] ماخوذ از اردوئے قدیم ۱۲۔
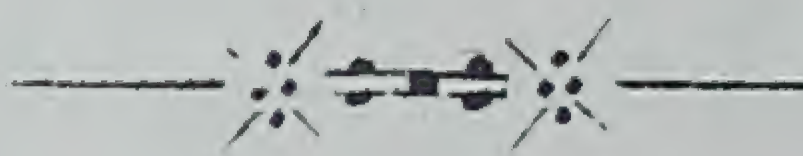
باب ۵

اساتذۂ دہلی

حصۂ اوّل۔ طبقۂ متقدمین

حاتم و آبرو کا زمانہ

دلّی میں اُردو زبان کی ابتداء ترقی

اُردو زبان دکن میں نویں صدی سے پہلے ادبی صورت حال کر چکی تھی اور اُس میں اُس زمانہ سے تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا تھا۔ برخلاف اس کے جہاں تک معلوم ہوا ہندوستان میں بارھویں صدی کے آغاز تک یہ زبان محض بات چیت اور لین دین تک محدود رہی۔ مولا جمالی جو شہنشاہ بابر کے معاصر تھے اور سنہ ۹۴۲ ہجری میں فوت ہوئے۔ ملا نوری جو اعظم پور کے باشندے تھے اور اکبر کے زمانہ میں گذرے ملا فیضی سے نہایت اتحاد رکھتے تھے اُن کا ذکر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے اور شیخ سعدی نے اگرچہ ایسے اشعار کہے ہیں جو آدھے فارسی اور آدھے اُردو ہیں لیکن یہ باقاعدہ اور علمی شاعری نہ تھی۔ بابر۔ اکبر و جہانگیر۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کی اور اُن کے عہد کی تحریرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی زبان پر عربی و فارسی کے الفاظ چڑھ رہے تھے اور اسی طرح مسلمانوں کی زبانیں بھی ملکی زبانوں کے زیر اثر تھیں اس کے نمونے اُردوئے قدیم اور تذکرہ گلِ رعنا میں موجود ہیں۔ شاہجہاں کا اُردو میں شقہ لکھنا اور اورنگ زیب کا اپنے رقعات میں اُردو الفاظ استعمال کرنا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اُردو زبان اس زمانہ میں ملک کی عام زبان ہو گئی تھی۔ بازار سے

شاہی محلات تک خاص و عام اس کو بولتے اور سمجھتے تھے[1]۔

عالمگیر کے زمانہ سے دلی میں اردو شعر گوئی نے رواج پایا اور اس جانب سب سے پہلے فارسی شعرا نے توجہ کی موسوی خاں فطرت۔ مرزا عبد القادر بیدل۔ مرزا عبد الغنی قبول وغیرہ فارسی کے نامور شاعر تھے لیکن تفریح خاطر کے لئے اردو میں بھی دو چار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ محمد شاہ کے عہد سے پہلے لوگ خانہ جنگیوں میں مبتلا اور مرہٹوں کے حملوں سے پریشان تھے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں سادات کی قوت ٹوٹ جانے پر کچھ عافیت نصیب ہوئی اس وقت اِدھر اُدھر سے سمٹ کر دلی میں سب لوگ مجتمع ہو گئے۔ محمد شاہ کی رنگیلی طبیعت نے رنگ دکھایا۔ قزلباش خاں اُمید۔ سلیمان قلی خاں وداد۔ علی قلی خاں ندیم۔ شیخ سعد اللہ گلشن۔ مرتضیٰ قلی خاں فراق۔ میر شمس الدین فقیر۔ مرزا عبد القادر بیدل۔ سراج الدین علی خاں آرزو ایسے بڑے بڑے صاحب فضل و کمال دلی میں جمع تھے۔ شمس ولی اللہ دکن سے آ گئے۔ فراقی۔ فخری۔ آرزو وغیرہ بھی دکن سے آئے ولی کچھ دنوں کو رہ گئے اور ان کا رنگ دلی میں خوب چمکا ہر طرف سے قدردانی کی گئی۔ جو شعرا صرف فارسی میں اظہار کمال کرتے تھے ان کو اردو میں بھی شعر کہنے کا شوق ہوا۔ اُمید۔ بیدل۔ فراق۔ آرزو نے اردو میں طبع آزمائی کی اور یہ زبان دلی سے اردوے معلیٰ کا خطاب پا کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی[2]۔

اردو لغات کی ترتیب قریب قریب عالمگیر کے زمانہ میں اہل ہندوستان کو اردو لغات کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ ملا عبد الواسع ہانسوی نے (جن کی قواعد فارسی اور گلستان بوستاں کی شرحیں نہایت مشہور ہیں) عالمگیر کے زمانہ میں اردو ہندی الفاظ کا ایک لغت مدون کیا اور اس کا نام "غرائب اللغات" رکھا اردو الفاظ کے معنے فارسی میں لکھے۔ ایک عرصہ کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو نے اس کی نظر ثانی

---

[1] اردوے قدیم ۱۲۔ [2] گل رعنا ۱۲۔

کی۔ بہت سے الفاظ اور معنی اضافہ کئے۔ غلطیاں درست کیں اور اُسے "نوادر الالفاظ" کے نام سے موسوم کیا۔

دلّی کے پرانے شاعر | جو شاہراہ ولی نے دکھلائی تھی اس کے پیرو دہلی میں بہت پیدا ہوگئے۔ آبرو۔ حاتم۔ ناجی مضمون۔ مرزا مظہر جان جاناں کو جو ولی کے ہمعصر تھے اور فارسی میں خوب کہتے تھے۔ ریختہ کا آبائے قدیم سمجھنا چاہیئے یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کی آغوش تربیت میں نونہال اُردو نے پرورش پائی اس مبارک عہد میں زبان نے بہت کچھ پختگی حاصل کی۔ شاعری کے واسطے کوئی خاص طرز ابتک مقرر نہیں ہوا تھا اور نہ اغراض شاعری کے واسطے کوئی خاص مناسبت زبان میں پیدا ہوئی تھی۔ بہت سے سخت اور بھدّے دکنی الفاظ و محاورات جو دیوان ولی کی بدولت زبان

زبان کے ساتھ ان کی خدمات | میں داخل ہوگئے تھے چھانٹنا اور نکالنا پڑے۔ اسی وجہ سے ان حضرات کی خدمات تصفیۂ زبان کے متعلق بہت لائق تحسین ہیں۔ انھوں نے یہ مشکل کام بہت حسن و خوبی اور بڑی محنت و جانفشانی سے انجام دیا اسی لیے ان کی قابلیت اور خوش مذاقی کی داد دینا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ بھاشا الفاظ کی خوبصورتی انکی نظر میں نہ جچی ورنہ اپنے ملک کے دیسی الفاظ کے بدلے غیر ملکی الفاظ کم لیے جاتے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے اس کاٹ چھانٹ اور متروکات کے خارج کرنے میں بڑی قابلیت اور وقت نظر سے کام لیا۔ اور بھدّے ناتراشیدہ محاورات اور تراکیب کی جگہ خوشنما محاورے اور دلکش ترکیبیں داخل کیں جو کہ عموماً فارسی سے لی گئیں کیونکہ اُسی کے وہ مشاق تھے۔ زبان میں چونکہ لوچ اور قوت جذب پہلے ہی سے موجود تھی اسیلیے یہ سب جدید تصرفات اُس نے آسانی سے قبول کرلیئے۔

صنعت ایہام | ولی کے معاصرین صنعت ایہام کے بہت شائق تھے جس کا ذکر

لہ اُردوے قدیم ۱۲۔

پیشتر کیا گیا یہ صنعت بھاشا کی شاعری میں بہت مقبول ہوئی اور دوہروں کی جان ہے قدما کے کلام میں ایسے ذومعنی اشعار بہ کثرت ہوتے ہیں۔ یہ محمد شاہی دور کی خصوصیت ہے۔ شاہ مبارک آبرو یک رنگ۔ شاکر ناجی و شاہ حاتم وغیرہ نے اس رنگ کو خوب برتا اور اُس کو اپنا مستقل فن بنالیا تھا۔ مگر شاہ عالم کے زمانہ میں اس میں ترمیم و اصلاح ہوئی اور مظہر۔ سودا۔ میر۔ قائم نے اس کا رواج بہت کم کردیا اور میر درد۔ فقیر دہلوی اور میر حسن کے عہد میں یہ رنگ قریب قریب خارج ہوگیا میر فرماتے ہیں ؎

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

سودا فرماتے ہیں ؎

یکرنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھکو دورنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

قائم چاندپوری ؎

ہو روم روم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بت چین
یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سر شام
بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ
تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

تصوف ایک دوسری خصوصیت اس زمانے کی یہ تھی کہ شاعری پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ یہ رنگ اُس زمانے میں عالمگیر تھا۔ وجہ یہ تھی کہ شعرا اکثر صوفی مشرب ہوتے۔ یا کم از کم آخر عمر میں ہوجایا کرتے تھے پیری مریدی کا بازار گرم تھا۔ فارسی شاعری متاخرین کے کلام میں تصوف میں ڈوبی ہوئی تھی اور اردو شاعری اُسی کی ناقل تھی۔ دکن میں شاعری کی ابتدا مذہب سے ہوئی اور تصوف شاعری کا جزو اعظم تھا۔ انھیں اسباب سے اردو شاعری پر بھی تصوف کا رنگ اچھا خاصہ چڑھ گیا۔

سپاہی پیشہ شعرا اس زمانہ کے شعرا اکثر سپاہی پیشہ ہوتے اس وجہ سے کہ زمانہ بہت پُرآشوب تھا۔ بیرونی حملوں کی کثرت ملک میں بدامنی سلطنت کی کمزوری ان سب وجوہ سے کسی کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ اور پھر سپہگری کا پیشہ نہایت عزت

اور منفعت کا ہمیشہ خیال کیا جاتا تھا۔

کلام میں یکرنگی کی کمی اور سبک و تبذل الفاظ

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد کے اکثر شعراء کا کلام یکرنگ نہیں مثلاً کسی غزل کو لیجئے تو اس کے بعض شعر تو بہت اچھے ہوں گے۔ مگر بعض شعر نہایت معمولی اور اعلیٰ مذاق سے گرے ہوئے۔ اس زمانہ میں معمولی اور سوقیانہ الفاظ لکھنے میں مطلق عار نہ تھا جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ریختہ اسوقت تک تفنن طبع اور تبدیل ذائقہ کے طور پر لکھی جاتی تھی نہ کہ اس میں مزاولت اور مشق مدنظر تھی اسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو آبرو۔ حاتم۔ ناجی ظہر کے یہاں عمدہ کلام کے ساتھ ساتھ بہت سے اشعار ایسے بھی ملیں گے جو ذوق صحیح اور طبع سلیم پر ناگوار ہیں۔ میر اور سودا نے بھی کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں خاص کر جہاں شیخ اور زاہد وغیرہ کا خاکہ اڑایا گیا ہے جو اب کسی مہذب صحبت میں شاید ہی استعمال کیے جائیں۔

اس عہد کے شعرا کا طرز بیان اور اُن کے کلام کی خامیاں

نظم ابھی پختگی اور کمال کے درجہ پر نہیں پہونچی تھی۔ قواعد عروض کی پابندی بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ قافیہ ایسی ضروری چیز اور ردیف تک کے قواعد پوری طرح برتے نہیں جاتے تھے۔ اشعار کی بندش ڈھیلی۔ زوائد کی کثرت جن سے آج کل ہمارے کانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ البتہ زبان میں سادگی اور شیرینی غضب کی ہے۔

عربی و فارسی الفاظ و خیالات کا داخلہ اور سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج

اس دور میں سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج ہوا۔ جو کہ میر و سودا کے زمانہ میں جاری رہا اور شیخ ناسخ کے عہد تک جس کی تکمیل ہوئی۔ مورخین ان کو مصلحین زبان کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے بھونڈے الفاظ خارج کر دیے گئے مگر اُس کے ساتھ ہی بھاشا کے بہت سے شیریں، خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ بھی نکال دیے گئے۔ عربی و فارسی کے مترادف قبول کیے گئے

اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی الفاظ میں صحت کا خیال ہونے لگا قدیم محاورات والفاظ جو ولی کے زمانے میں مستعمل تھے اُن میں تغیرات پیدا ہونا شروع ہوئے اور جدید محاورے بنانے کی کوشش کی گئی تاریخ شعرائے اُردو میں درج ہے کہ "مگر استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پرواکرنا باریک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے نہ صرف اُسی کے کلام میں بلکہ اُس کے ہم عہدوں کے کلام میں اُس سے زیادہ ہے۔ شاہ حاتم نے اس طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کی جیسا کہ اُن کے "دیوان زادہ" کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے"۔

شاہ مبارک آبرو متوفی ۱۷۵۰ء

شاہ نجم الدین دہلوی عرف شاہ مبارک متخلص بہ آبرو محمد شاہ کے زمانہ میں تھے۔ پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں مشہور صوفی شیخ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے۔ گوالیار میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں دہلی آئے جہاں شعر کہنا سیکھا۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے اور انھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں مگر افسوس کہ دیوان زمانۂ غدر میں تلف ہو گیا اور اب نایاب ہے۔ ایک مثنوی موسوم بہ "آرائش معشوق" بھی لکھی ہے۔ تھوڑے عرصہ تک نارنول میں بھی رہے نہایت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی جس کی وجہ سے مرزا جان جاناں مظہر سے اکثر چشمک چلتی تھی۔ شاہ آبرو ایک شخص بیر نگھن خلف شاہ کمال الدین بخاری سے جو خود بھی شاعر تھے بہت محبت رکھتے تھے جس کا حوالہ اکثر اُن کے شعروں میں ہے۔ اکثر تذکرہ نویس مثلاً میر حسن مصحفی فتح علی اور لطف وغیرہ اُن کے مداح ہیں اور اُن کے کلام کی تعریفوں سے اُن کی آبرو بڑھاتے ہیں۔ شاہ آبرو متقدمین شعرا میں ہیں اور استعارات و ایہام کے بادشاہ ہیں۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی کلام سبک اور مبتذل ہو جاتا ہے۔ گو وسعت معلومات محدود ہے مگر درسیات سے فارغ معلوم ہوتے ہیں ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۵۰ء میں پچاس برس کی عمر سے متجاوز ہو کر وفات پائی

خان آرزو ۱۶۸۹ء
تا ۱۷۵۶ء

سراج الدین علی خاں متخلص بہ آرزو معروف بہ خان آرزو۔ شیخ حسام الدین حسام کے صاحبزادے ہندوستان کے مشہور شعراء اور ناقدانِ فن میں سے تھے۔ میر تقی میر کا قول ہے کہ "ان کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی محقق اور شاعر شیریں زبان نہ تھا"۔ میر حسن ان کو امیر خسرو دہلوی کے بعد سب سے بڑا شاعر ہندوستان کا خیال کرتے ہیں۔ لطف بھی ان پر اپنی مدح سرائی سے لطف کرتے ہیں اور فتح علی ان کو اُن کے نام کی مناسبت سے "چراغ محفلِ فصاحت" کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا آزاد ان کی نسبت لکھتے ہیں کہ ان کو زبان اُردو کے ساتھ وہی مناسبت ہے جو ارسطو کو فلسفہ کے ساتھ ہے۔ میر تقی میر ان کا ذکر نہایت ادب سے کرتے ہیں اور اپنا اور اس زمانہ کے شعراء کا جگت اُستاد مانتے ہیں۔ خان آرزو اُردو اور فارسی دونوں کے استاد تھے۔ گو اُردو کم کہتے تھے مگر اُن کے اُستاذ الاساتذہ ہونے میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے اس وجہ سے کہ میر۔ سودا۔ مظہر۔ درد۔ ایسے قادر الکلام ان کو استاد مانتے تھے۔ آگرہ کے رہنے والے شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولا میں سے تھے شعر کہنا ابتدائے عمر میں شروع کیا۔ اور مختلف علوم و فنون میں بصیرت کاملہ حاصل کی۔ جوانی میں بمقام گوالیار منصب دار مقرر ہوئے۔ مگر فرخ سیر کے عہد میں ۱۱۳۰ھ میں دہلی واپس آئے۔ ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۴ء میں شیخ علی حزیں ایران سے ہندستان آئے جہاں اُن کے کمال کی بے انتہا شہرت ہوئی ہر شخص ایسے صاحب کمال سے ملنے کا مشتاق تھا۔ مگر آرزو کو کمالِ فن اور استغنا اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اتفاقاً کسی موقع پر ان دونوں باکمالوں کا سامنا ہو گیا۔ شیخ کی متکبرانہ باتیں اُن کو بُری معلوم ہوئیں جس سے متاثر ہو کر اُنھوں نے شیخ کے کلام پر اعتراض وارد کرنا شروع کئے اور ان کو ایک رسالہ مسمّٰی بہ تنبیہ الغافلین[1] کی صورت میں شایع کیا۔ نادر شاہ کے حملۂ دہلی اور

[1] اسی نام کا ایک رسالہ سودا کا بھی ہے جس میں فاخر مکین کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔

تباہی شہر کے بعد نواب سالار جنگ کے مشورہ سے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آئے جہاں سنہ ۱۱۶۹ھ
مطابق سنہ ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا۔ مگر لاش کو حسب وصیت نواب موصوف دہلی لے گئے
اور وہیں پیوند زمین کیا۔ خان آرزو بڑے صاحب کمال اور شاعر شیریں مقال تھے۔ انکی
قابلیت طباعی، ذہانت، قوت اختراع، فصاحت و بلاغت سب کو مسلم ہے۔ تصانیف
بکثرت ہیں منجملہ اُن کے کتب ذیل موجود ہیں ایک فارسی دیوان تقریباً تیس ہزار شعر کا
شرح سکندر نامہ و قصائد عرفی۔ و گلستان سعدی لغت فارسی موسوم "بہ سراج اللغات"
لغت اُردو موسوم "بہ غرائب اللغات" جو اصطلاحات صوفیہ کی ایک لغت مسمّٰی بہ
نوادر الالفاظ کی شرح ہے۔

رسائل "موہبت عظمیٰ" اور "عطیۂ کبریٰ" فن بلاغت و معانی و بیان میں۔ تذکرہ
"مجمع النفائس" جس کو تذکرۂ آرزو بھی کہتے ہیں جس میں اُن ہندوستانی اور دکنی شعرا
کا ذکر ہے جنھوں نے بزبان فارسی شعر کہے ہیں۔ اس میں سے میر تقی میر نے اپنے تذکرہ
"نکات الشعراء" میں کچھ نقل کیا ہے۔ تقریباً پندرہ تصانیف خان آرزو کی کہی جاتی ہیں
مشہور استاد تھے۔ اور بعض شاگرد اپنے سے بھی زیادہ نامور چھوڑ گئے۔ زبان اُردو ایسے
محقق کامل اور ناقد فاضل کے احسانات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

شاہ حاتم سنہ ۱۶۹۹ء تا سنہ ۱۷۹۱ عیسوی

شاہ حاتم مشاہیر قدما میں ہیں۔ ان کو دہلی کے رنگ کا موجد
خیال کرنا چاہیے۔ ریختہ بہ طرز ولی و مضمون و ناجی و آبرو لکھتے تھے
ظہور الدین نام۔ حاتم تخلص۔ شیخ فتح الدین کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے
تاریخ ولادت سنہ ۱۱۱۱ھ لفظ ظہور سے نکلتی ہے۔ جو سنہ ۱۶۹۹ء کے مطابق ہے
سپاہی پیشہ تھے۔ تھوڑے عرصے تک نواب امیر خاں صوبۂ الہ آباد کی رفاقت میں رہے
سنہ ۱۷۲۲ء میں جب دیوان ولی دہلی میں آیا اور اُس کے اشعار کو لوگوں نے بہت پسند کیا
تو حاتم نے بھی طبع آزمائی کی اور ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ کمال کو

پہونچ گئے خواجہ میر درد میر تقی میر اور بعد کو مصحفی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے
تھے۔ اپنے زمانہ میں ریختہ کے اُستاد مانے گئے ہیں۔ دو دیوان ان کی طرف منسوب ہیں۔
ایک قدیم رنگ میں جس میں صنعت ایہام بہت ہے اور اکثر کلام فحش ہے۔ دوسرا جدید
رنگ میں۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کے زمانے میں ایک دیوان کلیات
سے منتخب کر کے مرتب کیا۔ اُس کا نام دیوان زادہ رکھا۔ کلیات کی نسبت جو آبرو و
ناجی کے طرز میں لکھا تھا تذکرۂ قدرت میں لکھا ہے کہ "فاما زعم شاعری لبسیار دارد
دیوان قدیم او از نظر این مؤلف گذشتہ بطرز آبرو و ناجی حرف می زند اکثر اشعارش از لطف
خالی یافتم" محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے ایک مثنوی حقہ پر لکھی جو زیادہ دلچسپ نہیں انکے
علاوہ ایک دیوان فارسی بھی ہے۔ نہایت متین و مہذب بزرگ تھے اپنے دیوان کے
دیباچہ میں ۴۵ شاگردوں کے نام دیے ہیں جس میں سب سے پہلے مرزا رفیع سودا کا نام
نامی ہے یہ ایسے شاگرد تھے جن پر اُستاد کو بھی فخر تھا۔ اور مشہور شاگردوں میں۔ رنگین رشاد
تاباں۔ فارغ بھی ہیں شاہ صاحب کے مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی بہت تھی۔
تصفیۂ زبان کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور بہت سے غیر مانوس اور غیر فصیح الفاظ ترک
کر دیے۔ درستی زبان کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ذوق اور آتش و ناسخ کے
زمانہ میں ایک سو برس بعد پورا ہوا اُس کی داغ بیل شاہ حاتم نے ڈال دی تھی۔
افسوس ہے اُن کے معاصرین نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ورنہ اُسی زمانہ میں
بہت کچھ تکمیل ہو جاتی شاہ صاحب اس کے متعلق خود فرماتے ہیں "خوشہ چین خرمن
سخنوران عالم بصورت محتاج و بمعنی حاتم کہ از سنہ ۱۱۲۹ھ تا سنہ ۱۱۶۹ھ کہ چہل سال باشد
عمر درین فن صرف کردہ در شعر فارسی پیرو مرزا صائب و در ریختہ ولی را استاد می داند۔
اول کسے کہ درین فن دیوان ترتیب نمودہ او بود و معاصرین فقیر شاہ مبارک آبرو۔
و شرف الدین مضمون و مرزا جان جاناں مظہر۔ و شیخ احسن اللہ احسن۔ و مرزا شاکر ناجی۔ و

غلام مصطفےٰ یک رنگ ست۔ ولفظ در و بر و از و الفاظ و افعال دیگر کہ در دیوان قدیم خود تقید دارد۔ دریں ولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند و روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ آرند منظور داشتہ زبان ہندی بھاکا را موقوف کردہ محض روزمرّہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمود۔ ... ... مختصر کہ لفظے غیر فصیح انشاء اللہ نخواہد بود" اس کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ درستی اور اصلاح زبان کا خیال سب سے پہلے شاہ حاتم کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ کلام صاف عاشقانہ اور کہیں کہیں عارفانہ ہے۔ شعر آپس کی باتیں۔ زبان سلیس۔ البتہ زبان کی ابتدائی حالت ہونے کی وجہ سے اکثر زائد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دہلی میں ۱۷۹۱ء یا ۱۷۹۲ء میں انتقال کیا[1]۔ مگر مصحفی کا قول ہے کہ ۸۳ برس کی عمر میں ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے۔ میر تقی کو شاہ حاتم کے ساتھ حسن عقیدت نہیں ہے۔ اپنے تذکرہ میں "مرد جاہل و متمکن" ان کی نسبت لکھا ہے۔ مگر میر حسن اُن کو صاحب کمال و پسندیدہ افعال۔ عالی فطرت و بلند ہمت کے معزز القاب سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن کی غزلوں کو نغمہ سرایان ہند محفلوں میں گاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ حاتم کا مرتبہ ادب اردو میں منفرد اور ممتاز ہے وہ سودا اور دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے اُستاد تھے۔ اور اصلاح شعر اور درستی زبان میں اُنھوں نے بہت نمایاں حصّہ لیا۔

میاں مضمون متوفی ۱۷۴۴ء | شیخ شرف الدین متخلص بہ مضمون حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید   کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

[1] مصنف خمخانہ جاوید کی تحقیق کے موافق ۹۶ برس کی عمر میں ۱۲۰۷ہجری میں انتقال کیا ۱۲

خاں موصوف اکبرآباد کے رہنے والے سپاہی پیشہ تھے پھر تلوار کو قلم سے بدل لیا بچپن میں دلی گئے اور زینتہ المساجد میں قیام کیا۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر بڑے ظریف بامذاق اور بذلہ سنج تھے۔ میر اُن کو "ہنگامہ گرم کن مجلسہا" لکھتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے اُستاد فن اور اُسی زمانہ کی روش کے مطابق خوب کہتے تھے۔ ایک دیوان دوسو ابیات کا چھوڑا۔ کلام پاکیزہ اور پرلطف ہے مگر اکثر جگہ فحش اور استعارات وایہام وغیرہ سے جو زمانہ کا رنگ ہے ملوث ہے گو کہ سن میں آرزو سے بڑے تھے۔ مگر شعر میں اُن سے مشورہ کر لیتے تھے۔ میر اُن کو خوش فکر اور تلاش الفاظ تازہ کا بہت مشاق لکھتے ہیں۔ سودا اور میر حسن بھی اُن کے بہت معرف ہیں۔ خان آرزو اُن کو "شاعر بیدانہ" کہتے تھے۔ اس وجہ سے کہ نزلہ کے سبب سے دانت اُن کے گر گئے تھے ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء میں انتقال کیا۔

مرزا جان جاناں ۱۶۹۰ء تا ۱۷۸۱ء

شمس الدین نام جان جاناں عرف مظہر تخلص۔ والد کا نام مرزا جان تھا جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ نسب ان کا باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے۔ پر دادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھی ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔ صوفی باصفا اور شاعر یکتا تھے۔ کلام میں جس قدر متانت اور تاثیر ہے اُسی قدر توحید اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے مسٹر بیل اور فرانسیسی محقق گارسن ڈیٹاسی کی تحریر کے موافق بمقام آگرہ ۱۱۰۱ھ مطابق ۱۶۹۰ء میں۔ مگر مولا آزاد کی تحقیق کے بموجب ۱۱۱۳ھ میں بمقام کالا باغ صوبہ مالوہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد عہد عالمگیری میں منصب دار اور نسباً علوی تھے اور خاندان شاہی سے بھی دور کا پیوند تھا۔ جب آپ کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا مرزا صاحب کو صوفیائے کرام اور اہل دل کی صحبت کا بچپن سے شوق تھا شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے

باقاعدہ حدیث پڑھی اور تین برس تک مشائخ نقشبندیہ سے کمال حاصل کیا۔ خود بھی وہ درویش کامل اور صوفی صاحبدل تھے سیکڑوں ہندو اور مسلمان آپ سے بیعت اور حسن عقیدت رکھتے تھے۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ میں آپ کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کرتے ہیں فرماتے ہیں "مردیست، مقدس، مطہر، درویش، عالم، صاحب کمال شہرۂ عالم بنیظیر، معزز، مکرم، اکثر اوقات در یاد الٰہی صرف می کند خوش تقریر بمنزلہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد" حسن صوری و معنوی دونوں سے عشق کامل رکھتے تھے۔ میر عبدالحی تاباں سے جو اُس زمانہ کے شہرۂ آفاق حسین و خوبرو شاعر تھے۔ بہت محبت اور اختلاط تھا۔ عالم متبحر فقیہ کامل حنفی المذہب اور نقشبندی طریقت تھے۔ عالم باعمل احکام قرآن کے پیرو۔ اکثر وقت اوراد و وظائف یا دلچسپ علمی گفتگو اور شعر و شاعری میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی تہذیب و متانت و قناعت اور پابندی وضع ضرب المثل تھی۔ استغنا و بے تعلقی کی حکایات گل رعنا میں درج ہیں۔ محمد شاہ نے ایک دفعہ کہلا بھیجا کہ ملک میں سے جو حصّہ چاہیئے قبول فرمائیے۔ انکار کر دیا۔ نواب فیروز جنگ نے گاؤں پیشکش کئے۔ قبول نہ ہوے۔ آصف جاہ نے تین ہزار روپیہ نذر کیا۔ منظور نہ ہوا استغنا کی یہ شان تھی کہ کھانا تک بازار سے منگواتے تھے۔ نذر و نیاز شاید ہی لیتے ہوں۔ علم و فضل اور شعر و شاعری کے ساتھ آپ کا اخلاق شگفتہ روئی اور لطافت مزاج بھی مشہور تھی۔ حسن معنی کے ساتھ حسن صورت بھی اللہ تعالیٰ نے بدرجۂ اتم عنایت فرمایا تھا۔ اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔

آپ کا کلام زبان اُردو کی تاریخ ارتقا میں ایک خاص درجہ اور اہمیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے کہ آپ نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ اُس میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں اور خیالات پیدا کیے اور قدیم طرز ایہام گوئی کو ترک کیا زبان میں یہ جدید رنگ آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس کا اعتراف

کیا ہے۔ مصحفی اور شوق اپنے اپنے تذکروں میں اس خدمت کا ضرور اعتراف کرتے ہیں[1]۔ آپ کا کلام نظم و نثر دونوں میں نہایت سادہ سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں جذبات اور تاثیر کے ساتھ تصوف کے خیالات سے بھی مالا مال ہے۔ اکثر اشعار کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضمون خیالی نہیں بلکہ واردات قلبیہ کا صحیح اور من وعن اظہار ہے۔ ایک دیوان فارسی ایک ہزار ابیات کا جو ۱۱۷۰ھ میں مرتب کیا اور ایک قدیم دیوان کا انتخاب ہے جس میں بیس ہزار شعر تھے۔ ایک نا تمام دیوان اُردو اور ایک بیاض "خریطۂ جواہر" فارسی شعراء کے منتخب کلام کی آپ کی تصانیف سے یادگار ہیں۔ وفات نہایت افسوسناک طریقہ سے ہوئی۔ اس طرح کہ عشرۂ محرم تھا تعزیے نکل رہے تھے مرزا صاحب اپنے کوٹھے پر بیٹھے اُن کی سیر کر رہے تھے۔ مشہور ہے کہ اُن کی زبان سے نکلا۔ کہ بارہ سو برس بعد اس قدر شور وغل اور ماتم کرنا اور کاغذ اور بانس کے ڈھانچوں کا اس قدر ادب و احترام کرنا خلافِ عقل ہے۔ یہ جملہ تعزیہ لے جانے والوں نے سُن لیا اور برسرِ پرخاش ہوگئے۔ نویں تاریخ کی رات کو دو آدمی مرزا صاحب کے مکان پر وارد

---

[1] مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "و ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود دور دورِ ایہام گویاں بود اول کسیکہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان اُستاد جلوہ ظہوری و ہذا فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر مرزا است بعدہ متتبعش بدیگران رسیدہ" ۱۲ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں "میگویند اول کسیکہ طرزِ ایہام گوئی ترک نمودہ و ریختہ او در زبان اردوے معلی شاہجہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص وقت گردیدہ مروج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین اقطب مدار جناب اکبر کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر بردیست فرشتہ صفت" ۱۲ انشاء اللہ خاں دریائے لطافت میں لکھتے ہیں "ازبسکہ آوازۂ فصاحت و بلاغت جناب فیضمآب مرزا جان جاناں مظہر علیہ الرحمہ گوش راقم را مقر خود میداشت دل با دیدہ ستنزہ شد کہ چرا از دیدار مرزا صاحب خود را ایں ہمہ محروم می پسندی و مرا از لذت جاودانی و عیش روحانی کہ در کلام معجز نظام آں حضرت ست باز میداری" ۱۲ میر صاحب لکھتے ہیں "دیوان مختصر شعر فارسی او بنظر فقیر مؤلف آمدہ است از سلیم و کلیم پائے کمی ندارد" ۱۲ میر حسن لکھتے ہیں "از فصحائے زماں۔ بلغائے دوراں" ۱۲

ہوئے اور آواز دی۔ مرزا صاحب کو کچھ خیال نہ ہوا باہر نکل آئے۔ ایک آدمی نے دیکھتے ہی فوراً قرابین ماری۔ مرزا صاحب زخمی ہوئے اور یہی ہلاکت کا سبب ہوا۔ یہ واقعہ ۱۱۹۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء کا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین۔ میر محمد باقر حزیں۔ خواجہ احسان اللہ خاں بیان۔ مصطفٰے خاں یکرنگ۔ بساون لال بیدار اور محمد فقیہ دردمند مشہور شاعر صاحب دیوان ہوئے ہیں۔

ناجی | سید محمد شاکر نام ناجی تخلص۔ مرد سپاہی پیشہ نواب امیر خاں کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے۔ شاہ آبرو حاتم اور ولی کے معاصر عہد محمد شاہی کے شعرا میں ہیں جب نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا ہے تو یہ موجود تھے۔ شہر کی تباہی و بربادی اپنی آنکھ سے دیکھی جس کے پُر درد حالات ایک مخمس میں بیان کیے ہیں۔ عنفوان شباب میں انتقال کیا آرزو ان کے کمال کے قائل اور اپنے برابر بلکہ اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔ نہایت تیز شوخ طبع ظریف اور ہر شخص کے کلام میں عیب نکالا کرتے تھے۔ میر صاحب کا قول ہے کہ "مزاج میں ہزل بہت تھا۔ اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنساتے اور خود منھ بناتے رہتے۔"

ان کا کلام بصورت دیوان موجود ہے اور سلاست زبان اور نزاکت خیالات کی وجہ سے اہل دہلی میں مقبول ہے۔ اشعار میں استعارات و ایہام کی کثرت ہے بعض اشعار فحش بھی ہیں جو اس زمانہ کا رنگ ہے۔

تاباں | میر عبدالحی تاباں تخلص۔ نہایت خوبصورت خوشرو جوان تھے۔ ان کے غیر معمولی حسن کا شہرہ لوگوں کے زبان زد تھا یوسف ثانی کہلاتے تھے ان کے حسن کی تعریف میں شعر کہے جاتے تھے۔ اسی حسن کو دوبالا کرنے کے لئے وہ عموماً سیاہ کپڑے پہنتے تھے۔ اُن کے حسن کا شہرہ یہاں تک پھیلا کہ ایک مرتبہ شاہ عالم اُن کے روئے صبیح کی زیارت کے لئے خود گئے۔ عورتوں کی طرف ان کو زیادہ توجہ نہ تھی مگر

ایک شخص پر جن کا نام شاہ سلیمان تھا عاشق تھے. مرزا مظہر جان جاناں کو ان کے ساتھ ایک خاص محبت اور ارتباط تھا جیسا کہ اُن کے حال میں لکھا گیا ہے. اکثر تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ جوانی میں مرے اور موت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مے نوشی کثرت سے کرتے تھے جس کی وجہ سے استسقا ہو گیا تھا. مگر صاحب تذکرۂ گلشن ہند کا بیان ہے کہ انھوں نے ان کو ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ اور جب بھی وہ نہایت حسین و جمیل تھے فیلن صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۷۹۶ء یعنی ۱۲۱۱ھ تک وہ زندہ تھے. میر صاحب اپنے تذکرہ میں اُن کا ذکر غیر معمولی تعریفوں کے ساتھ کرتے ہیں. فرماتے ہیں "نوجوان با مزہ بود. سید نجیب الطرفین مولد او شاہجہاں آباد است بسیار خوش فکر و خوب صورت خوش خلق و پاکیزہ سیرت معشوق عاشق مزاج۔ تا حال در فرقۂ شعرا ہمچوں او شاعر خوش ظاہر از مکمن بطون عدم بعرصۂ ظہور جلوہ گر نشدہ بود" آگے اُن کی مے نوشی کی نسبت لکھتے ہیں کہ "آخر آخر کار اوائل جوانی او بود۔ این قدر مداومت شراب کردہ کہ ملاقات ہمہ یاراں موقوف شد اکثرے از دوستانش کہ بہ خانۂ او می رفتند او را مست طافح می یافتند" اسی شراب کی کثرت سے دوستوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ اُنھوں نے بھی مجبور ہو کر آخر کار شراب سے کنارہ کشی کی مگر چند ہی دن کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔ اِن کا کلام عاشقانہ شیریں و نمکین ہے۔ خیالات نہایت نازک۔ زبان بہت سلیس۔ شاگردی میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حاتم اور بعض کے نزدیک محمد علی حشمت سے اصلاح لیتے تھے لطف کا قول ہے کہ سودا کو اپنا کلام دکھلاتے تھے. مگر میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں حشمت ہی کو اُن کا اُستاد مانا ہے اور یہی صحیح ہے۔

یکرنگ مصطفیٰ خاں یکرنگ خان جہاں لودی کے احفاد سے تھے۔ امرائے محمد شاہی میں سے تھے اور بڑی عزت و آبرو سے زندگی بسر کرتے تھے. باکمال سخنوران دہلی میں شمار کئے گئے ہیں. کلام بلند اور استعارات سے مملو۔ شاہ مبارک آبرو اور

میاں مضمون کے طرز کا ہے بعض لوگ اُن کو شاہ آبرو کا اور بعض خاں آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں مگر خود اُن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان یادگار ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور عاشقانہ اور عارفانہ دونوں رنگ میں ہے۔ اکثر اشعار کو دنیادار عشق مجازی کا مگر عرفا اُن کو عشق حقیقی کا پرتو سمجھتے ہیں۔ تاریخ پیدائش و وفات کا پتہ نہ چلا۔ ایک مرثیہ بھی امام حسین علیہ السلام کی شان میں لکھا ہے جس کے کچھ اشعار میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں نقل کیے ہیں۔

فغاں متوفی ۱۷۷۲ء | اشرف علی خاں متخلص بہ فغاںؔ خلف مرزا علی خاں نکتہ۔ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے کوکہ یعنی رضاعی بھائی تھے۔ نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھے۔ اسی وجہ سے ظریف الملک کوکہ خان بہادر کا خطاب دربار دہلی سے عنایت ہوا تھا۔ باتوں میں مزاح اور ظرافت بہت تھی۔ پھبتی[1] کہنے کے مشاق تھے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تباہ کیا تو فغاںؔ مرشد آباد چلے گئے جہاں اُن کے چچا ایرج خاں برسر اقتدار تھے۔ مرشد آباد سے نواب شجاع الدولہ بہادر کے پاس فیض آباد آئے۔ اور نواب نے ان کی بڑی خاطر و مدارات کی چونکہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے کوئی بات ناگوار گزری یہاں سے پٹنہ چلے گئے (بقول مصحفی) نواب نے جوش اختلاط میں گرم پیسے سے ان کا ہاتھ داغ دیا تھا) جہاں مہاراج شتاب رائے نے اُن کی بڑی قدر و منزلت کی۔ یہاں کی صحبت سے بھی دل بھر گیا اور بالآخر گوشہ نشینی اختیار کی ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں پٹنہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ ایک عمدہ دیوان ریختہ یادگار چھوڑا جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار ہوں گے۔ میر تقی اور میر حسن کی تحقیق کے بموجب ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ سودا اور میر دونوں باکمال ان کے معترف ہیں۔ سودا نے انکے بعض اشعار کی تضمین بھی کی ہے

[1] میر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ایک درباری امیر ناگر مل کو "تکمی کی منڈی کا سانڈ" اور ایک شخص مسمی بہ حکیم معصوم کو "گاؤ گجراتی" کہا کرتے تھے۔

میر صاحب ان کو قزلباش خاں امید کا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر مصحفی علی قلی ندیم سے نسبت دیتے ہیں۔ فغاں فارسی اور ہندی کے محاورات خوبی کے ساتھ ایک ساتھ نظم کرتے ہیں۔ کلام نہایت پاکیزہ۔ خیالات نازک اور بلند۔ ایہام گوئی ترک کردی تھی۔ بتذل اور فحش الفاظ و خیالات سے احتراز تھا۔ کلام میں صفائی اور روانی بہت ہے قطعات مسلسل خوب لکھتے ہیں۔ میر صاحب ان کو "جوان قابل و ہنگامہ آرا" کہتے ہیں۔ دیوان میں غزلیات۔ قصائد۔ قطعات۔ رباعیاں۔ مخمس سبھی کچھ ہیں۔

باقی اور شعرا اس عہد میں شاعری کا رواج بہت پھیل گیا تھا۔ اس وجہ سے شعرا بھی کثرت سے پیدا ہوے۔ قدیم تذکروں میں مثلاً میر تقی اور میر حسن کے تذکروں میں چھوٹے بڑے مشہور و غیر مشہور ہر قسم کے شاعروں کے نام اور اُن کے کلام کے نمونے بہ کثرت دیے ہوے ہیں۔ ہم اس مختصر کتاب میں اُن سب کا ذکر بالاستیعاب کرنے سے قاصر ہیں۔ میر محمد حسین کلیم جو دلی کے رہنے والے تھے وہ قابل ذکر ہیں۔ میر حسن کا بیان ہے کہ فصوص کا انھوں نے عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور رسالہ عروض و قافیہ میں بھی لکھا تھا میر صاحب کے رشتہ دار تھے اور صاحب کمال تھے۔

باب ۶

اساتذۂ دہلی

حصۂ دوم طبقۂ متوسطین

میر اور سودا کا زمانہ

اردو شاعری کا زرّین عہد | یہ دَور اُردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا دور ہے۔ اسی میں

شاعری کو معراج ترقی حاصل ہوئی۔ اسی میں میر حسن، درد، سودا اور میر ایسے صاحب کمال پیدا ہوے۔ جن کے نام اس وقت تک روشن ہیں۔ بلکہ جب تک زبان اردو دنیا میں رہے گی وہ کبھی نہیں مٹ سکتے۔ تمام اصناف سخن اس عہد میں انتہاے کمال پر پہونچے مثنوی میں میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" قصیدہ میں سودا کے قصائد۔ غزل میں میر اور درد کی غزلیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ یہ کامل اُستاد اپنے اپنے فن میں بےنظیر اور بے مثال گزرے ہیں اور اپنا کلام آیندہ نسلوں کے واسطے ایک بے مثل کسوٹی چھوڑ گئے ہیں۔ یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کا ادب و احترام مرور ایام سے کم نہیں ہو سکتا۔ تمام اساتذہ مابعد مثلاً ذوق۔ غالب۔ ناسخ۔ آتش۔ سب ان کا لوہا مانتے تھے۔ اور ان کی اُستادی اور قادر الکلامی کے دل سے قائل تھے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب		ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

زبان میں فارسیت کا غلبہ اس عہد میں فارسیت کا غلبہ تھا۔ میر۔ سودا اور دیگر استادان فن اپنے پیش رووں کی نقل کرتے رہے۔ شاہ حاتم کے ساتھ خواجہ میر درد و میر جاناں رنگین نے اپنے کلام سے ہندی کے لفظ نکال ڈالے۔ ان تغیرات کی فہرست صفیر بلگرامی نے تذکرہ جلوۂ خضر کی جلد اول میں درج کی ہے جس کو شعر الہند میں نقل کیا ہے۔ مولوی عبد السلام صاحب لکھتے ہیں کہ "ان اصلاحات کے بعد اُردو۔

شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی اور ہمارے شعرا نے بالکل ایرانی شعرا کے طرز میں کہنا شروع کیا چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں سے

تبعیت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

سودا و میر نے سعدی و حافظ سے استفادہ کیا اور اُن کے اشعار کا ترجمہ بھی کیا۔ اس زمانہ میں کچھ لوگوں نے متاخرین شعرائے فارسی ناصر علی۔ جلال۔ اسیر کلیم اور بیدل کے رنگ میں کہنا شروع کیا۔ لیکن خوش مذاق شعرا نے طالب آملی اور شفائی وغیرہ کی روش اختیار کی۔ ان تصریحات کے علاوہ خود ان شعرائے کلام کی اندرونی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ اُنھوں نے متاخرین شعرا فارسی کے کلام کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی ہے۔ چنانچہ سودا و میر درد وغیرہ نے اس دور کے متعدد شعرائے فارسی مثل صائب بیدل۔ نظیری۔ عرفی۔ کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور اُن کے عمدہ اشعار کا ترجمہ کیا۔ اور اس دور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کی ترجمہ کی جو بہتات ہے وہ اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے۔ سودا نے علی الخصوص ایسی نئی نئی ترکیبیں اور محاورے زبان میں داخل کئے جو مستقل طور پر اُسی کے ہو گئے۔ میر نے بھی خزانۂ فارسی سے زبان کو بہت کچھ مالا مال کیا۔ البتہ میر حسن نے متاع موجودہ پر قناعت کی۔

الفاظ میں تذکیر و تانیث الفاظ میں تذکیر و تانیث کی پابندی نہ تھی۔ مصنّف کی خواہش اور خوشی کے موافق الفاظ مذکر اور مؤنث لکھے جاتے تھے۔ نئی بحریں جو اس سے پیشتر نہیں کہی گئی تھیں اب داخل شعر ہوئیں۔ نئے اصناف سخن بھی اسی زمانہ میں داخل ہوئے مثلاً میر صاحب نے واسوخت مثلث، مربع، کی ایجاد کی۔ فارسی میں البتہ واسوخت کی ابتدا فغانی اور وحشی نے کی تھی۔ قصائد اور ہاجی کی تکمیل سودا کے ہاتھوں ہوئی اور قصائد تو یقیناً اُسی وقت درجۂ کمال کو پہونچ گئے تھے۔ مشکل مشکل بحریں اور

قافیے۔ اور دوہرے قافیوں کا رواج ہوا تاکہ زبان پر قدرت ثابت ہو۔ زوائد اور بھرتی کے الفاظ جن کا رواج عہد سابق میں بہت تھا اب کم ہو گئے۔

شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آتے ہیں | افغانوں کے پیہم حملوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے خوف سے اکثر نامور شعرائے دہلی نے ترک وطن اختیار کیا۔ چنانچہ میر، سودا، میر حسن، سوز وغیرہ اس پُر آشوب زمانہ میں اپنے وطن کو خیر باد کہہ کے لکھنؤ چلے آئے جو اُس وقت شعرا و کملا کا ملجا و ماوا تھا اور ہر فن کے استاد وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے صرف میر درد ہی ایک ایسے قانع اور وطن پرست بزرگ تھے جنھوں نے خاک وطن کی محبت نہ چھوڑی اور وہیں جمے رہے۔

کلام کی خصوصیت | اس عہد کے شعرا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے کلام میں پست خیالات کے ساتھ بلند خیال اور سخیف الفاظ کے ساتھ شاندار اور فصیح الفاظ ملے جلے ہیں۔ غزلوں میں شتر گربگی و ناہمواری۔ میر تقی میر کی نسبت ایک قدیم تذکرہ نویس کا قول ہے کہ اُن کے معمولی اشعار نہایت معمولی اور اعلیٰ اشعار نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں انگریزی میں یہی حالت ورڈ سورتھ شاعر کی ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں یہی اعتراض مرزا سودا پر بھی وارد کرتے ہیں حقیقت میں یہ ناہمواری کلام ایک معقول سزا ہے جو ان لوگوں کو ملتی ہے جن کا کلام موقع بےموقع اور بکثرت ہوتا ہے۔ سودا اور میر سے زیادہ پُر گو کون ہو گا پس اُن کے تمام اشعار یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ خواجہ میر درد چونکہ کم کہتے تھے یعنی اُسی وقت کہتے تھے جب طبیعت ملہم ہوتی تھی اسی وجہ سے اُن کا بیشتر کلام اس عیب سے پاک ہے۔

تذکرے | متعدد تذکرے یعنی شعرا کے مختصر حالات اور اُن کے کلام کا انتخاب بھی اسی عہد میں قلمبند کیا گیا۔ یہ کام بہت مفید ہوا۔ کیوں کہ اس سے اس زمانہ کے

دیکھو فٹ نوٹ صفحہ ۴۵

حالات پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعرا" اور میر حسن کا تذکرہ "شعرائے اردو" اب چھپ گئے ہیں اور ہر جگہ ملتے ہیں۔ ان میں گو کہ حالات بہت مختصر لکھے ہیں مگر پھر بھی شعراء اردو کے مورخ کے لئے بہت مفید چیز ہیں اور نہایت دلچسپ باتیں ان میں ملتی ہیں۔

خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ تا ۱۱۹۹ ہجری

سید خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الصدق تھے۔ ان کے پدر بزرگوار کا بھی ایک ضخیم دیوان "نالۂ عندلیب" کے نام سے مشہور ہے۔ سلسلۂ نسب خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے اور ماں کی طرف سے حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے ان کے نانا میر سید محمد حسنی نواب میر احمد علی خاں کے صاحبزادہ تھے جن کی تعریف میں سودا نے قصیدہ لکھا ہے۔ اور جو جنگ پانی پت میں شہید ہوے تھے۔ خواجہ صاحب کے جد امجد بخارا سے ہندوستان آئے مگر اُن کے والد خواجہ ناصر کی ولادت ہندوستان ہی میں ہوئی۔ خواجہ ناصر جب جوان ہوے تو شاہی منصب دار مقرر ہوے۔ مگر تھوڑے دنوں میں تعلقات دنیاوی ترک کر کے گوشہ نشین اور حضرت شاہ خواجہ محمد زبیر کے مرید ہو گئے۔ اسی عرصہ میں مشہور صوفی شاہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوے۔ خواجہ صاحب نے اپنے پدر بزرگوار کے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے حالات نہایت پر اثر طریقہ سے بیان کیے ہیں۔ خواجہ صاحب کا سنہ ولادت ۱۱۳۳ھ ہے انھوں نے اپنے والد ہی کی آغوش تربیت میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کی۔ قرآن۔ حدیث، تفسیر فقہ اور تصوف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ جوانی میں دنیاوی معاملات میں حصہ لیتے اور اپنی جاگیر کے کاموں کو بھی دیکھتے تھے۔ مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ سپاہی پیشہ تھے۔ مگر والد کے حکم سے نوکری چھوڑ کر فقر اختیار کیا۔ اٹھائیس برس کی عمر میں دنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اور جب باپ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ تو انتالیس برس کے

سن میں اُن کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہوے. خواجہ صاحب کا خاندانی اثر اور نواب ظفر خاں رئیس عہد جہانگیری سے اُن کا انتساب اور سلسلۂ نقشبندیہ میں اُن کا شیخ وقت ہونا۔ یہ سب باتیں اُن کو مرجع خاص وعام بنائے ہوے تھیں. پھر اُن کے ذاتی تقدس اور مراتب عرفان و تصوف سے کماحقہ واقف ہونے کی وجہ سے لوگ اُن کے دل سے گرویدہ تھے. غریب سے لے کر امیر اور بادشاہ سے لیکر فقیر تک اُن کی بے انتہا عظمت کرتے اور اُن کے ساتھ دلی عقیدت رکھتے تھے معاصر تذکرہ نویس اُن کے اس خاص امتیاز اور اُن کی بزرگی اور خدارسی کی شہادت نہایت زوردار الفاظ میں دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ مجسم تہذیب و متانت اور پیکر آداب و اخلاق تھے جو اولیاء اللہ کا نشان امتیاز ہے قناعت و توکل اور رضا و تسلیم اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوے تھے. جب دہلی پر احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا اور اس کے بعد مرہٹوں کی لوٹ مار شروع ہوئی تو ہر شخص جو اپنی ناموس و آبرو کا تحفظ چاہتا تھا شہر چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا. بڑے بڑے نامی شاعر دلی سے نکل کر لکھنؤ پہونچے مگر اس مرد راہ خدا کو جنبش بھی نہوئی. وہ اللہ پر توکل کیے اپنے بزرگوں کے سجادہ پہ بیٹھا رہا۔ اور اس کی قناعت و استقلال اور توکل علی اللہ میں ذرہ بھر فرق نہ آیا طبیعت میں آزادی. خودداری اور استغنا اس درجہ تھا کہ کسی کی مدح و ثنا سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا. ایسی خوددار طبیعت بھلا خوشامد اور بھٹئی کیونکر گوارا کر سکتی تھی. دنیاداروں کے سامنے زانوے ادب تہ کرنا اُن کو بیحد شاق تھا استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہ وقت تک سے ملنے میں عار تھا. ایک مرتبہ شاہ عالم ان کی بزم سماع میں چلے آئے جس کی شرکت کو وہ اپنا فخر جانتے تھے اتفاق سے پاؤں پھیلا دیے. خواجہ صاحب کو نہایت ناگوار ہوا. بادشاہ اُن کے چشم و ابرو سے سمجھ گئے. فوراً عذر کیا کہ مجبور ہوں پاؤں میں درد ہے. حضرت نے فرمایا کہ اگر تکلیف تھی تو تکلیف کیوں کی. حضرت کو موسیقی سے بھی بڑا ذوق تھا. خود اس فن میں صاحب کمال تھے. بڑے بڑے کلاونت اور

گویے حاضر خدمت ہوتے اور متاع کمال پیش کرتے۔ آپ کے دولت خانہ پر ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیسویں کو محفل سماع منعقد ہوتی جس میں بڑے بڑے قوال اور ماہرین فن جمع ہوتے۔ اور اپنا کمال دکھلاتے فیروز جو اس زمانہ کا مشہور قوال تھا اکثر حاضر خدمت ہوتا اور اپنے کمال سے حضرت کو محظوظ کرتا۔ محرم میں مجالس منعقد ہوتیں جس میں سوز خوانی اور مرثیہ خوانی کے جوہر دکھائے جاتے۔ اسی طرح ارباب تصوف اور اصحاب سلوک کے بھی جلسے دولت کدہ پر اکثر منعقد ہوتے جن کی شرکت کو بڑے بڑے رئیس و امیر اپنی سعادت و فخر سمجھتے۔

تصانیف | خواجہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا کتب ذیل جو چھپ چکی ہیں اُن کی تصنیفات سے ہیں:۔

(۱) رسالۂ اسرار الصلوٰۃ جو پندرہ برس کے سن میں بہ حالت اعتکاف لکھا۔ (۲) واردات درد انتیس۲۹ برس کی عمر میں لکھی اور اُس کی شرح ہیں۔ (۳) علم الکتاب ایک بڑا نسخہ تحریر کیا جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں۔ (۴) نالۂ درد۔ (۵) آہ سرد (۶) درد دل (۷) شمع محفل (۸) واقعات درد وغیرہ۔ (۹) حرمت غنا (۱۰) دیوان فارسی (۱۱) دیوان اُردو۔

رسالہ اسرار الصلوٰۃ اسم با مسمّٰی ہے اس میں نماز کی فضیلتوں اور پوشیدہ اسرار کا بیان ہے۔ رسالۂ اسرار الصلوٰۃ انتیس برس کی عمر میں ۱۱۷۲ھ میں تصنیف فرمایا۔ اس میں مسائل تصوف نظم و نثر میں بیان کئے گئے ہیں۔ علم الکتاب اسی رسالۂ واردات کی شرح ہے۔ جس کو اپنے عزیز بھائی اور شاگرد خواجہ میر اثر کی فرمائش سے تصنیف کیا اس میں مسائل تصوف کو زبردست دلائل کے ساتھ آیات قرآنی۔ احادیث نبوی اور اقوال سلف سے ثابت کیا ہے۔ اپنی زندگی کے بھی اکثر واقعات کا اس میں بیان ہے نالۂ درد ۱۱۹۰ھ میں اور آہ سرد ۱۱۹۲ھ میں تصنیف ہوئیں یہ رسالے بھی روحانیات

اور مسائل تصوف پر ہیں۔ شمع محفل، اور صحیفۂ واردات، یہ دونوں کبر سنی کی تصنیفات ہیں جبکہ آپ کی عمر باسٹھ برس کی تھی۔ حرمت غنا اور واقعات درد میں بھی دقیق مسائل تصوف کا ذکر ہے۔ اول الذکر میں غنا کی حلت و حرمت سے بحث کی ہے۔ دیوان فارسی فارسی کلام کا ایک مختصر دیوان ہے جس میں غزلوں کے علاوہ رباعیات اور مخمسات وغیرہ بھی ہیں۔ آخری چیز دیوان اردو ہے جس کو اردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا سمجھنا چاہیئے دیوان اردو کے علاوہ جملہ تصانیف مذکورۂ بالا فارسی میں ہیں۔ دیوان کا نہایت صحیح اور عمدہ نسخہ مطبع نظامی نے چھاپا ہے جس پر محترم نواب حبیب الرحمن خان صاحب شروانی نے نہایت قابلیت سے ایک دیباچہ لکھا ہے۔ خواجہ صاحب کی زبان اور طرز ادا وہی ہے جو میر کی ہے۔ عبارت صاف سلیس فصیح ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آتی ہے۔ درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تصوف کو ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا عرفان اور تصوف کے پیچیدہ اور مشکل مضامین اس خوبصورتی اور صفائی سے بیان کئے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے۔ غزلیں زبان کی سادگی اور صفائی میں میر کے کلام کا مزا دیتی ہیں اور تصوف کی چاشنی اور درد و اثر کے اعتبار سے ان سے بڑھی ہوئی ہیں۔ مثل میر صاحب کے خواجہ صاحب کی بھی وہ غزلیں جو چھوٹی بحروں میں ہیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ بقول مصنف "آب حیات" تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے۔ یا بقول امیر مینائی مرحوم لپسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ بیہودہ مذاق اور ہجو سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ کہیں کہیں پرانے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کر جاتے ہیں مگر اس خوبصورتی سے کہ اُن سے شعر کی خوبی بڑھ جاتی ہے۔ عاشقانہ رنگ نہایت اعلیٰ اور بلند ہے۔ اس زمانہ کا عشق مجازی جس کو وہ بوالہوسی سے تعبیر کرتے تھے اُن کے کلام میں نہیں پایا جاتا مثل خواجہ حافظ اور اساتذۂ سلف کے اُن کا معشوق بھی کوئی بازاری اور ہرجائی نہیں بلکہ اُس سے معشوق حقیقی یا مرشد مراد ہے۔ ایسے بزرگوں کی

نظر میں شاعری کا پایہ نہایت بلند اور اس کا مقصد نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہ لوگ کسب مال وجاہ کی غرض سے شعر کہنا گناہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کا کلام سوز وگداز اور تاثیر سے مملو ہوتا ہے۔ زبان اور ادب اُردو کے لحاظ سے خواجہ صاحب ایک نہایت نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں بقول مصنف "آبحیات" چار رکنوں سے ایک رکن یہ ہیں باقی رکن۔ میر۔ سودا۔ اور مظہر ہیں حقیقت میں انھیں عناصر اربعہ کی ترکیب سے زبان کا قوام درست ہوا۔ قدیم ایہام گوئی اور ہندی دوہروں کی تقلید گئی۔ زبان صاف ہوئی اور منجھی۔ اور بالآخر ترقی کی معراج تک پہونچ گئی۔ خواجہ صاحب کے کلام نے یہ اور اضافہ کیا کہ تصوف اور روحانیات کی چاشنی۔ سے اس میں چار چاند لگا دیے۔ خواجہ صاحب کا یہ اثر اُن کے معاصرین اور بعد کے آنے والوں پر بھی بہت تھا۔ اُن کے معاصر شعرا اُن کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ خدائے سخن میر تقی میر اپنے تذکرہ میں کس رنگینی اور جوش کے ساتھ اُن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "جوش بہار گلستان سخن۔ عندلیب خوشخوان چمن این فن زبان گفتگویش گرہ کشاے زلف شام بدعا مصرعہ نوشتہ اش بر صفحۂ کاغذ از کاکل صبح خوشنما ... خلیق۔ متواضع آشنائے درست شعر فارسی ہم میگوید اما بیشتر رباعی گرمی بازار وسعت مشرب دست غرض از آشنائی مطلب درست متوطن شاہجہاں آباد بزرگ و بزرگ زادہ جوان صالح از درویشی بہرۂ وافی دارد فقیر را بخدمت او بندگی خاص است۔ اگرچہ حسن سلوک عام سر حسن سلوک بپائے خود گرفتہ اعتزاز را از گوشۂ دل نہادہ خلف الصدق حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ است کہ مقتدائے عالم است۔ ایامی کہ فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوز می شد۔ از زبان مبارکش میفرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد ... مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر ست واللہ نداتہ ہمیں بزرگ است۔ زیرا کہ پیش ازیں مجلس بخانہ اش مقرر بود۔ از گردش روزگار بسیار برہم خورد از بسکہ باین احقر خلاص قلبی داشت گفت کہ ایں مجمع را شما اگر بخانۂ

خود معین بکنید بہتر ست نظر بر اخلاص آن شفق عمل کردہ آمد۔ خدا شما را بالا باد سلامت دارد۔
میر صاحب خواجہ صاحب کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ اُنکے
شاگرد تھے چنانچہ فرنچ مستشرق اور زبان اُردو کے دلدادہ گارسن ڈیتاسی کو بھی یہی دھوکا
ہوا کہ وہ میر کو درد کا شاگرد بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب اُن کے تقدس
اور کمال عرفان اور نیز اُن کی ذاتی قابلیت کے دل سے قائل تھے اور یہی حال میر حسن کا
بھی ہے۔ وہ بھی ان کی بزرگی کے قائل اور اُن کے کلام کے معترف اور دلدادہ تھے۔
کلام کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اگرچہ مختصر مگر مثل کلام حافظ شیرازی انتخاب ہے ہماری رائے
ہیں میر انیس کے کلام میں جو سادگی اور اثر پایا جاتا ہے وہ بواسطہ میر حسن خواجہ صاحب
کے کلام کا ایک نمایاں اثر ہے۔

شاگرد خواجہ صاحب کے بہت سے شاگرد تھے۔ جن میں قائم۔ ہدایت۔ فراق
اور اثر مشہور ہیں علی الخصوص قائم اور اثر اعلیٰ درجہ کے شاعر اور صاحب دیوان ہیں۔
خواجہ صاحب کے صاحبزادہ کا نام صاحب میر اور الم تخلص تھا۔ سنہ وفات اور عمر کے
متعلق اختلاف ہے بیل صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۱۹۹ھ مطابق سنہ ۱۷۸۵ء میں وفات پائی۔
مرزا علی لطف سنہ ۱۲۰۲ھ اور مصحفی سنہ ۱۲۰۹ھ لکھتے ہیں جو سنہ ۹۴-۱۷۹۳ء کے مطابق ہے۔
یہی وہ سن ہے جس میں مصحفی نے اپنا تذکرہ لکھا تھا۔ گارسن ڈیتاسی اور لائل صاحب
مصحفی کی پیروی کرتے ہیں۔ مصنف آبحیات لکھتے ہیں سنہ ۱۱۹۹ھ میں بمقام دہلی چھیاسٹھ برس
کی عمر میں انتقال کیا۔ علامہ شروانی نے اپنے مقدمہ میں ایک معاصر شاعر بیدار کی
تاریخ لکھی ہے ع حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب۔ جس سے سن وفات
سنہ ۱۱۹۹ھ اور عمر اڑسٹھ کی نکلتی ہے خود خواجہ صاحب شمع محفل میں فرماتے کہ کشف
کے طور پر مجھ کو معلوم ہوا کہ میری عمر چھیاسٹھ کی ہوگی سب کا خلاصہ یہ ہے اور صحیح بھی
یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمر چھیاسٹھ سال اور سنہ وفات سنہ ۱۱۹۹ھ ہے۔

درد کی شخصیت اُردو شاعری میں ایک خاص شخصیت ہے اپنے معاصرین پر اور نیز بعد کی نسلوں پر اُن کی شاعری کا ایک گہرا اثر پڑا تصوف کے رنگ میں وہ بے نظیر اور بے مثال ہیں۔

میر سوز
۱۱۳۳ھ تا ۱۲۱۳ھ

سید محمد میر نام میر ضیاء الدین کے صاحبزادہ شاہ قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ مگر خود میر سوز کی ولادت دہلی میں ہوئی تیر اندازی اور شہسواری میں مشاق شہزور اور ورزش کے بڑے شائق تھے۔ فنون سپہ گری کے علاوہ خوشنویسی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ نسخ نستعلیق شفیعا وغیرہ تمام خطوط مروجہ خوب لکھتے تھے۔ جوانی میں رنگین طبع اور عاشق مزاج تھے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پر تباہی آئی اور لوگ بیحال تھے یہ دولت فقر سے مالامال صوفی باکمال تھے۔ وطن کی تباہی و بربادی سے افسردہ خاطر ہو کر نکل کھڑے ہوئے پہلے فرخ آباد گئے جہاں نواب مہربان خاں رند دیوان نواب احمد خاں غالب جنگ کی چند دن ملازمت و رفاقت کی۔ اُس کے بعد لکھنؤ آئے۔ یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ نواب بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ مگر اِن کا جی نہ لگا چند دن ٹھہر کر مرشدآباد کا رُخ کیا۔ جہاں نواباں بنگالہ کا دور دورہ تھا وہاں سے بھی جی گھبرایا تو آخر اُسی سال پھر لکھنؤ واپس آئے اور اب کی مرتبہ آصف الدولہ اُن کے شاگرد ہوئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُستاد نے انتقال کیا۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۲۱۲ھ میں بعمر ۸۰ سال رحلت کی۔ مگر لطف سنہ وفات ۱۲۱۳ھ بتاتے ہیں اور مصحفی بوقت وفات ستر برس کا سن لکھتے ہیں نساخ اپنے تذکرہ سخن شعرا میں عمر اسی سال اور مقام وفات تلہر بتاتے ہیں۔ فیروز تذکرۃ الشعرا میں ۱۲۱۳ھ وفات اور عمر ۷۰ سال لکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عمر ۸۰ سال اور ۱۲۱۳ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ میر سوز نہایت خوش طبع ظریف۔ شیریں زبان خلیق۔ ملنسار اور بڑے پابند وضع تھے۔

طرز کلام

کلام میں ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جس میں غزلوں کے علاوہ مثنوی،

رباعیاں اور مخمس بھی ہیں۔ انداز کلام نہایت صاف سادہ اور بے تکلف۔ زبان میٹھی
غزل کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ لطف زبان۔ صفائی محاورہ اور بیساختہ پن میں انکا
کلام اپنا آپ نظیر ہے۔ تکلف و آورد فضول مبالغے تشبیہات اور استعاروں سے پاک و
صاف۔ لفظی صنائع بدائع بھی بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کا شاہد کلام حسن طبعی سے
آراستہ کسی مصنوعی زیب و زینت کا محتاج نہیں۔ سادگی اور صفائی میں میر تقی میر البتہ
ان کے مقابل ہیں مگر سودا بہت پیچھے ہیں۔ مگر میر صاحب کے یہاں لطف زبان کے
ساتھ جو لطف مضامین اور جذبات کا ہے وہ سوز کے یہاں بہت کم ہے اُن کے کلام میں
میر اور سودا کی طرح فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی بھی کثرت نہیں سیدھے سادھے ہندی
لفظ بیساختگی سے باندھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں شعر کو اتنا ہلکا پھلکا کر دیتے
ہیں کہ اکثر اُس پر ردیف کا بھی بوجھ نہیں ڈالتے اسی سادگی کی وجہ سے ایک دور پہلے کے
شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ زبان کی اصلاح یا توسیع کی کوئی خدمت اُن سے انجام نہ ہو سکی بلکہ
سچ پوچھو تو غزل کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ ان کے اشعار کی سادگی اور بے تکلفی سے معلوم
ہوتا ہے کہ جو طرز ریختی کے نام سے بعد کو سعادت یار خاں رنگین نے ایجاد کیا۔ اس کی ابتدا
سوز ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی۔ شعر پڑھنے کا طریقہ بھی ان کا سب سے علیحدہ تھا۔
ترنم اور خاص درد و اثر کے ساتھ شعر پڑھتے اور اظہار مطلب میں آنکھ ناک ہاتھ گردن
غرض ہر عضو سے کام لیتے اور خود مضمون کی صورت بن جاتے آبحیات میں لکھا ہے
کہ جب یہ قطعہ پڑھا سہ

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے وہاں دیکھے کئی طفل پری رو		سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

تو چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے زمین پر گر پڑے۔ گویا پریزادوں کو دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا
میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں " در عہد خود از جملہ ادا داران ممتاز طرز ادائیہ ملک او ست

وخواندن اشعارش از زبان او نیکو از خواندش چنان خوب می نماید که در گفتن نمی آید" مرزا علی لطف لکھتے ہیں کہ عاشقانہ رنگ کے بادشاہ میر سوز کا کلام سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔
نام کی مناسبت سے پہلے میر تخلص کرتے تھے پھر سوز اختیار کیا چنانچہ اس شعر میں دونوں تخلصوں کی طرف اشارہ ہے ؎

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ موے ہزار حیف
اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

میر تقی میر اسی اشتراک تخلص کی وجہ سے اُن سے کچھ ناراض ہیں فرماتے ہیں۔
ہر چند طرز علیحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصف دلم از و خوش است۔

سوز کا مرتبہ شاعری میں

سوز کا مرتبہ اُردو شاعری میں بہت بلند ہے گو وہ میر و سودا کے مقابل نہیں سمجھے جا سکتے مگر پھر بھی غزل گوئی کے اُستاد اور صفائی کلام، محاورہ بندی اور سوز و گداز کے بادشاہ تھے، کلام نہایت صاف، سلیس، پُر اثر، تکلف اور بناوٹ سے بالکل خالی ہوتا ہے۔

سودا

سنہ ۱۱۲۵ھ تا سنہ ۱۱۹۵ھ
سنہ ۱۷۱۳ء تا سنہ ۱۷۸۱ء

مرزا محمد رفیع تخلص بہ سودا، اقلیم سخنوری کے شہنشاہ۔ اُردو کے خاقانی و انوری۔ سپہر شاعری کے درخشندہ تارے بلکہ آفتاب۔ اور بقول اپنے حریف اور معاصر خدائے سخن میر کے ریختہ گویوں کے انتخاب تھے۔

ان کے آبا و اجداد معزز خاندان کے لوگ کابل کے باشندے تھے۔ مرزا صاحب کے والد مرزا محمد شفیع ایک تجارت پیشہ بزرگ تھے جو کابل سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ خاک دہلی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ سرآمد شعرائے ہندوستان مرزا رفیع السودا وہاں پیدا ہوئے آزاد تذکرہ آبحیات میں تاریخ ولادت سنہ ۱۱۲۵ھ لکھتے ہیں مگر یقین کے ساتھ اس کی صحت کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے کہ نہ تو معاصرین

نے لکھا ہے اور نہ مابعد کے تذکروں میں مرزا صاحب کی عمر یا سنہ ولادت کی تصریح ہے
تخلص کے انتخاب کی وجہ بھی آبحیات میں دلچسپ لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ تخلص سودا
اس واسطے رکھا گیا کہ سودا یا جنوں تمغائے عشق ہے جس پر ایشیائی شاعری کا دار و مدار ہے
اور یا پھر باپ کی سوداگری کی رعایت سے رکھا گیا کہ اُس کے جزو اوّل میں لفظ سودا داخل
ہے" اور آخر میں یہ خوب فرمایا کہ سوداگری کی بدولت ایہام کی صنعت گھاتے میں آئی۔

مرزا صاحب کی پرورش اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ پہلے سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ شاہ صاحب نے جو فہرست اپنے شاگردوں کی اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہے اس سے مرزا کی استادی پر فخر و مباہات ثابت ہوتا ہے۔ لائق شاگرد کا نام نہایت محبت اور عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔

مرزا کو خان آرزو کے ساتھ شرف تلمذ نہ تھا مگر اُن کی صحبت سے بہت فیضیاب ہوئے اور شعر گوئی میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ انھیں کی ہدایت کے موافق فارسی کو ترک کیا اور ریختہ کہنا شروع کیا۔ مگر فارسی کا شوق ان میں اس قدر سرایت کئے ہوئے تھا کہ اُس سے بالکل علیحدگی محال تھی۔ کچھ نہ کچھ ضرور کہتے تھے۔ چنانچہ ان کا مکمل دیوان، فارسی دیوان ریختہ کے شروع میں موجود ہے۔ مرزا کا کلام اس قدر مقبول اور ہر دلعزیز ہوا کہ گھر گھر اور کوچہ و بازار تک میں پھیل گیا۔ مرزا کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اُن کا کلام اُن کی زندگی ہی میں مشہور ہو گیا تھا۔ اور وہ مُسلّم الثبوت شاعر اُسی وقت مانے جاتے تھے اُن کی اُستادی کا چرچا اس قدر پھیلا کہ بادشاہ وقت شاہ عالم کو بھی اُن کی شاگردی کا شوق ہوا وہ اُردو اور فارسی خوب کہتے تھے اور آفتاب تخلص کرتے تھے آخر کار مرزا کے شاگرد ہوئے اور اپنا کلام اصلاح کے لئے دکھانے لگے کچھ عرصہ کے بعد مرزا کو اُن سے کسی خاص بات پر رنجش ہو گئی اور دربار آنا جانا چھوڑ دیا۔ مگر دہلی میں بہت سے ایسے قدردان رئیس امیر موجود تھے جنھوں نے استاد زمانہ کی دلجوئی اور خدمت کو اپنا فخر سمجھا اور اُن کے ساتھ

بڑی مہربانی اور عالی حوصلگی سے پیش آتے تھے۔ ایسے قدر شناسوں کی دریادلی اور قدردانی نے مرزا کو ایسا مستغنی اور فارغ البال کر دیا تھا کہ جب نواب شجاع الدولہ نے مرزا کے کمال کا شہرہ سن کر ان کو نہایت شفقت و محبت سے بلاوے کا خط لکھا اور زاد راہ بھی بھیجا تو مرزا نے ٹال دیا اور کمال استغنا سے یہ رباعی جواب میں لکھ بھیجی ؎

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک	آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہوئے	بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

تھوڑے دنوں کے بعد زمانہ نے پلٹا کھایا۔ دلی کی حالت بدل گئی۔ وہ پرانا وقت نہ رہا پرانے قدر دان یکے بعد دیگرے مرتے گئے۔ پرانے شرفا کے گھرانے آئے دن کے بیرونی حملوں اور مرہٹوں کی قتل و غارت سے برخاستہ خاطر اور پریشان ہو گئے اسی کے ساتھ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو بھی خطرہ میں تھی اور وہ قدر دان اور فن کے جوہری بھی باقی نہیں رہے تھے اس وجہ سے شعرائے باکمال نے دلی کو خیرباد کہا مرزا بھی اسی نازک وقت میں اس تباہ قافلے کے ساتھ دہلی سے نکلے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی فرخ آباد پہونچے۔ نواب احمد خاں بنگش غالب جنگ برسر حکومت تھے۔ مہربان خاں رند ان کے دیوان تھے جو اہل علم و کمال کے قدر دان خود بھی شاعر تھے اور بقول میر حسن میر سوز و میرزا سودا سے تلمذ تھا چند سال تک مرزا فرخ آباد رہے۔ انھوں نے مہربان خاں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں ۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں مر گئے تو سودا بھی فیض آباد چلے گئے اور نواب شجاع الدولہ کے زمرۂ ملازمین میں داخل ہو گئے۔ جب سلطنت کا مرکز لکھنؤ قرار پایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔

تھوڑے دنوں کے بعد نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور نواب آصف الدولہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو اس زمانہ میں مرزا سے اور ایک فارسی شاعر فاخر مکین سے شعر و شاعری کے معاملہ میں کچھ نزاع ہو گئی جس نے طول پکڑ کر ایک

سخت جھگڑے اور باہمی جنگ کی صورت اختیار کی اُس کا تصفیہ نواب سعادت علیخاں نے جو اُس وقت ولیعہد سلطنت تھے نواب کے روبرو مرزا کی موافقت میں کرا دیا بسابق کی شکر رنجی جاتی رہی خطاب ملک الشعرائی اور چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ عطا ہوا پھر تو نواب آصف الدولہ مرزا پر نہایت شفقت اور عنایت کی نظر فرمانے لگے اور اتنا ارتباط بڑھ گیا کہ اکثر اوقات مرزا کی پُر لطف صحبت اور انکی بذلہ سنجیوں کو جملہ کاموں پر یہاں تک کہ بسا اوقات محل کے عیش و آرام پر ترجیح دیتے تھے۔ مرزا کا انتقال لکھنؤ میں ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں ہوا۔ بہت سے معاصرین اور نیز مابعد کے شاعروں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں۔ مصحفی۔ منت۔ ناسخ۔ نساخ کی تاریخیں مشہور[1] ہیں۔

تصانیف | مرزا کی تصانیف جمیع اقسام سخن میں بکثرت حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک مختصر دیوان فارسی جس میں ردیف وار غزلیں ہیں۔

(۲) چند فارسی قصائد۔

(۳) دیوان اُردو مکمل جس میں علاوہ غزلوں کے رباعیات، قطعے، تاریخیں، مخمس، ترجیع بند، واسوخت، مستزاد، تضمین، غرض ہر قسم کا کلام ہے۔

(۴) چوبیس مثنویاں یعنی مختلف منظوم حکایتیں اور لطائف جن میں اُن کی دلچسپ اور مشہور ہجویں اور پہیلیاں ہیں۔

(۵) تضمین بر کلام میر۔ اور دو خط بنام میر ایک نظم اور ایک نثر میں (اُن کے کلیات میں نہیں ہیں)

(۶) قصائد امرائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ اور نواب آصف الدولہ کی تعریف میں۔

(۷) سلام اور مرثیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں۔

---

[1] ایک تاریخ یہ ہے سنہ خلد کو جب حضرت سودا گئے ؛ فکر میں تاریخ کی ماہر ہوا ؛ بولے منصف دُور کر پاے عناد ؛ شاعران ہند کا سردر گیا۔

۸ قصائد ائمہ معصومین علیہم السلام کی منقبت میں۔

۹ ایک رسالہ نثر میں موسوم بعبرۃ الغافلین۔ مرزا فاخر مکین کے اعتراضوں کا جواب ہے جو اُنھوں نے فارسی کے شعراے سلف پر کیے تھے۔

۱۰ میر تقی میر کی مشہور مثنوی شعلۂ عشق کا ترجمہ نثر میں (اُن کے کلیات میں نہیں ہے

۱۱ ایک تذکرۂ شعراے اردو کا۔ جواب نہیں ملتا۔

سودا کا مرتبہ شاعری میں سودا اپنے زمانہ کے بہت بڑے اُستاد مانے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میر اور سودا دونوں زبان اُردو کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی بے نظیر اور بے عدیل تھے اور اُن کے بعد بھی ان کا ایسا کوئی نہیں ہوا۔ اُن کی خدمات زبان اور شاعری اور فن نظم کے ساتھ بہت قابل قدر ہیں اُن کی اصلاح زبان کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہے۔

ان کی خدمات زبان کے ساتھ مرزا نے اکثر ہندی الفاظ کی درشتی کو دور کرکے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی۔ میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا اس کو ریختہ کا مرتبہ بخشا چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

کہے تھا ریختہ کہنے کو عیب ناداں بھی		سو یوں کہا میں کہ دانا ہنر لگا کہنے
بساں مہر یہ روشن ہے سارے عالم پر		جہاں میں جیسے کہ میں شعر تر لگا کہنے
	ولہ	
سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کوئی سودا		پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال		یہ سنگریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

شاعری کی صناعیوں سے اِس میں طرح طرح کی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں فارسی سے بکثرت الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرز تخئیل اور تلمیحات زبان اُردو میں داخل کیے اور اس اُستادی سے داخل کیے کہ اُس کے جزو ہو گئے

اور اس کی وسعت اور لوچداری اتنی بڑھ گئی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ ہر ادبی کام اُس سے لیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے فارسی کی روش پر ایجاد کئے جس میں سے بعض تو مقبول ہوئے اور بعض کو آیندہ نسلوں نے ناپسند اور متروک کیا۔ کیا اچھا ہوتا اور ہماری زبان کی کتنی خوش نصیبی ہوتی اگر ان خدایان سخن کو وہی توجہ جو فارسی کے ساتھ تھی بھاشا کے ساتھ بھی رہی ہوتی جس کا نتیجہ لازمی یہ ہوتا کہ دیسی زبان کے لفظ بجائے اجنبی الفاظ کے کثرت سے داخل ہوئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کی قوت ایجاد و انتخاب اور قابلیت اس اعلیٰ درجہ کی تھی کہ جو چیزیں داخل کیں اُن پر طغرائے قبول فوراً ثبت ہو گیا اور اب وہ ہماری زبان کا جزو لانیفک بن گئیں۔

یہ بات بھی قابل داد ہے کہ فارسی روایات اور تلمیحات کے ساتھ ہندوستان کی قدیم روایات و الفاظ بھی بھلائے نہیں گئے مثلاً الفاظ جھجل۔ پربت۔ رائی۔ وغیرہ اور ہندی علم الاصنام میں ارجن کی بہادری کنھیّا کا عشق وغیرہ جو اُن کے کلام میں بڑا لطف دیتے ہیں۔ یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ کم سے کم اس زمانہ میں مادر وطن کے ساتھ تعلقات کو پختہ کرنے کا خیال ہمارے شعرائے اردو کے دل میں بہت کچھ تھا جو افسوس ہے کہ متاخرین نے حقارت کے ساتھ دل سے فراموش کر دیا۔ مرزا کو اکثر مناسب ہندی الفاظ بھی ہندی خیالات کے اظہار کے لئے اختراع کرنا پڑے اور اس کوشش میں اُن کو اپنے معاصرین سے سخت مخالفتیں اور دقتیں اُٹھانا پڑیں مرزا کے عہد میں قدیم ایہام گوئی اور دوہروں کا رواج جو متقدمین کی یادگار ہیں سے

محبت کے کروں جھجل گئی میں تعریف کیا یارو	ستم پربت ہو تو اس کو اٹھا لیتا ہے جوں رائی
نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اُس کو نہ دیکھا ہو	کنھیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا ہے ہر جائی
ترکش الینڈ سینہ عالم کا چھان مارا	مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بالکل متروک ہو گیا تھا چنانچہ سودا خود فرماتے ہیں ؎

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اور اُن کے ہمعصر میر کہتے ہیں۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

مگر فارسی اور ہندی الفاظ کو ملانے کی دقت رفع نہیں ہوئی تھی۔ اور آخری منازل ترقی اُردو شاعری کے واسطے ہنوز باقی تھے۔ مرزا کے کلام کو اس نقطۂ نظر سے جانچنا بہت ضروری بات ہے۔ جو خدمات زبان کے ساتھ اُنھوں نے انجام دیں اور جو قوت زبان پر اُنھیں حاصل تھی اس کا اعتراف اُن کے معاصرین مثلاً میر، و میر حسن، مصحفی وغیرہ نے بخوبی کیا ہے اور اُن کی قابلیت، و کمال کی دل سے داد دی ہے۔

اُن کی خدمات شاعری کے ساتھ | جو بنیادیں ولی اور شاہ حاتم نے قائم کی تھیں اُنھیں پر سودا نے اپنا رفیع اور شاندار ایوان شاعری تیار کیا۔ علاوہ کمال فن کے وہ دو چیزوں کے موجد بھی تھے۔ یعنی قصیدہ اور ہجو۔ ہر چند کہ یہ دونوں صنعتیں فارسی میں نہایت مکمل اور باقاعدہ صورت میں اور اُردو میں بھی ایک ابتدائی اور ناکمل حالت میں موجود تھیں مگر اُنھوں نے یہ کمال کیا کہ ان کو اُردو میں درجۂ کمال تک پہونچا دیا۔ اور ایسا کر دیا کہ اُن کی برابری اور ہمسری کا خیال تک بعد کے شاعروں کے لئے محال ہو گیا ہر چند کہ اکثر شعرا نے اُن کی پیروی کی اور اُن کے قدم بقدم چلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے اور مرزا دونوں اصناف سخن میں متفرد ہی رہے ہیں۔

قصیدہ و مرثیہ | اُن کے اُردو قصائد بڑے بڑے فارسی اُستادوں کے قصائد کے ٹکر کے ہیں اور بعض تو عرفی و خاقانی کے معرکۃ الآرا قصیدوں کو بھلا دیتے ہیں۔ نزاکت خیال

اور طرفگی مضامین میں وہ اکثر اہل عجم سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ یہی حالت
اُن کے مراثی کی بھی سمجھنی چاہیئے۔ مرزا سے پہلے گو مرثیہ گو اردو میں بہت گزرے ہیں
مگر اُن کے کلام میں سوائے مذہبیت کے کوئی شاعرانہ رنگ، کوئی جدت اسلوب، کوئی
نئی بات نہ تھی جو زمانۂ موجودہ کے ترقی یافتہ مذاق کو بھلی معلوم ہو۔ مرزا ہی وہ صاحب ایجاد
ہیں جنھوں نے اس فن خاص میں بھی اپنے زمانہ کے اعتبار سے کمال حاصل کر لیا۔
بلکہ سچ پوچھو تو اپنے بعد آنے والوں کے واسطے ترقی کی راہیں کھول گئے۔

ہجو مرزا صاحب نے ہجوؤں کے دفتر کے دفتر لکھ کر رکھدیے ہیں۔ اُن لوگوں پر تو
ضرور افسوس ہوتا ہے جن کے دلوں پر یہ آرے چلے ہوں گے مگر ہمارے واسطے وہ
ایک زعفران زار چھوڑ گئے جو ابد الآباد تک شاداب و سرسبز رہے گا۔ اُن کے اہاجی
میں وہ گرمی کلام اور تیزی ہے جس سے وہ ظرافت و مذاق کا ایک دائمی ذخیرہ
بن گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس صنف سے اُن کی خلقی مناسبت بلکہ قدرتی خصوصیت
تھی جیسا کہ اُن کے خود ایک شاگرد نے اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

کی ہجو ہر ایک شخص کی ہر چند کہ اُس نے	پر اُس سے طرف اس کے نہ عائد ہوئی تقصیر
ہے ایک سبب یہ کہ وہ خود آپ مُغل تھا	اور جتنے بزرگ اُسکے تھے مغلوں کے تھے وہ پیر

بڑھاپے میں بھی ان کی زندہ دلی اور مزاج کی شگفتگی ایسی تھی کہ جو بات دل پر آ جاتی تھی
اُس کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ کسی انعام کا لالچ یا انتقام کا خوف اُن کو اپنے
دل کی بھڑاس نکالنے سے روک نہ سکتا تھا۔ جہاں کسی سے اَن بَن ہوئی فوراً اُن کا
غلام "غنچہ" قلمدان و کاغذ کا سامان گل تراشی لیے ہر وقت موجود تھا اور پھر وہ وہ
گُل بوٹے تراشے جاتے تھے کہ جن کو دیکھ کر لوگ اپنی آنکھیں اور سُن کر اپنے کان بند
کر لیتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں سے اس مبتذل صنف کو بھی ایک باقاعدہ
اور مکمل فن بنا دیا۔ وہ زمانہ کی خرابی اور گمراہیوں کی پردہ دری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں

رکھتے۔ ایک انگریز نقاد کا قول ہے کہ "جس طرح روما الکبریٰ کے زوال کی تصویروں کے واسطے ہم جوونیال ایسے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں اسی طرح ہم کو اگر زوال دولت مغلیہ کی سچی تصویریں دیکھنا ہیں تو ہم کو چاہئیے کہ سودا کی اُن پرآشوب نظموں کا مطالعہ کریں جس میں اُنھوں نے مرہٹہ سواروں کی عین قلعۂ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارتگری کا سچا فوٹو اُتارا ہے یا جس میں زمانہ کی پرآشوب حالت اور امرائے دہلی کی تباہی و بربادی اور کس مپرسی کا بیان نہایت پرزور اور دردناک طریقہ سے کیا ہے۔ یا مثلاً وہ نظم جو ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد کے نام سے مشہور ہے جس میں چوری کی کثرت شہر کی بدامنی اور کوتوال شہر کی کمزوری کس پُر مذاق اور موثر طریقہ سے بیان کی ہے"۔ یہ سچ ہے کہ مرزا سے پہلے بھی بعضوں نے ہجویں کہی ہیں مگر بہت کم اور بے قاعدہ۔ میرزا کے یہاں وہ ایک صنف کلام اور مقابلہ کا ایک ایک زبردست ہتھیار بن گئی۔ میر حسن کے پدر بزرگوار میر ضاحک، فدوی پنجابی، مرزا فاخر مکین، بقا، اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی باری باری سب مرزا کی زد میں آئے اور اُن بیچاروں نے حرکت مذبوحی میں کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے اور اپنی بساط کے موافق کہا مگر ان کا کہا کسی نے نہ سُنا۔ مرزا کا کہا بچّے بچّے کی زبان پر ہے۔ کثرت اہاجی سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کو اس چیز سے خاص اُنس تھا اور اس میں اُن کو بڑا مزا آتا تھا۔ ان کی ہجویں کچھ معمولی نظمیں نہیں ہیں بلکہ اُن سے اُن کی قوت بیان، قدرت زبان، اور معاملات دنیاوی میں ان کی وسیع معلومات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ وہ جب کسی کی ہجو لکھتے ہیں تو اُس چیز کی جزئیات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ دو متضاد چیزیں درد و اثر اور تمسخر و مذاق کو یکجا کر دیتے ہیں اور سُننے والے پر غضب کا اثر پڑتا ہے۔ جس چیز کا خاکہ اُڑاتے ہیں اُس میں فارسی وغیرہ کی تقلید نہیں

دیکھو فٹ نوٹ صفحہ (۱۱۷)۔

ہوتی. مضمون اچھوتے اور پھڑکا دینے والے ہوتے ہیں. مرزا میں جو ونیالؒ والٹیئرؒ اور سویفٹؒ تینوں کا مزا ہے. ایڈیسنؒ کی متانت اُن میں مطلق نہیں. اُن کی ہجو میں پھکڑپن کے ساتھ طعن و تشنیع بھی بہت ہے. اُن کے الفاظ میں دل لگی اور مذاق کی

لہ "جولیس جو ونیالس" روما کا مشہور ہجو نگار شاعر تھا. سنہ پیدائش تقریباً ۶۰ عیسوی اور سنہ وفات ۱۲۸ عیسوی ایک امیر آدمی کا لڑکا فن شعر اور انشاء میں کمال رکھتا تھا. اس کی سولہ کتابیں مختلف مضامین پر موجود ہیں جن میں ہجو کا نمبر سب سے بڑا ہوا ہے. زمانہ کی سوسائٹی کی بد اخلاقی اور خرابی پر شہر آشوب کی صورت پر جو مضمون لکھے ہیں وہ نہایت سخت اور زوردار زبان میں ہیں جس کے بعض جملے ضرب المثل ہو گئے ہیں.

لہ پورا نام "فرانسوے ماری والٹیئر" فرانس کا مشہور شاعر ڈراما نویس اور ناقد گزرا ہے بسنہ ۱۶۹۴ء سن ولادت اور ۱۷۷۸ء سنہ وفات. فن شعر اور تنقید میں یکتائے زمانہ تھا. مرزا غالب کی طرح اُس کے بھی خطوط نہایت دلچسپ اور انشاپردازی کے بہترین نمونے ہیں اس کے کلام میں ذہانت و طباعی اور انتہائی درجہ کی طعن آمیز شوخی اور ظرافت پائی جاتی ہے نہایت آزاد خیال واقع ہوا تھا. مذہب کے ساتھ اسکی بے پروائی شوخی اور طعن آمیز جملے مشہور ہیں. اُس کا ڈراما موسوم بہ "محمد" ایک مشہور کتاب ہے.

لہ "جانتھن سویفٹ" والٹیئر کا معاصر ہے. مشہور آیرش افسانہ نویس اور ہجو نگار تھا. برخلاف والٹیئر کے یہ مذہب کا پابند بلکہ پادری تھا. "بیٹل آف دی بکس" (کتابوں کی جنگ) اور "گلیور کے سفر" اس کی مشہور تصانیف ہیں. ملکی سیاسیات میں بھی بہت حصہ لیتا تھا. اس کی تصانیف میں بے انتہا شوخی، مذاق اور طنز ہے مثلاً جب آئرلینڈ کے قصابوں کا جھگڑا پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اس نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام "معقول تجویز" رکھا جس میں تجویز تھا آئرلینڈ کی مصیبت دُور کرنے کی سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ اس ملک کے بچے حلال کر کے ان کا گوشت بازار میں بیچا جائے یہ مضمون نہایت پُر مذاق اور طنز آمیز ہے. عبارت نہایت صاف سادہ بلا کسی تصنع کے لکھتا تھا جس کی وجہ سے اس کی تمام تصانیف مقبول عام ہیں۔

لہ جوزف ایڈیسن انگلستان کا سب سے بڑا مشہور مضمون نگار اور نثار گزرا ہے اسکی مشہور کتاب "اسپکٹیٹر" بہترین ذخیرہ اخلاقی سیاسی اور معاشرتی مضامین کا ہے جن کی سلاست اور شیرینی زبان انگریزی میں مشہور ہے وہ بھی اپنے کلام میں ایک خاص قسم کی ظرافت اور مذاق سے کام لیتا ہے مگر اس سے کسی کا دل نہیں دُکھتا اُس کے کلام میں نہایت متانت اور سنجیدگی ہے برخلاف سویفٹ کے جس کے یہاں طعن و تشنیع بہت ہے ۱۲

نہ میں ایسی کاٹ اور بُرش ہے جو دل کے اندر اُتر جاتی ہے۔ آزاد نے سچ کہا ہے کہ "جس کے پیچھے پڑتے تھے اس کو پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تھا۔"

کلام پر رائے | مرزا کو زبان پر پوری قدرت اور شعر پہ پوری حکومت حاصل تھی۔ مشکل سے مشکل زمینیں اُن کے سامنے پانی اور ادق مضامین اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اشعار سب کیل کانٹے سے درست، بندش چُست، زوائد و بھرتی کا نام نہیں۔ کلام سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا ہے الفاظ کو اپنے مقام پر ایسا رکھتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے جاتے ہیں اگر کوئی لفظ بھول جاؤ تو دوسرا لفظ اسکی جگہ پر نہیں رکھ سکتے۔ اگر لفظ اِدھر سے اُدھر رکھ دو تو شعر کا لُطف اور مزا جاتا رہے گا۔ کلام ٹھوس اور زور فصاحت سے بھرا ہوا ہے۔ نئی نئی بحریں اور شگفتہ زمینیں نئے نئے ردیف اور قافیے ایسے کہہ گئے ہیں کہ اب تک دل مزے لیتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں بھی ایسے ایسے شعر نکالے ہیں جس طرح پتّھر سے چشمہ نکلتا ہے۔

سودا کا اثر بعد کے شعرا پر | مرزا کا اثر اپنے زمانے کے اور نیز بعد کے شعرا پہ بہت کچھ پڑا۔ اُن کے اشعار پڑھ کر بہت سی منچلی طبیعتوں میں شعر گوئی کا شوق اور مادّہ پیدا ہو گیا۔ اِس خاص صفت کے اعتبار سے ان کو اُردو شاعری میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اسپنسر[1] کو انگریزی میں ہے جو شاعروں کا شاعر کہلاتا ہے۔ معاصرین سے قطع نظر غالب اور ذوق وغیرہ بھی سب اُن کو مانتے تھے اور اُن کے کلام سے مستفیض ہوتے تھے۔ ناسخ کا قول اوپر نقل ہو چکا ہے۔ غالب ایسا جادو نگار سودا کا قائل ہے اور اُستاد ذوق کا تو پورا کلام مرزا کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے علی الخصوص اُن کے قصائد میں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے قصائد سامنے رکھ کر کہے گئے تھے۔ مرزا کے کلام میں بسبب تنوع کے اس قدر

---

[1] اڈمنڈ اسپنسر سولھویں صدی عیسوی کا نامور انگریزی صاحب تصنیف شاعر ہے اسکی کتاب "فیری کوئن" (پری ملکہ) ایک مشہور نظم ہے۔ اس نے قدیم لاطینی اور یونانی بحریں نظم انگریزی میں رواج دیکر انگریزی شاعری کا پایہ بلند کیا۔

مقبولیت اور دلچسپی ہے کہ ہر شخص خواہ وہ شاعر ہو یا غیر شاعر اُس کو پڑھتا ہے اور اُس پر وجد کرتا ہے۔ بعض اشعار میں تو حقیقی شاعری کے ایسے سچے جذبات دکھائے ہیں جو دیگر شعرائے اُردو کے کلام میں کمیاب ہیں۔ البتہ انگریزی میں شیلی[۱] اور کیٹس[۲] کے یہاں بہت کچھ ہیں۔ غرض کہ میر و مرزا دونوں ایسے صاحب کمال تھے جن کا کلام بعض اس زمانہ کے الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر زبان کی صفائی اور شیرینی اور خیالات کی بلندی اور پاکیزگی دونوں اعتبار سے اُردو شاعری کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے اور اس زمانہ میں بھی کسی شعر کی سب سے بڑی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ان قادر الکلاموں کے کسی شعر کے قریب پہونچ جائے۔ سودا کی اُستادی اور ملک سخنوری کی بادشاہت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے وہ قدرتی شاعر تھے اور جذبات شاعری اُن کے خمیر میں پڑے تھے میر ایسا نازک دماغ اور دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والا شخص ان کو پورا شاعر مانتا ہے اور ان کو ملک الشعرائی کا مستحق قرار دیتا ہے۔ مرزا کے کلام سے ظاہر و باہر ہے کہ اُن کا دل جذبات سے کس درجہ متاثر ہوتا ہے۔ اُن کے اشعار میں ترشے ہوئے نگینوں کی سی آبداری اور انعکاس اور اُن کا دماغ اعلیٰ تخئیل سے روشن ہے۔ مرزا میں چند خاص باتیں ہیں جو اُن کے کلام کو جملہ شعرائے ماضی و حال سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

(۱) زبان پر کامل قدرت۔ جس سے کلام کا زور، مضمون کی لطافت اور نزاکت

---

[۱] سو برس اُدھر کا ایک مشہور رنگین طبیعت اور عاشق مزاج انگریزی شاعر تھا تیس برس کے سن میں جوانا مرگ مرا، نہایت آشفتہ مزاج اور آزاد خیال آدمی تھا جو اس کی بدنامی کا بھی باعث ہوا۔ اس کی تصانیف میں کوئن میب (ملکہ میب) الاسٹر (گنج تنہائی) اور ریولٹ آف اسلام مشہور ہیں اُس کے خیالات نہایت شاعرانہ اور بلند ہوتے تھے ۱۲۔

[۲] شیلی کا معاصر تھا اور مثل اُسی کے نوجوان مرا۔ اس کی کتاب، انڈائمین، نہایت دلچسپ ہے۔ نازک خیال اور رنگین طبیعت شاعر تھا وہ خود نہایت حسین اور حُسن کا عاشق تھا ۱۲۔

سے مل کر عجب لطف و اثر پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) بندش کی چستی اور الفاظ کی نشست و ترکیب جس سے شعر میں ڈھیلا پن اور سستی مطلق باقی نہیں رہتی بلکہ اُس میں تلوار صفاہانی کی سی آبداری پیدا ہو جاتی ہے نشست الفاظ کی یہ صفت ہے کہ اگر کوئی لفظ اِدھر اُدھر ہو جائے تو شعر بے مزہ بلکہ مہمل ہو جائے گا صنعت کی خوبی سے صناع کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔

(۳) خیالات کی بلندی اور نزاکت ہے۔ البتہ کچھ استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیتے ہیں مگر صرف اسی قدر کہ شعر کا حسن بڑھ جائے اور سامع کو مطلب ٹٹولنا نہ پڑے اُن کا سامان زینت شعر کے حقیقی حسن کو کبھی نہیں چھپاتا۔ ان کی طبیعت ایک رنگ کی پابندی نہ تھی۔ جو بات اور لوگوں کو سخت کاوش اور محنت سے میسر ہوتی تھی وہ اُن کو ایک جنبش قلم سے حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ تخیل اور قدرت زبان کا اثر تھا۔

(۴) چوتھی چیز اُن میں تصفیہ زبان ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں نے زبان کو پاک صاف اور نیز وسیع کیا ان سب میں مرزا کا نمبر اوّل ہے۔ بقول مصنّف آب حیات جس طرح کیمیا داں دو مادّوں سے تیسرا مادّہ تیار کرتے ہیں انھوں نے فارسی اور ہندی کے امتزاج سے ایک تیسری زبان پیدا کی جسے مقبولیت عام حاصل ہوئی۔

مرزا کے کلام پر شعرا کی رائیں

اب بے موقع نہ ہوگا کہ مرزا صاحب کے متعلق ان کی اور نیز ان سے بعد کے شعراء اور تذکرہ نویسوں کی بھی قیمتی اور قابل قدر رائیں بلکہ اُن کا اقتباس یہاں تحریر کیا جائے۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں اُن کی نسبت فرماتے ہیں۔ خود انھیں کی زبان سے سُنیے "مرزا رفیع متخلص بہ سودا جوانے است خوش خلق و خوش خو، گرم جوش یار باش، شگفتہ رو .... غزل و قصیدہ و مثنوی وقطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گوست۔ ہر شعرش طرف لطف آراستہ۔ در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔

ہر مصرعۂ برجستہ اش راسر و آزاد بندہ پیش طبع عالیش فکر عالی شرمندہ۔ شاعر ریختہ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید قصیدۂ درہجو اسپ گفتہ موسوم بہ تضحیک روزگار دور از حد مقدور و رد صنعتہا بکار بردہ۔ اکثر اتفاق طرح غزل باہم می افتد۔ غرض از مغتنمات روزگار ست حق تعالیٰ سلامتیش دارد۔"

اسی طرح مرزا قتیل چار شربت میں مرزا کے قصائد کی نسبت لکھتے ہیں کہ سودا کا مرتبہ قصائد میں ظہوری کے برابر ہے۔ سوائے اس کے کہ دونوں کا طرز الگ الگ ہے۔ اور کوئی فرق نہیں ہے" اس تنقید پر مصنف آب حیات کی رائے ہے کہ "مرزا قتیل جو چاہیں کہیں مجھ بے کمال نے ظہوری کی غزلیں اور قصائد تھوڑے بہت پڑھے ہیں دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم معلوم ہوتے ہیں مرزا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے جو قصائد اور ہجو اور نیز محاورے اور زبان دونوں کا بادشاہ ہے" اسی طرح صاحب طبقات الشعراء مرزا کے قصائد کو عرفی اور خاقانی کے قصائد سے اور اُن کی غزلوں کو سلیم و کلیم کی غزلوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ پرگو بھی تھے اور خوش گو بھی تھے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "مرزا سودا کے مقابلہ میں ابتک کوئی شخص ہندوستان سے نہیں اٹھا اور وہ موسیقی کے بھی ماہر تھے اور فقیر اُن کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا ہے اور وہ میرے اوپر کرم فرماتے ہیں" حکیم قدرت اللہ خاں بقا اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "مرزا محمد رفیع سر آمد شعرائے فصاحت ہیں بعض کے نزدیک وہ غزل گوئی میں میر تقی میر کو نہیں پہونچتے۔ سچ یہ ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ مرزا ایک بے کنار سمندر اور میر ایک عظیم الشان دریا ہیں۔ قواعد کی معلومات میں میر صاحب کو مرزا صاحب پر برتری ہے اور قوت شاعری میں مرزا صاحب کو میر صاحب پر فوقیت ہے" تذکرۂ گلشن بنجار میں ہے کہ "فقیر کی دانست میں اُن کی غزلیں اُن کے قصیدوں سے

اور اُن کے قصیدے اُن کی غزلوں سے بہتر ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ غزلوں میں بھرتی کے اشعار ہیں اور قصائد اِن سے خالی ہیں تو میں کہوں گا کہ اُن کے دیوان کو سمجھ کر پڑھنے والوں پر اس رائے کی قباحت ظاہر ہو جائے گی"۔ پروفیسر شہباز شمس العلما نواب امداد امام صاحب اثر کا قول نقل کرتے ہیں کہ سودا اردو کے شکسپیر تھے۔ اسی طرح سر الفرڈ لائل سودا کو زبان اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں

کلام میں کمی | مرزا میں دو تین کمیاں بھی ہیں (۱) اُن کا کلام کم و بیش تصوف کی چاشنی سے خالی ہے جس کا اُن کے اکثر ہمعصروں میں بہت زور تھا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ اور ذوق معاملات دنیاوی تک محدود ہے (۲) دوسرے لطفِ غزل ان میں کم ہے یعنی ان کی غزلوں میں وہ سوز و گداز اور رنگی اور سادگی نہیں جو غزل کی جان ہے۔ اِس کا مفصل ذکر انشاء اللہ میر تقی میر کے حالات میں آئے گا جہاں ان دونوں کی شاعری کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

میر حسن متوفی ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء میر غلام حسن متخلص بہ حسن معروف بہ میر حسن میر غلام حسین ضاحک کے وہ بلند اقبال صاحبزادے تھے جن کے بیٹے خلیق اور پوتے میر انیس ہوئے جو فلک شاعری پر آفتاب بن کے چمکے۔ ان کے اجداد شہر ہرات کے مشہور خانوادۂ سادات سے تھے۔ جدّ اعلی میر امامی نام ہندوستان آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

میر حسن اپنے زمانہ کے نامی گرامی شاعر جیّد فاضل اور مشہور خوشنویس تھے۔ اور ان کمالات کی وجہ سے اپنے ہمچشموں اور ہمعصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اُن کے والد میر ضاحک نہایت زندہ دل ظریف اور باغ و بہار آدمی تھے۔ جیسا کہ اُن کے تخلص سے ظاہر ہے۔ میر حسن کی ولادت پرانی دلّی کے محلۂ سیّد واڑہ میں ۱۱۴۰ھ میں ہوئی اور بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ اور

کلام بھی اُنھیں کو دکھایا اُس کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوے. دلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد آئے. راستہ میں تھوڑے عرصہ تک ڈیگ میں قیام کیا ایک مرتبہ شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ سفر کیا جس کا مفصل حال اپنی مثنوی گلزار ارم میں قلمبند[1] کیا ہے۔

فیض آباد میں پہونچ کر نواب سالار جنگ بہادر برادر بہو بیگم صاحبہ کی ملازمت اختیار کی اور اُن کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں بھی چند دن رہے۔ جب نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ؁ میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اور فیض آباد بدل کر لکھنؤ دار السلطنت ہو گیا تو میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے اور تھوڑے دن قیام کر کے ہیں ماہ محرم ۱۲۰۱ھ؁ میں انتقال[2] کیا۔ بروقت وفات عمر پچاس سال سے متجاوز تھی مصحفی نے تاریخ کہی "شاعر شیریں بیان" جس سے تاریخ ۱۲۰۱ھ؁ نکلتی ہے۔ مرزا علی لطف ۱۲۰۵ھ؁ لکھتے ہیں۔ جو زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

تعلیم اور شاگردی میر حسن عربی کم جانتے تھے۔ مگر فارسی میں کمال حاصل تھا۔ اور اس زبان میں کمال بے تکلفی اور سادگی سے لکھتے تھے۔ چنانچہ ان کا "تذکرہ شعرائے اُردو" جو نہایت اعلیٰ درجہ کی فارسی میں ہے اس کا شاہد ہے۔ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے مصنف آبحیات لکھتے ہیں کہ سودا کے شاگرد تھے۔ میر تقی لکھتے ہیں جوان اصلے است نوکر پیشہ اکثر در بندہ خانہ در تقریب مجلس تشریف می آرد وضع مرد آدمیانہ می دارد مشق شعر از مرزا رفیع می کند" میر حسن خود اپنی نسبت لکھتے ہیں "اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز او شان از من کما حقہٗ سر انجام نیافت۔ بر قدم دیگر بزرگان مثل

---

[1] گلزار ارم میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف ہے۔ اس مثنوی کا ایک نہایت صحیح اور خوشخط نسخہ کتب خانہ ندوہ میں موجود ہے۔ (تذکرہ گل رعنا)۔

[2] عقب باغ نواب قاسم علی خاں محلہ مفتی گنج (لکھنؤ) میں مدفون ہیں (تذکرہ خمخانۂ جاوید جلد ۲)

خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودہ ام" اس سے ظاہر ہے کہ وہ رسمی طور پر میر ضیاء الدین ضیاؔ کے شاگرد تھے اور تینوں اصحاب مذکورۂ بالا کی پیروی کرتے تھے۔ اور ممکن ہے مشورۂ سخن بھی کرتے ہوں۔ فطرتاً نہایت خوش مزاج ہشاش بشاش ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ ہزل اور فحش سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا نہایت شیریں زبان خلیق اور قابل تھے کسی شخص کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور نہ کسی تذکرہ نویس نے ایک حرف اُن کے خلاف لکھا ہے۔

طرز کلام | کلام نہایت سلیس اور صاف ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ غزل۔ رباعی۔ مثنوی۔ مرثیہ سب خوب کہتے تھے۔ البتہ قصیدہ زوردار نہ تھا مثنوی میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی مشہور مثنوی "سحرالبیان" معروف بہ "مثنوی میر حسن" اُردو میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اُن کی غزلیں میر سوز اور میر تقی میر کی غزلوں کا لطف دیتی ہیں۔ وہی عاشقانہ رنگ، وہی سادگی، وہی دلفریبی۔

میر حسن کے صاحبزادے | میر حسن کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین شاعر تھے میر مستحسن خلیق جو مصحفی کے شاگرد تھے۔ میر محسن محسنؔ۔ یہ دونوں نواب آصف الدولہ کی والدہ نواب بہو بیگم صاحبہ کے داماد مرزا احمد تقی کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے۔ تیسرے بیٹے میر احسن خلق نواب ناظر داراب علی خاں کی خدمت میں رہتے تھے۔ یہ سب اچھے شاعر تھے اور اپنے پدر بزرگوار کے رنگ میں کہتے تھے خلیق اور خلق کے دیوان بھی ہیں۔

تصانیف حسب ذیل ہیں

(۱) ایک دیوان غزلوں کا مشتمل بر جملہ اقسام سخن۔ ترکیب بند۔ مخمس۔ واسوخت مثلث وغیرہ جس میں فارسی شعر پر تیسرا مصرع خواہ فارسی میں یا اُردو میں لگایا ہے۔

(۲) گیارہ مثنویاں جس میں سے حسب ذیل نہایت مشہور ہیں:۔

(۳) مثنوی سحرالبیان یا قصۂ بنظیر و بدر منیر۔ لاجواب اور بے عدیل و بنظیر

مثنوی ہے۔ ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں تحریر ہوئی جیسا کہ قتیل اور مصحفی کی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور نواب آصف الدولہ بہادر کے نام نامی پر معنون ہوئی۔ اس میں شاہزادہ بےنظیر اور شاہزادی بدر منیر کے عشق کا افسانہ ہے جس میں ضمناً نہایت دلچسپ جزئیات مثلاً قدیم زمانہ کا لباس زیور شادی بیاہ کے رسوم، برات کا سامان وغیرہ وغیرہ نہایت خوبی سے بیان کیے ہیں۔ عبارت اس قدر صاف اور با محاورہ ہے کہ صدہا شعر محاورہ کی صورت میں زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ اس کا ہر مصرع لاجواب اور ہر شعر انتخاب ہے صفائی بیان، لطف محاورہ، شوخی مضمون قابل دید ہے سوال جواب کی نوک جھونک پر لطف مذاق کی باتیں ایسی ہیں جن کو پڑھ کے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور ان سب پر طرّہ یہ کہ کتاب کو لکھے ڈیڑھ سو برس ہو گئے۔ زبان وہی ہے جو ہم آپ بولتے ہیں۔ مولانا آزاد حیرت سے پوچھتے ہیں "کیا اُسے سو برس آگے والوں کی باتیں سُنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو اب ہم تم بول رہے ہیں" قصہ پُرانے رنگ کا ہے۔ اس کا ترجمہ نثر میں ایک شخص مسمّی میر بہادر علی نے ۱۲۱۷ھ میں کیا تھا جس کا نام نثر بےنظیر رکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ہم اصل مثنوی سے ایسے اشعار منتخب کر کے لکھیں جس سے قصہ کی تمام کڑیاں مل جائیں اور پورا قصہ بآسانی سمجھ میں آجائے۔

اختصار مثنوی میر حسن مسلسل بصورت افسانہ

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ — کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ

کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم — مگر ایک اولاد کا تھا الم

وزیروں کو ایک روز اُس نے بُلا — جو کچھ دل کا احوال تھا سو کہا

کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال — فقیری کا ہے میرے دل کو خیال

وزیروں نے کی عرض کاے آفتاب
نہ ہو ذرّہ تجھ کو کبھی اضطراب

یہ دُنیا جو ہے مزرع آخرت
فقیری میں ضائع کرو اُس کو مت

مگر ہاں جو اولاد کا ہے یہ غم
سو اِس کا تردّد بھی کرتے ہیں ہم

بلُاتے ہیں ہم اہل تنجیم کو
نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو

بلُا کر انھیں شہ کنے لے گئے
جو نہی روبرو سب وہ شہ کے گئے

کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا
چندرماں سا بالک ترے ہوے گا

یہ لڑکا تو ہوگا ولے کیا کہیں
خطر ہے اسے بارھویں سال میں

نہ آئے یہ خورشید بالائے بام
بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام

نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ
رہے بُرج میں یہ مہِ چاردہ

گئے نو مہینے جب اُس پر گذر
ہوا گھر میں شہ کے تولّد پسر

ہوا وہ جو اس شکل سے دلپذیر
رکھا نام اُس کا شہ بےنظیر

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی
کھُلی گلجھڑی غم کے جنجال کی

کہا شہ نے بلُوا نقیبوں کو شام
کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام

رعیّت کے خوش ہوں صغیر و کبیر
کہ نکلے گا کل شہر میں بےنظیر

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو
کہ بابا نہا دھو کے تیّار ہو

نہا دھو کے نکلا وہ گل اس طرح
کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

غرض ہو کے اس طرح آراستہ
خراماں ہوا سرو نوخاستہ

گھڑی چار تک خوب سی سیر کر
رعیت کو دکھلا کے اپنا پسر

اُسی کثرتِ فوج سے ہو سوار
پھرا شہر کی طرف وہ شہریار

قضارا وہ شب تھی شب چاردہ
بڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ

کچھ آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ
کہا آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ

خواصوں نے جا شاہ سے عرض کی　　کہ شہزادے کی آج یوں ہے خوشی

ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا　　کہ بھایا ہے عالم لب بام کا

کہا شہ نے اب تو گئے دن نکل　　اگر یوں ہے مرضی تو کیا ہے خلل

قضارا وہ دن تھا اسی سال کا　　غلط وہم ماضی میں تھا حال کا

زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا　　بچھونے پہ آتے ہی وہ سو رہا

قضارا ہوا اک پری کا گذر　　پڑی شاہزادے پہ اُس کی نظر

ہوئی لاکھ جی سے وہ اُس پر نثار　　وہ تخت اپنا لائی ہوا سے اُتار

محبت کی آئی جو دل میں ہوا　　وہاں سے اُسے لے اُڑی دلربا

قضارا کھلی آنکھ اس گل کی جو　　نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بُو

نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا　　تعجب سے اک اک کو تکتا رہا

اچنبھے کا یہ خواب دیکھا جو واں　　لگا کہنے یارب میں آیا کہاں

سرہانے جو دیکھی مہ چاردہ　　کہ ہے اجنبی سی وہ اک رشک مہ

کہا کون ہے تو یہ کس کا ہے گھر　　لے آیا مجھے کون گھر سے ادھر

پھرا منھ کو لے اور اُدھر سے نقاب　　دیا اُس پری نے یہ ہنس کر جواب

خدا جانے تو کون میں ہوں کہاں　　مجھے بھی تعجب ہے میں ہوں جہاں

یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں　　پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

چھڑا کر ترا تجھ سے شہر و دیار　　یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر وار

پری ہوں میں اور یہ پرستان ہے　　یہاں سب یہ قوم بنی جان ہے

غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں　　کہا اُس نے جو کچھ کہا اس کو ہاں

ولیکن نہ عقل و نہ ہوش و حواس　　رہے وحشیوں کی طرح وہ اداس

وہ تھی نازنیں بھی بہت عقلمند　　نہ کھلنے سے کچھ اُسکے ہوتی تھی بند

غرض ماہ رُخ اُس پری کا تھا نام — پدر سے کیا تھا یہ پوشیدہ کام
کہا ایک دن اُس نے اے بے نظیر — مرے دام میں تو ہوا ہے اسیر
تو اک رُک کے گر اپنے جی کو نہ بند — نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند
یہ گھوڑا تو کل دوں گی کل کا تجھے — ولیکن یہ دے تو مُچلکا مجھے
کہ گر شہر کی طرف جائے کہیں — و یا دل کسی سے لگائے کہیں
تو پھر حال ہو جو گنہگار کا — وہی حال ہو تجھ سے دلدار کا
کہا کیونکہ میں تم کو جاؤں گا بھول — مجھے جو کہا تم نے سب ہے قبول
یہ گھوڑا جو اُس کل کے تھا بخش کا — فلک سیر تھا نام اس رخش کا
سر شام وہ بے نظیر جہاں — اُسی رخش پر ہو کے جلوہ کناں
ہر اک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ — وہی اک پہر سیر کرتا تھا وہ
پہر جبکہ بجتا تو پھرتا شتاب — کہ پھر قہر تھا ماہ رخ کا عتاب
سنو ایک دن کی یہ تم واردات — اُٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
ہوا ناگہاں اُس کا اک جا گذر — سہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند — کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ — اُتر اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں — کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں
جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر — کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے اُتر
کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو — ذرا اچھل کے اس سیر کو دیکھ لو
یہ کہہ نیچے اترا دبے پاؤں وہ — نظر سے بچائے ہوئے چھانوں وہ
الگ کھول ہاتھوں سے واں کے کواڑ — چلا سائے سائے درختوں کی آڑ
تھے اک طرف گنجان باہم درخت — کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت

لگا وان سے چھپ چھپ کے کرنے نظر ۔ درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
جو دیکھی تو صحبت عجب ہے وہاں ۔ عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
ملی جنس کی اپنے جو اس کو بو ۔ لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سو
عجب صورتیں اور طرفہ محل ۔ بھلا دیکھتے ہی دل اُس کا نکل
گئی اُس کے عالم پہ جس دم نگاہ ۔ اور آئی نظر اُس میں اک رشک ماہ
برس پندرہ ایک کا سن و سال ۔ نہایت حسین اور صاحب جمال
دیے کُہنی تکیے پہ اک ناز سے ۔ سرِ نہر بیٹھی تھی انداز سے
خواصیں کھڑی ایدھر اودھر تمام ۔ ستاروں کا جوں ماہ پر ازدہام
قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام ۔ قیامت کرے جس کو جھک کر سلام
یہ قدرت کا دیکھا جو اس نے کمال ۔ کہا شاہزادے نے یا ذا الجلال
درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں ۔ کسی کی نظر جا پڑی ناگہاں
جو دیکھے تو ہے اک جوانِ حسین ۔ درختوں کی ہے اوٹ میں مہ جبیں
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن ۔ کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں ۔ اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں
گئے بات پر شاہزادی کے گوش ۔ یہ سنتے ہی جاتا رہا اس کا ہوش
کہا میں تو دیکھوں یہ کہہ کر اُٹھی ۔ گیا سنسنا جی تو رہ کر اُٹھی
خواصوں کے کاندھے پہ رکھ اپنا ہاتھ ۔ عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ
جو دیکھیں تو ہے اک جوان حسین ۔ کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مہ جبیں
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ۔ جوانی کی راتیں مرادوں کے دن
دیے عشق کی تیغ کھائے ہوئے ۔ کڑا دل کسی پر لگائے ہوئے
گئی اُس جگہ جب کہ بدرِ منیر ۔ اور اُس نے جو دیکھا شہ بے نظیر

گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل / نظر سے نظر، جی سے جی، دل سے دل
غرض بے نظیر اور بدر منیر / گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر
تھی ہمراہ اک اُس کی دخت وزیر / نہایت حسیں اور قیامت شریر
شتابی سے لا اُس نے چھڑکا گلاب / تب آئی تنوں میں ذرا اُن کے تاب
وہ اُٹھنے تو اُٹھی پہ حیران سی / گل شبنم آلودہ گریان سی
چلی اُس کے آگے سے مُنھ موڑ کر / وہیں نیم بسمل اُسے چھوڑ کر
غضب مُنھ پہ ظاہر نہاں دل میں چاہ / نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ
یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں / میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں / چھپی اپنے جا کر وہ دالان میں
کہ اتنے میں آئی وہ دخت وزیر / لگی ہنس کے کہنے کہ بدر منیر
مری طرف ٹک دیکھ تو ہائے ہائے / مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے
ترے گھر میں آیا ہے مہماں غریب / یہ ہے واردات غریب عجیب
شتابی سے مجلس کو تیار کر / تو اس گل سے گھر رشک گلزار کر
بُلا لائی جا اُس جواں کے تئیں / کیا میزباں میہماں کے تئیں

بلا اک مکاں میں بٹھایا اُسے / محل کا سماں سب دکھایا اُسے
کھلا بند جب دم در گفتگو / جواں نے حقیقت کہی مو بمو
پری کا بھی احوال ظاہر کیا / چھپے راز سے اس کو باہر کیا
کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے / زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے
رہی دل ہی دل میں غرض دل لگی بات / پہر بھر گئی اتنے عرصے میں رات
خبر رات کی سن اُٹھا بے نظیر / کہا اب میں جاتا ہوں بدر منیر

اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا ۔ تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا
بندھا پھر تو معمول اُس کا مدام ۔ کہ ہر روز آتا اُدھر وقت شام
پہر رات تک ہنسنا اور بولنا ۔ در عشق اور حسن کو کھولنا
کبھی ہجر سے اُن کا ہونا ملول ۔ کبھی وصل میں بیٹھنا پھول پھول
کسی دیو نے دی پری کو خبر ۔ کہ معشوق عاشق ہوا اور پر
یہ سن کر وہ شعلہ بھبوکا ہوئی ۔ لگی کہنے ایں یہ بلا کیا ہوئی
قسم مجھ کو حضرت سلیمانؑ کی ۔ ہوئی دشمن اب اس کی میں جان کی
کہا دیو سے تو مجھے دے بتا ۔ کہا وہ کسی باغ میں تھا کھڑا
کوئی نازنیں سی تھی اک اُسکے ساتھ ۔ کھڑی تھی دیے ہاتھ میں اسکے ہاتھ
قضارا اُڑا میں جو ہو کر ادھر ۔ یہ دونوں مجھے واں پڑے تھے نظر
یہ اڑتی سی سن کر خبر وہ پری ۔ کہا دیکھنے پاؤں اُس کو ذری
غضب ناک بیٹھی تھی یہ تو اِدھر ۔ کہ اتنے میں آیا وہ رشک قمر
بلا سی وہ دیکھ اس کے پیچھے پڑی ۔ کہا سُن تو اے موذی و بدعی
تجھے سیر کو میں نے چھوڑا دیا ۔ کہ اس مال زادی کو جوڑا دیا
مزا چاہ کا دیکھ اپنی ذرا ۔ جھنکاتی ہوں کیسے کنوئیں وہ بھلا
یہ کہہ اور بُلا ایک پریزاد کو ۔ کہا سُننا اِس کی نہ فریاد کو
اِسے کھینچتا یاں سے لے جا شتاب ۔ وہ صحرا جو ہے دور و محنت کا باب
کنواں اُس میں جو ہے مصیبت بھرا ۔ کئی من کا پتھر ہے واں پر دھرا
اِسے جا کے اُس چاہ میں بند کر ۔ وہی سنگ پھر اُسکے منہ پر تو دھر
سرِ شام کھانا کھلانا اُسے ۔ اور اک جام پانی پلانا اُسے
نہ دیجو سوا اس کے گر کچھ کہے ۔ یہی اُس کا معمول دائم رہے

کیا بند پھر جا کے اس چاہ میں
کنواں وہ جو تھا قاف کی راہ میں

پھنسا اس طرح سے جو وہ بے نظیر
پڑی بے قراری میں بدرِ منیر

کئی دن نہ آیا جو وہ رشکِ ماہ
نظر میں ہوا اس کے عالم سیاہ

لگی کہنے نجم النساء سے ہُوا
خدا جانے اس شخص کو کیا ہوا

کہا اُس نے بی تم کو سودا ہے کچھ
وہ معشوق ہے اُس کو پروا ہے کچھ

خدا جانے کس شغل میں لگ گیا
مری چڑ ہے اتنا بھی ہونا فدا

لگی کہنے تب اس کو بدرِ منیر
کہ سُنتی ہے اے میری دختِ وزیر

مجھے رات دن اس کا رہتا ہے ڈر
پری نے سُنی ہو نہ یاں کی خبر

نہ باندھا ہو اُس کو کسی شید میں
کیا ہو نہ ہو اُس کے تئیں قید میں

کئی منڈکری مار کر آخر کو لیٹ
چھپر کھٹ کے کونے میں مُنھ کو لپیٹ

ذرا آنکھ لگ گئی جو اس حال میں
تو دیکھا بہت اس کو جنجال میں

قضا نے دکھایا عجب اُس کو خواب
کہ دشمن نہ دیکھے یہ حالِ خراب

جو دیکھے تو صحرا ہے اک لق و دق
کہ رستم جسے دیکھ ہو جائے فق

نہ انساں ہے واں نہ حیواں ہے
فقط اک کفِ دستِ میدان ہے

مگر بیچ میں اس کے ہے اک کنواں
کہ اُٹھتا ہے آہوں کا واں سے دھواں

کنوئیں کا ہے مُنھ بند اُس سے اُڑی
کئی لاکھ من کی سِل اُس پہ پڑی

صدا واں سے آتی ہے بدرِ منیر
ترے چاہِ غم میں ہوا ہوں اسیر

میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جاں
کروں کیا کہ ہے مجھ کو قیدِ گراں

یکایک گئی آنکھ اتنے میں کھُل
پڑے اشک رخسار پر آ کے ڈھل

سُنا جب کہ نجم النسا نے یہ حال
ہوئی بیقراری تب اُس کو کمال

لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا
ترے واسطے میں نے یہ دکھ سہا

بس اب سر بصحرا نکلتی ہوں میں — اسے ڈھونڈھ لانے کو چلتی ہوں میں
کہا شاہزادی نے سُن اے رفیق — ہوئی میں تو اس چاہ میں غریق
بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو — کہ وہ ہے پری اور انسان تو
کہا اُس نے کیا کیجئے اب بھلا — پڑی اب تو ہے اپنے سر پر بلا
تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں — اس اندوہ کا مجھ کو یارا نہیں
یہ کہہ اُس نے زیور دُوا تار اسنگار — کیا اپنی پیشواز کو تار تار
پھر آئے جو کچھ اُس کے ہوش و حواس — سجا تن یہ جوگن کا اُس نے لباس
چلی بن کے جوگن وہ باہر کے تئیں — دکھاتی ہوئی چال ہر ہر کے تئیں
جُدا ہو کے القصہ روتوں کو چھوڑ — چلی اپنے گھر بار سے منھ کو موڑ
نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ نگل کی لی — نکل شہر سے راہ جنگل کی لی
لئے بین پھرتی تھی صحرا نورد — تن چاک چاک اور رُخ زرد زرد
قضارا سہانا سا اک دشت تھا — کہ اک شب ہوا اسکا واں بسترا
وہ تھی اتفاقاً شب چاردہ — اُداسے وہ بیٹھی تھی واں شک مہ
بچھا مرگ چھالے کو اور لیکے بین — دو زانو سنبھل کر وہ زہرہ جبین
کِدارا بجانے لگی شوق میں — لگی دست و پا مارنے ذوق میں
بندھا اس جگہ اس طرح کا سماں — صبا بھی لگی رقص کرنے وہاں
یہاں تو یہ عالم تھا اور طور یہ — تس اوپر مزا تم سُنو اور یہ
کہ تھا اک پری زاد فرخ سیر — جنوں کے وہ تھا بادشہ کا پسر
ہوا پر اُڑائے ہوئے اپنا تخت — کسی طرف جاتا تھا فیروز بخت
وہ جاتا تھا کرتا ہوا سیر راہ — اُسے لوگ کہتے تھے فیروز شاہ
یکایک سُنی بین کی جو صدا — وہاں تخت لا اپنا اُس نے رکھا

جو دیکھے تو جوگن ہے اک رشکِ حور
کہ چشمِ فلک نے نہ دیکھا یہ نور

نظر کر کے حسن اس کا غش کر گیا
تعشق کے عالم میں بس مر گیا

یہ سمجھا بناوٹ کا کچھ بھیس ہے
لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے

پڑا تم پہ ایسا کہو کیا بجوگ
لیا واسطے جس کے تم نے یہ جوگ

وہ سمجھی کہ دل اس کا آیا ادھر
کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر

کہا ہنس کے جوگن نے سر بول ہر
جہاں سے تو آیا چلا جا ادھر

گیا بیٹھ آ سامنے ریت میں
ہوا کھیت یہ تو اسی کھیت میں

بجاتی رہی بین وہ صبح تک
یہ رویا کیا سامنے بے دھڑک

دھری اپنے کاندھے پہ جب اس نے بین
اٹھی لے کے انگڑائی زہرہ جبیں

پریزاد نے تب پکڑ اس کا ہاتھ
شتابی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ

زمیں سے اڑا آسماں کے تئیں
وہ کتنی کہا کی نہیں رے نہیں

نہ مانا اور اس نے اٹھایا اسے
پرستان میں لا بٹھایا اسے

یہ مژدہ گیا باپ پاس اپنے لے
کہا عرض رکھتا ہوں میں آپ سے

یہ جوگن جو ہے ایک صاحبِ کمال
ذرا بین سنیئے اور اس کے خیال

بہت آپ اس سے اٹھا دیں گے حظ
بہت بین میں اس کی پاویں گے حظ

کہا اس نے بابا بہت خوب ہے
ہمیشہ سے راگ اپنے مرغوب ہے

کہا آؤ جوگی جی بیٹھو ادھر
کرو روشن اپنے قدم سے یہ گھر

بہت اس کی تعظیم و تکریم کی
جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی

غرض اس طرح اس کا معمول تھا
کہ اس شاہ پریوں کی خدمت میں جا

بجا بین سب کو رجھاتی تھی وہ
پہر کے بجے گھر کو آتی تھی وہ

دلے کیا کہوں حال فیروز شاہ
کہ تھی دن بدن اس کی حالت تباہ

نہ دنیا کی اُس کو نہ دیں کی خبر
اُسی کے تصوّر میں آٹھوں پہر

غرض ایک دن بات یہ جان کر
لگا گھات پر اپنی وہ آن کر

نہ تھا اُس گھڑی کوئی ادھر ادھر
اکیلی پڑی جو گن اُس کو نظر

اکیلے اُسے دیکھ ہو بے قرار
گرا پاؤں پہ اُسکے بے اختیار

گرا اس طرح سے قدم پر جو وہ
تو کہنے لگی مسکرا کر اُس کو وہ

کہ ہے آج کیا یہ خلاف قیاس
گرا اتنا کیوں ہو کے تو بے حواس

لگا کہنے رو رو کے فیروز شاہ
کہ بس بس یہی تو کہو گی نہ واہ

تمھاری سمجھ نے تو مارا ہمیں
یہ باتیں نہیں ہیں گوارا ہمیں

کہا اُس نے کہہ تو شتاب اپنا حال
کہ تو کیوں گرا سر کو پاؤں پہ ڈال

کہا تب پریزاد نے میری جاں
کہاں تک کروں راز اپنا نہاں

بھلا ہجر میں کب تلک ہوں ملول
غلامی میں اپنی مجھے کر قبول

لگی ہنس کے کہنے کہ اک طور سے
جو میری کہانی سنے غور سے

مطالب اگر میرے بر لائے تو
تو شاید مراد اپنی بھی پائے تو

کہا اُس نے پھر جلد فرمائیے
جو کچھ آپ سے ہو بجا لائیے

کہا اُس نے یہ ہے مری داستاں
کہ شہر سراندیپ ہے اک مکاں

ملک اک وہاں کا ہے مسعود شاہ
کہ بیٹی ہے اک اُس کی مانند ماہ

جہاں میں ہے بدر منیر اس کا نام
میں رہتی تھی خدمت میں اُسکی مدام

بنایا ہے اُس نے الگ ایک باغ
کہ فردوس کا ہے وہ چشم و چراغ

جُدا باپ سے تھی وہ اس جا مقیم
سدا سیر کرتی تھی بے خوف بیم

میں نجم النسا اُس کی دخت وزیر
ہمیشہ سے ہمراز تھی اور مشیر

ہوئی ایک دن یہ عجب واردات
کہ اک شخص وارد ہوا ایک رات

کہاں تک کہوں اُسکا قصہ ہے دُور ۔ نہ تھا آدمی نور کا تھا ظہور
گیا اُس پہ اُس شاہزادی کا دل ۔ گئے کچھ دنوں میں وہ آپس میں مل
ولے اُس پہ عاشق ہوئی تھی پری ۔ محبت میں تھی اُسکے وہ بھی بھری
کہیں اُسکے آنے کی سُن کر خبر ۔ خدا جانے پھینکا ہے اُس کو کدھر
سو ہیں کھوج میں اُسکے جوگن ہوئی ۔ یہاں تک تو پہونچی بروگن ہوئی
دیا قید میں اُس کو ڈالا کہیں ۔ کہ مدت سے اُس کی خبر کچھ نہیں
پریزاد آپس میں تم ایک ہو ۔ اگر تم ذرا کھوج اس کا کرو
تو شاید مدد سے تمھاری ملے ۔ تو پھر آرزو بھی ہماری ملے
دل آباد ہو جی کو آرام ہو ۔ تمھارا اسی کام میں کام ہو
کہا تب پریزاد نے ہاتھ لا ۔ انگوٹھا دکھایا کہ اِترا نہ جا
یہ سُن قوم کو اُس نے اپنی بُلا ۔ تقید سے سب کو سُنا کر کہا
کہ جاؤ تو ڈھونڈو کرو مت کمی ۔ کہ ہے اک پرستان میں آدمی
جو تم میں سے لاوے گا اُسکی خبر ۔ جواہر کے دوں گا لگا اُس کو پر
ہوا ناگہاں ایک کا واں گزر ۔ جہاں قید میں تھا وہ خستہ جگر
وہ روتا جو تھا نالہ و آہ سے ۔ تو کچھ اُس کو آئی صدا چاہ سے
وہ چوکی پہ جو دیو تھے جا بجا ۔ لگا پوچھنے کس کی ہے یہ صدا
کہاں ماہ رُخ کا ہے قیدی یہاں ۔ کنوئیں میں تڑپتا ہے اک نوجواں
وہ تحقیق کر اودے اُس کا بھید ۔ اُڑا شہر کو اپنے دیو سفید
کیا جا کے فیروز شہ کو سلام ۔ سُن آیا جو کچھ تھا سُنایا تمام
یہ بھیجا پھر اس ماہ رُخ کو پیام ۔ کہ کیوں زیست کرتی ہے اپنی حرام
بنی آدموں کو تو چوری سے لا ۔ بٹھاتی ہے گھر میں تعشق جتا

بھلا چاہتی ہے تو اُس کو نکال ۔ کنویں میں جسے تو نے رکھا ہے ڈال
گیا ماہرخ کو یہ پیغام جب ۔ ہوئی خوف سے وہ پریشان تب
کہا مجھ سے تقصیر اب تو ہوئی ۔ کہو اُس کو لے جائے یاں سے کوئی
پر اتنا یہ احسان مجھ پر کرو ۔ کہ اُس کا پرستاں میں چرچا نہو
یہ سن کر جواب اُس کا فیروز شاہ ۔ چلا اپنے گھر سے جہاں تھا وہ چاہ
الگ یوں لے آیا کنویں سے نکال ۔ کہ فوّارہ جوں آب کو دے اچھال
وہ جیتا تو نکلا و لے اس طرح ۔ کہ بیمار ہو نزع میں جس طرح
یہ دیکھا جو احوال اس کا تباہ ۔ تو روتا ہوا جلد فیروز شاہ
بٹھا تخت پر اپنے اس کو وہاں ۔ لے آیا وہ بیٹھی تھی جوگن جہاں
رکھا تخت اک جا پہ اس کا چھپا ۔ کہا پھر یہ جا کر کہ نجم النسا
چل اب تو کہ میں اس کو لایا یہاں ۔ یہ سنتے ہی گھبرا کے بولی کہاں
کہا چل کہاں ہے بتا تو مجھے ۔ ذرا اُس کی صورت دکھا تو مجھے
کہا رہ کے چلیو ذرا تھم رہو ۔ کہ شادی بڑی ہے کہیں غم نہو
یہ کہہ اور لے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ ۔ لے آیا وہ جوگن کو واں ساتھ ساتھ
گیا آپ اُس تخت پر بیٹھ اور ۔ دکھایا اُسے اور کہا کر تو غور
جسے ڈھونڈتی تھی سو یہ ہے وہی ۔ کہا ہاں رے ہاں یہ ہی ہے وہی
یہ اُس تخت کے گرد پھرنے لگی ۔ بلا اُس کی لے لے کے گرنے لگی
وہ دیکھے جو ٹک آنکھ اُٹھا بے نظیر ۔ تو نجم النسا ہے یہ وحشت پذیر
کہا تو کہاں اور کس کا یہ جوگ ۔ کہاں یہ لباس اور کہاں تم یہ لوگ
کہا تیرے غم نے دِوانا کیا ۔ کہ عالم سے اپنے بگانا کیا
کہی سرگذشت اس نے اس دم تلک ۔ کہ اس طرح پہونچے ہو تم ہم تلک

کیا ایک دن تو اُنھوں نے مقام
چلے دوسرے دن وہ نزدیک شام

وہ جوگن وہ فیروز شہ اور وہ ماہ
چلے تخت پر بیٹھ اوپر کی راہ

مربع نشیں تھی جو بدرِ منیر
وہاں اُس کو لائی وہ دختِ وزیر

بلائیں لگی لینے نجم النسا
لگی گرد پھرنے برنگِ صبا

گئی جب کہ خلوت میں بدرِ منیر
کہا میں لے آئی ترا بے نظیر

کہا کیونکہ لائی کہا اِس طرح
وہ سب کہہ دیا حال تھا جس طرح

ترا قیدی جاکر چھُڑا لائی ہوں
اور اک اور بندھوا اڑا لائی ہوں

کہا پھر وہ دونوں کہاں ہیں کہا
درختوں میں اُن کو رکھا ہے چھپا

سُو اب ایک کو جاکے لاتی ہوں میں
ہے اک دوسرے کو بتاتی ہوں میں

یہ سُن شاہزادی ہنسی کھِل کھِلا
کہا کیوں اُڑاتی ہے نجم النسا

یہ سُن کر شتابی گئی وہ نگار
لیا جاکے آہستہ اُن کو پکار

چھپائے ہوئے لا اُٹھایا وہاں
وہ خلوت کا جو تھا قدیمی مکاں

غرض دیر تک مل کے روتے رہے
جُدائی کے داغوں کو دھوتے رہے

کہا شاہزادے نے احوال سب
کنوئیں میں جو گزرا تھا اُس پر تعب

اگرچہ ہر اک وصل سے شاد تھا
ولے ہجر کا غم اُنھیں یاد تھا

یہ ٹھہرا کے نکلے وہ دو ماہرو
کہ اِس بات کو کیجیئے ایک سو

وہ نجم النسا اور وہ بدرِ منیر
کچھ اک کر بہانا وہ دونوں شریر

رہیں گھر میں پھر جا کے ماں باپ کے
کہ دیکھیں گے اب ہم قدم آپ کے

نکل بے نظیر اور وہ فیروز شاہ
کسی شہر میں رکھ کے فوج سپاہ

کرا اسباب سب سلطنت کا درست
پھر آئے اسی جا پہ چالاک و چُست

وہاں کا جو تھا شاہ اک جم سپاہ
سب ایسے لوگ کہتے تھے مسعود شاہ

کیا نامہ یوں ایک اس کو رقم — کہ اے شاہ شاہاں ولے فخر جم
فریدوں مثال و سکندر نژاد — مُراد جہان و جہان مراد
ہیں وارد ہوں یا ایک مہماں غریب — لے آئے ہیں مجھ کو مرے یاں نصیب
نوازش سے اپنی کرم کیجئے — غلامی میں اپنی مجھے لیجئے
گیا یہ جو مسعود شہ کو پیام — سُنا اور پڑھا خط کا مضموں تمام
لکھا نامہ اُسکے یہ اک در جواب — کہ سا قتل کو نکتہ لگے ہے کتاب
کہ نامہ تمہارا جو سربستہ تھا — وہ رازِ نہاں اپنے ہاتھوں کھُلا
اگر ہم کہیں اپنے دعوے پہ آئیں — تمہارے فلک کو نہ خاطر میں لائیں
ولے ہم کو ہے پاس شرع رسول — سو اس واسطے کرتے ہیں ہم قبول
سُنی یہ جو نامہ کی گفت و شنید — ہوئی شاہزادہ کو گویا کہ عید
بُلا سنتکوں کو بتا سال و سن — مقرر کیا نیک ساعت کا دن
بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز — چڑھا بیاہنے وہ مہ دلفروز
ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان — پلا شب کو شربت دیے خاصدان
اٹھا پھر تو نوشاہ بعد از نکاح — محل میں بُلانے کی ٹھہری صلاح
ہوا لیکن اس وقت دُونا مزا — کہ دُولھا دُلھن جب ہوے ایک جا
غرض اس طرح جب وہ دولھن کو بیاہ — لے آیا جہاں اُس کی تھی عیش گاہ
وہ نجم النساء تھی جو دختر وزیر — گیا اُس کے والد کنے بے نظیر
کہا باپ کو اُس کے لیے خیر خواہ — مرا بھائی ہے ایک فیروز شاہ
سو میں تجھ سے رکھتا ہوں اک التجا — کہ تو اُس کو فرزندی میں اپنی لا
غرض ہر طرح کر رضامند اُسے — کیا حال پر اپنے پابند اُسے
پری زاد تھا وہ جو فیروز شاہ — دیا اُس کو نجم النسا سے بیاہ

پھرے دن تو اپنے وطن کو پھرے — وہ آشفتہ بلبل چمن کو پھرے
خوشی سے لئے حرمت و جان و مال — چلے شہر کو اپنے وہ حال حال
زبس باپ ماں کو بھی سہرے کی چاہ — دوبارہ انھوں نے کیا ان کا بیاہ
لکھوں گر میں اس بیاہ کی دھوم دھام — تو پھر یہ کہانی نہ ہووے تمام
ہوا شہر پہ فضل پروردگار — وہی شاہزادہ وہی شہریار
مرے ایک مشفق ہیں مرزا قتیل — کہ ہیں شاہراہ سخن کے دلیل
انھوں نے شتابی اٹھا کر قلم — یہ تاریخ کی فارسی میں رقم
بگوشم ز ہاتف رسید ایں ندا — بریں مثنوی باد سر دل فدا (سنہ ۱۱۹۹)
میاں مصحفی کو جو بھایا یہ طور — انھوں نے بھی کی فکر از راہ غور
کہی اس کی تاریخ یوں برمحل — یہ بتخانہ چین ہے بے بدل

( ) دوسری مثنوی گلزار ارم[1] ہے جس کو گارسن ڈیٹاسی اور بلوم ہارٹ نے غلطی سے مثنوی سحر البیان کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے یہ بالکل دوسری چیز ہے اور سنہ ۱۱۹۲ھ مطابق ۱۷۷۸ء میں تصنیف ہوئی اس میں جیسا کہ اوپر لکھا گیا شاہ مدار کے میلہ کی چھڑیوں کا مفصل حال لکھا ہے اور مثل مثنوی سحر البیان کے اس میں بھی اس زمانہ کے مختلف رسم و رواج زنانہ لباس شادی بیاہ ناچ رنگ وغیرہ کے دلچسپ حالات موجود ہیں اس میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف کی ہے نمونہ آخر میں موجود ہے۔

( ) رموز العارفین اس کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا مگر خود میر حسن نے اپنے تذکرۃ الشعراء میں کیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بعضوں مثنویاں بتائی جاتی ہیں جو اب ناپید ہیں انھوں نے

[1] گلزار ارم تاریخی نام ہے ۱۲

کئی ہجویں بھی لکھیں مثلاً ہجو عظیم کشمیری، ہجو قصاب نقل کلاونت ہجو مکان وغیرہ یہ سب ہجویں نہایت پُرلطف اور مہذب زبان میں لکھی گئی ہیں۔

میر حسن نے مختلف اشخاص کی تعریف میں قصائد بھی لکھے جن میں سے سات قصیدے موجود ہیں میر صاحب موصوف قصیدہ کے مرد میدان نہ تھے مگر پھر بھی کچھ قصائد ملتے ہیں

مراثی | چند مرثیے اور سلام بھی اُنھوں نے تحریر فرمائے جیساکہ ان کے تذکرہ سے پایا جاتا ہے۔ اس صنف کی تکمیل و ترقی اُن کے پوتے کے زمانہ میں بخوبی ہوئی۔

تذکرۃ الشعراء | یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور اس میں تقریباً تین سو شاعروں کا ذکر ہے اس کا سال تصنیف کہیں مذکور نہیں مگر اُن تاریخوں سے جو خود تذکرہ میں موجود ہیں سنہ ۱۱۹۴ھ بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے[1] اور یہ وہ سن تھا جبکہ مرزا رفیع سودا کی عمر ۷۰ برس کی تھی مصنف نے اس کو تین دوروں پر تقسیم کیا ہے پہلا دور اُن شعرا کا جو فرخ سیر سے پیشتر گزرے۔ دوسرا اُن کا جو فرخ سیر کے بعد محمد شاہ کے زمانہ تک تھے اور تیسرا خود اپنے معاصروں کا بڑی خوبی اس تذکرہ کی یہی ہے کہ اکثر ہمعصر شعراء کا اس میں حال ملتا ہے جو گو کہ بہت مفصل نہیں مگر پھر بھی نہایت دلچسپ اور کارآمد ہے مختصر یہ کہ میر حسن ایک شاعر شیریں بیان تھے اُن کا کلام نہایت سادہ فصیح اور عاشقانہ ہوتا تھا اور اُن کی مثنوی سحرالبیان تو ایک معرکۃ الآرا اور بےنظیر تصنیف ہے جس سے اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آخر میں کچھ اشعار مثنوی گلزار ارم سے اور کچھ متفرق اشعار قصائد و ہجو وغیرہ کے بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

---

[1] مولنا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی تذکرہ شعرائے اُردو کے فاضلانہ مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ واضح رہے کہ یہ تذکرہ سنہ ۱۱۸۸ھ اور سنہ ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔

مثنوی گلزارِ ارم سے

لکھنؤ کی مذمت

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں ۔ نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں
کیا تھا غم نے از بس دل پہ ڈیرا ۔ لگا اس جا پہ ہرگز دل نہ میرا
بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا ۔ و لے جا گہ جو بد ہو تو کریں کیا
زبس یہ ملک ہے بہتر پہ بستا ۔ کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پر گھر ہوا ہیں ۔ کسی کا جھوپڑا تحت الثریٰ میں
نہیں ہے لکھنؤ یہ ہے زمانا ۔ زمانے پر عبث رکھنا بہانا
عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی ۔ کہے پستی ہے اور گاہے بلندی
زبس گنجان ہے یہ شہر باہم ۔ سما سکتا نہیں یاں غیر کا دم
ہر اک کوچہ یہاں کا تنگ تر ہے ۔ ہوا کا بھی بہ مشکل یاں گزر ہے

فیض آباد کی تعریف

یہ دیکھی میں نے جب کیفیت شہر ۔ مرے اک روز جی میں آئی یوں لہر
کہ کیجے سیر فیض آباد جا کر ۔ چلا میں یاں سے اپنا دل اُٹھا کر
جونہی داخل ہوا میں اُس نگر میں ۔ کھلا جنّت کا دروازہ نظر میں
عجب معمورہ آباد پایا ۔ مثال گُل ہر اک دل شاد پایا

فیض آباد سے مراجعت پر نہایت افسوس ظاہر کرتے ہیں۔

نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جدائی ۔ قضا پھر لکھنؤ میں مجھ کو لائی
بُرا دن سر سے قسمت نے نہ ٹالا ۔ مجھے جنّت سے جوں آدم نکالا
دعا میری یہی ہے اب شب و روز ۔ کہ پھر دیکھوں وہی روئے دلِ افروز

وہی ہو شہر اور وہ باغ و گلزار — وہی صحبت ہو اور وہ ساتھ کے یار
پھروں میں پیچھے کرتا جہاں میں — غزل خوانی کروں جا اس مکاں میں
رہیں میری غزلخوانی میں شامل — رجب بیگ و حبیب اللہ فاضل

رباعی کا نمونہ

ظاہر بھی تو ہے اور نہاں بھی تو ہے — معنی بھی تو ہے اور بیاں بھی تو ہے
دونوں عالم میں تجھ سوا کوئی نہیں — یاں بھی تو ہے اور واں بھی تو ہے

ولہ

کیا وحش و طیور و انس و جاں عالم میں — جو ہیں سو حسن روتے ہیں اس غم میں
روشن نہ سمجھ ضریح پر قندیلیں — جلتے ہیں یہ دل حسینؑ کے ماتم میں

ہجو کا نمونہ

اپنے گھر کی حالت

ہم نے جب سے لیا ہے یاں اک گھر — دو روپیہ کے تئیں کرائے پر
جان سے ہیں تنگ اس میں لوگ — گھر نہیں ہے وہ ایک جاں کا روگ
پہلے اس گھر کی خوبی یہ پائی — آتے ہی گھر میں مجھ کو تپ آئی
کلہ آماس کر گیا سارا — پہلے ہی مجھ پہ گھر نے مُنھ مارا
وہ مثل ٹھیک ہے یہاں فی الحال — پہلے مُنھ چومتے ہی کاٹا گال
صحن اُس کا بتاؤں کس مقدار — ایک دو تین چار بائی وار
پانچ بلّی کا کہنہ سا چھپّر — ساتھ سایہ کے دھوپ آٹھ پہر
نو کا یا دس کڑی کا اک دالان — تیسرا اک ٹوٹے جھونپڑے کی شان

سیڑھی اک بانس کی پرانی سی / آنے جانے کے واسطے ہے دھری
نہ تو مطبخ نہ واں مکان ضرور / دونوں باتوں کا واں نہیں دستور
ایک چوکی دھری ہے صحن کی بیچ / صحن میں ساری جا ضرور کی کیچ
تس پہ دو ٹٹیاں براے اوٹ / وہ کہ جاویں ہوا سے خاک میں لوٹ
ڈیوڑھی کا بند کیجئے جب در / بیٹھیے جا ضرور تب جا کر
آنے والا جو کوئی آجاوے / دیکھ دروازہ بند پا جاوے
یعنی در جو کھلا نہیں پایا / کوئی ہے جا ضرور کو آیا
گھر میں ہیں دھوپ سے کباب سبھی / گھر سے نکلے نہ آفتاب کبھی
ٹوٹا پھوٹا جلا بھنا سارا / دھوپ سے گرم جیسے انگارا
چیز آبی و بادی اس میں کم / زور خاکی و ناری کا باہم
یاں کنواں بھی نہیں مزا یہ ہے / کس کا یہ گھر ہے کیا بلا ہے یہ
خوب یاں کا کھلا جو ہم پر بھید / چاہ کی جا ہے چشمۂ خورشید
دن کو آنکھوں میں بھرتے ہیں پانی / رات پلکوں سے قطرہ افشانی
گرد میں صورتیں اٹی ہیں سب / ماٹی کی مورتیں بنی ہیں سب
کپڑے ہم جھاڑتے ہیں لیل و نہار / دھوبی دھوتے ہیں جیسے دے دے مار
تکیے رہتے ہیں اس طرح میلے / جوں تیمم کی خاک کے تھیلے
طاق پر تھے جہاں جہاں جزدان / ہو گئے کل وہ کوہ ریگستان
خاک بھر بھر کے یوں ہوئی ہے دوات / جیسے آندھی میں ہو اندھیری رات
تھے دھرے وہ جو خاص و عام قلم / ریگ ماہی ہوئے تمام قلم
جھاڑتے جھاڑتے بیاض و کتاب / حرف مٹ مٹ کے ہو گئے ہیں خراب
صاف آٹا نہ کوئی سانے گا / خوب جب تک نہ خاک چھانے گا

کیا کہیں کس طرح سے جیتے ہیں	خاک کھاتے ہیں کچھ پیتے ہیں

قصیدہ کا رنگ یہ ہے :-

کون بدمست گل اندام چمن میں ہے مقیم	جس کی بو دوش پہ اپنے لئے پھرتی ہے نسیم
خوش ادا کون یہ مستانہ پھرے ہے جس کے	نقش پا سے گل نرگس کو کرے دام شمیم
عرق شبنم گل کس پہ چھڑکتا ہے گلاب	عندلیبوں کا ہوا رشک سے دل کس کے دونیم
کون انگڑائیاں لیتا ہے چمن میں مخمور	غنچہ بھر بھر کے گلابی کرے ہے کیوں تقسیم
شاید اس باغ میں ہے آصف دوراں کا گذر	کہ ہے وہ ابن کریم ابن کریم ابن کریم
آصف الدولہ بہادر ہے وزیر اعظم	نائب ظل الٰہ صاحب تاج و دیہیم

میر تقی میر میر محمد تقی نام میر تخلص۔ ریختہ گویان ہند کے اُستاد اعظم شاعرانِ اردو کے رہبر مسلّم۔ ادب و زبان دانی کے ماہر فن۔ خوش گو۔ خوش بیان شیریں سخن تذکروں میں والد کا نام میر عبد اللہ لکھا ہے مگر ذکر میر میں میر صاحب نے کوئی نام نہیں لکھا البتہ یہ تحریر کیا ہے "کہ میرے والد نے جو میرے دادا کے چھوٹے بیٹے تھے درویشی اختیار کی اور ترک دنیا کرکے بیٹھ رہے۔ شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے علم ظاہری و معنوی کا استفادہ کیا جوانِ صالح و عاشق پیشہ تھے اس لئے علی متقی کے عرف سے مشہور ہوئے" چونکہ ان کا نام تحریر نہیں ہے لہذا ممکن ہے کہ نام میر عبد اللہ ہی ہو۔ اپنے بزرگوں کی نسبت میر صاحب تحریر فرماتے ہیں "میرے بزرگ زمانے کی ناسماعدت سے اپنی قوم و قبیلہ کے ساتھ حجاز سے روانہ ہوکر سرحد دکن میں پہونچے وہاں سے وہ احمد آباد، گجرات میں وارد ہوئے بعض تو ان میں سے وہیں رہ گئے اور بعض تلاش معاش کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ میرے جد کلاں نے اکبر آباد میں توطن اختیار کیا مگر ناسازگاری آب و ہوا سے راہی عدم ہوئے۔ ایک فرزند چھوڑا جو میرے دادا تھے وہ اکبر آباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے پچاس سال کی عمر میں علیل ہوئے اور ابھی پوری

صحت نہ ہوئی تھی کہ گوالیار گئے اور چند ہی روز کے بعد اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کو کچھ خلل دماغ تھا اور وہ جوان مرگیا۔ چھوٹے بیٹے میرے والد تھے جو علی متقی کے نام سے مشہور تھے " میر صاحب نے ان کے چند قصے بیان فرمائے ہیں۔ درویش صفت تھے ایک دفعہ لاہور چلے گئے اور وہاں ایک فقیر جس نے مکر و فریب کا جال پھیلا رکھا تھا اُس سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ پھر وہ دلی آئے وہاں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ وہاں سے بیانہ پہنچے۔ ایک نوجوان سید پر اُن کی نظر پڑی جو خلوص کے ساتھ اُن کا معتقد ہو گیا وہاں سے آگرے آئے اور خانہ نشین ہو گئے۔ وہ نوجوان سید بھی اُن کی تلاش میں آگرہ پہونچا اور وہیں رہ پڑا۔ ان کا نام سید امان اللہ تھا اور میر تقی ان کی عزت کرتے تھے۔ میر صاحب کی تربیت میں انکو بڑا دخل تھا میر صاحب اُن کو اچھے کہتے تھے اور ذکر میر میں ہمیشہ عم بزرگوار کہہ کر یاد کرتے ہیں دن رات انھیں کے پاس رہتے اور ان کی تمام تربیت سید صاحب کے زیر نظر ہوئی۔ سید امان اللہ کا جب انتقال ہوا تو میر صاحب دس برس کے تھے۔ میر صاحب اور ان کے والد کو ان کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا چنانچہ اُن کے والد بھی بخار میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے میر صاحب سے بڑی بے مروتی کی اور باپ کے کل ترکہ پر قبضہ کر لیا۔ اس صغر سنی میں میر صاحب اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنی جگہ چھوڑ کر خود تلاش معاش میں مصروف ہوئے۔ لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ناچار وطن کو خیر باد کہہ کر شاہجہاں آباد دہلی پہونچے خواجہ محمد باسط جو صمصام الدولہ امیر الامرا کے بھتیجے تھے ان کو نواب کے پاس لے گئے اور میر صاحب وہاں ملازم ہو گئے۔ نواب صاحب نادر شاہ کی جنگ میں مارے گئے اور میر صاحب کی ملازمت جاتی رہی۔ میر صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد آگرہ واپس آ گئے مگر جب گذر اوقات کی کوئی معقول

صورت نظر نہ آئی تو پھر دلی کا رُخ کیا اور اپنے بڑے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں جا کر ٹھہرے اور کچھ دنوں اُن کے پاس رہے۔ مگر بڑے بھائی کی تحریک پر خاں آرزو نے میر صاحب کو تکلیف پہونچانے کی کوشش کی۔ اس سے میر صاحب کو اس قدر صدمہ ہوا کہ مکان کے دروازے بند کیے پڑے رہتے اسی وجہ سے اُن کی حالت جنون کی سی ہو گئی۔ حکیم فخر الدین خاں نے علاج کیا اور رفتہ رفتہ وہ حالت جاتی رہی۔ بعدہٗ ایک بزرگ میر جعفر نامے سے کچھ تعلیم حاصل کی اور سید سعادت خاں نے اُن کو ریختہ میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی اُدھر خاں آرزو درپے آزار تھے۔ ایک روز مجبوراً میر صاحب اُن کے مکان سے نکل گئے مگر خوبی قسمت سے ایک رئیس رعایت خاں نامے نے اُن کو اپنا مصاحب بنا لیا اور اس طرح تنگدستی سے گونہ نجات ملی۔ جب احمد شاہ درّانی کو سرہند میں شکست ہوئی تو میر صاحب بھی رعایت خاں کے ساتھ شریک تھے اور جو خدمت اُنکے لائق ہوئی اُس کو انجام دیا۔ رعایت خاں کے ساتھ میر صاحب نے قصبہ سانبھر کی سیر کی جو اجمیر کے قریب واقع ہے اور جب رعایت خاں اور راجہ رنجیت سنگھ میں شکررنجی ہو گئی تو میر صاحب نے صفائی کی کوشش کی۔ ذرا سی بات پر رعایت خاں کی ملازمت ترک کر دی مگر اس نے اُن کی دوستی کا حق خوب نبایا اور محمد رضی میر صاحب کے چھوٹے بھائی کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا چند دنوں کے بعد میر صاحب نواب بہادر کے یہاں ملازم ہو گئے اور روہیلوں کی جنگ میں اس اطراف کی سیر کی جب صفدر جنگ نے نواب بہادر کو دغا سے قتل کر ڈالا تو میر صاحب بیکار ہو گئے لیکن چند ہی روز بعد مہا نرائن دیوان کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ اسی زمانے میں میر صاحب نے خان آرزو اپنے خالو کی ہمسائگی چھوڑ دی اور امیر خاں کی حویلی میں رہنے لگے۔ سکندر آباد کی لڑائی میں میر صاحب احمد شاہ کے ساتھ تھے۔ راجہ جگل کشور کے توسل سے مہاراجہ ناگر مل

سے ملے اور پھر کچھ دنوں بعد اُن کے بیٹے نے اُن کی کچھ تنخواہ مقرر کردی میر صاحب اُنکے
خانہ باغ میں دوپہر رات تک موجود رہتے مشاہرہ معقول ہونے سے کسی قدر فارغ البالی
سے بسر ہوتی تھی۔ خانہ جنگیوں سے دلّی کی حالت ابتر ہورہی تھی اسی میں میر صاحب کا
مکان بھی خاک میں مل گیا اور سب مال واسباب لُٹ گیا۔ اس لوٹ مار کے بعد میر صاحب
معہ لواحقین کے دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور کچھ دنوں برسانہ ضلع متھرا میں قیام کرکے
کمہیر پہونچے جو سورج مل جاٹ کا قلعہ تھا اور بہادر سنگھ یہاں اُن سے بڑی مدارات سے
پیش آئے اور سورج مل کے طویلے میں جو خانہ خراباں دلی کا مامن بن گیا تھا اعظم خاں سے
ملاقات ہوئی۔ میر صاحب کے بیٹے میر فیض علی بھی یہاں اُن کے ہمراہ تھے۔ راجہ
سورج مل کے چھوٹے بیٹے نے میر صاحب کے واسطے کچھ ساز و سامان مہیا کردیا اور
خود سورج مل نے روزینہ مقرر کردیا چند دنوں بعد میر صاحب پھر دلی واپس آئے مگر
گھروں کو خراب اور شہر کو ویران پایا۔ سورج مل کے ساتھ تیس سال کے بعد میر صاحب
اکبر آباد پہونچے اور اپنے والد اور عم بزرگوار کی قبروں کی زیارت کی۔ اُن کے شعر و سخن کا
شہرہ اب عالم گیر ہوچکا تھا چار مہینے وطن میں رہ کر سورج مل کے قلعہ میں آگئے کچھ دنوں
بعد پھر اکبر آباد آئے اور پندرہ روز رہ کر واپس چلے گئے۔ جاٹوں کی لوٹ مار سے راجہ
ناگر مل مع اپنے ہمراہیوں کے کاماں چلے گئے جو راجہ پرتھی سنگھ پسر مادھو سنگھ کا سرحدی
مقام تھا۔ میر صاحب بھی اُن کی معیّت میں تھے اور بوجہ ملازمت اسی شہر میں چند دن
اقامت گزیں ہوئے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد ملازمت سے کنارہ کش ہوگئے۔ راجہ نے
میر صاحب کو حسام الدین کے پاس بھیجا اور میر صاحب نے ان کی طرف سے سب
عہد و پیمان کئے مگر راجہ بادشاہ کے لشکر میں جو فرخ آباد میں تھا نہیں گیا۔ اور
شہر کی طرف روانہ ہوگیا ناچار میر صاحب بھی اُس کے ہمراہ ہوگئے اور دہلی پہونچے
اہل و عیال کو عرب سرائے میں چھوڑا اور راجہ سے جُدا ہوگئے۔ سرداروں کے

اتفاق سے بادشاہ نے مجبور ہو کر ضابطہ خاں پر حملہ کیا میر صاحب بھی اس حملہ میں بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ ضابطہ خاں بے لڑے بھاگ گیا۔ میر صاحب چونکہ بے روزگار تھے تلاش معاش میں نکلے۔ وجیہ الدین خاں برادر خورد حسام الدولہ سے ملے اور اُس نے کچھ مقرر کر دیا۔ میر صاحب ان دنوں خانہ نشین تھے۔ بادشاہ عالمگیر ثانی ان کو اکثر طلب فرماتے۔ مگر وہ کبھی نہ گئے۔ ابوالقاسم خاں اور عبدالاحد خاں کا چچازاد بھائی میر صاحب کے ساتھ اس زمانہ میں سلوک کرتے رہے کبھی کبھی وہ اُن سے ملاقات کو جاتے اور بادشاہ بھی کبھی کبھی کچھ بھیج دیتے تھے اور حسن رضا خاں بھی میر صاحب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔

روانگی لکھنؤ | لکھنؤ کی روانگی کے حالات میر صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں۔ فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سامانی سے مجبور تھا میری عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے نواب وزیرالممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک نے چاہا کہ میر میرے پاس آجائے تو اچھا ہو چنانچہ میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے اُن قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے خالو سے تھے کہا کہ اگر نواب صاحب ازراہ عنایت کچھ زادراہ عنایت فرمائیں تو البتہ میر صاحب یہاں آسکتے ہیں۔ نواب صاحب نے حکم دیا اور انھوں نے سرکار سے زادہ راہ لیکر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں۔ جس طرح ہو سکے آپ یہاں آجائیے۔ میں پہلے ہی دل برداشتہ بیٹھا تھا خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا چونکہ خدا کی یہی مرضی تھی میں بے یار و مددگار بغیر قافلہ اور رہبر کے فرخ آباد کے رستے سے گذرا وہاں کے رئیس مظفر جنگ تھے اُنھوں نے ہر چند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہیں کیا۔ دو ایک روز بعد روانہ ہو کر منزلِ مقصود پر پہونچ گیا اول سالار جنگ کے یہاں گیا اُنھوں نے میری بڑی عزت کی اور جو کچھ مناسب تھا

بندگان عالی کی جناب میں کہلا بھیجا۔ چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب مرغوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے تشریف لائے میں بھی وہاں حاضر تھا ملازمت حاصل کی مجھ فراست سے دریافت فرمایا کہ کیا تم میر تقی ہو؟ اور نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لے گئے اپنے شعر مجھے مخاطب کر کے سُنائے سُبحان اللہ کلام الملوک ملک الکلام۔ اس کے بعد فرط مہربانی سے مجھ سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی۔ اُس روز میں نے اپنی غزل کے صرف چند شعر عرض کئے رخصت کے وقت نواب سالار جنگ نے کہا کہ اب میر صاحب حسب الطلب حاضر ہو گئے ہیں۔ بندگان عالی مختار ہیں انھیں کوئی جگہ عنایت فرما دی جائے جب مرضی مبارک ہو یاد فرمائیں۔ فرمایا کہ میں کچھ مقرر کر کے آپ کو اطلاع دونگا دو تین روز بعد یاد فرمایا۔ حاضر ہوا اور جو قصیدہ مدح میں کہا تھا پڑھا۔ سماعت فرمایا اور کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلے میں داخل فرمایا اور ہمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے۔"

میر صاحب نے لکھنؤ میں زندگی آرام کے ساتھ بسر کی۔ نواب آصف الدولہ جب شکار کے لیے بہرائچ تک گئے تو میر صاحب بھی ہمرکاب تھے اُس کی یادگار میں شکارنامہ موزوں کیا دوسری دفعہ نواب کوہ شمالی کے دامن تک گئے۔ اُنھوں نے دوسرا شکارنامہ لکھ کر حضور میں پیش کیا۔ اس شکارنامہ کی دو غزلوں کی نواب نے بطور مخمس تضمین فرمائی۔

آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اس زمانہ میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے۔ یاروں کی ملاقات ترک کر دی ہے بڑھاپا آ پہونچا اور عمر عزیز ساٹھ سال کی ہو گئی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اٹھائی ضعف بصر کی وجہ سے عینک لگائی دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں۔ آخر دل کڑا کر کے ایک ایک کو جڑ سے اکھڑوا دیا۔ غرض کہ ضعف قویٰ۔ بے دماغی۔ ناتوانی۔ دل شکستگی۔ اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ زندہ نہ رہوں گا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔

بس آرزو اتنی ہے کہ خاتمہ بخیر ہو۔[1]

میر صاحب کی عمر | میر صاحب کی عمر میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر پائی۔ اُن کی وفات کا سال تحقیق سے معلوم ہے۔ ناسخ کے مشہور مصرعہ تاریخ ع "واویلا مرد شہ شاعراں" سے سنہ وفات بارہ سو پچیس ہجری نکلتا ہے۔ تذکرۂ جہاں میں میر صاحب کی عمر ۹۰ سال تحریر ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۹ھ میں جبکہ وہ اپنا تذکرہ قلمبند کر رہے تھے میر صاحب کا سن اسی سے متجاوز ہو چکا تھا مگر یہ قیاس پر زیادہ تر مبنی ہے۔ کتاب ذکر میر کی تاریخ جو ایک قطعہ سے نکالی ہے ۱۱۹۷ھ ہوتی ہے۔ کتاب کے اختتام پر میر صاحب نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ تقریباً ۱۱۳۷ھ ہجری ہوئی۔ نادر شاہ کا حملہ ۱۱۵۱ھ میں ہوا تھا اس وقت اُن کی عمر صرف ۱۴ یا ۱۵ سال کی ہوگی۔ اگر پیدائش کا ۱۱۳۷ھ ہو تو میر صاحب کی عمر ۸۸ یا ۸۹ سال کی ہوتی ہے۔

ذکر میر ۱۱۹۷ھ ہجری | میر صاحب کی زندگی کے متعلق ابھی تک صحیح حالات بہت کم معلوم ہوئے ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ "جب میں ۱۸۴۸ء لغایت ۱۸۵۰ء میں شاہان اودھ کے کتبخانوں کی فہرست مرتب کر رہا تھا تو میں نے موتی محل میں ایک قلمی نسخہ میر صاحب کی خود نوشتہ سوانحعمری موسوم بہ ذکر میر کا دیکھا جو زبان فارسی میں ہے اور ضخامت ۱۵۲ صفحات کی ہے"۔ یہ کتاب ابھی تک نایاب تھی مگر اب دستیاب ہو گئی ہے اور انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی طرف سے چھپ گئی ہے۔ لکھنؤ میں بھی ایک قلمی نسخہ سید مسعود حسن رضوی کے پاس موجود ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سی نئی باتیں میر صاحب کے حالات زندگی کے متعلق دریافت ہوگئیں اور اکثر بے بنیاد فرضی افسانوں کا جو میر صاحب کے متعلق بعد کے تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں خاتمہ ہو گیا

[1] ملخص از ذکر میر مرتبۂ مولوی عبدالحق صاحب (رسالہ اردو اورنگ آباد دکن اپریل ۱۹۲۶ء)

اکثر ظنی اور بے بنیاد باتیں جو عوام الناس میں مشہور تھیں معاصر تذکرہ نویسوں نے بغیر تحقیق کئے قلمبند کر دیں اور اُن کو بعد کے لوگوں نے مستند تسلیم کر کے اور زیادہ چمکایا افسوس ہے کہ ذکر میر میر کی ادبی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی اور نکات الشعرا میں میر نے اپنے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں لکھا" مولف این نسخہ متوطن اکبر آباد ست بسبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد ست" یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۵ھ میں مرتب ہوا ذکر میر میں میر صاحب نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند فرمائے ہیں۔ اپنے زمانے کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے بھی کتاب خاص وقعت رکھتی ہے نادر شاہ کی جنگ سے لیکر ضابطہ خاں کے قتل تک کے واقعات موجود ہیں یعنی ۱۱۵۱ھ ہجری سے لیکر ۱۱۹۷ھ تک کی تاریخ ہے اور اُس زمانے کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ ابھی تک مؤرخین کو اس کتاب کا پتہ نہ تھا اور یہ کتاب تاریخی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ دہلی کی خانہ جنگیاں۔ مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں و افغانوں کی لڑائیاں۔ نوابان اودھ کے معرکے۔ انگریزوں کے مورچے۔ عمائدین شہر کی سازشیں اہل ہنود مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات سب کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ چونکہ اس زمانے کی بہت سی تاریخیں ہیں لہذا واقعات کی تصدیق یا تردید ہو سکتی ہے۔ میر صاحب خود بہت سی مہموں میں شریک تھے۔ افسوس ہے کہ میر صاحب نے اُس زمانے کے لیٹریری پہلو پر بہت کم روشنی ڈالی ہے۔ شعرا کا ذکر بالکل نہیں ہے ادبی زندگی کے حالات مفقود ہیں۔

سیادت میں اختلاف — تذکرہ شورش میں ہے (جس کا سنہ تالیف گیارہ سو ترانوے ہے جبکہ میر صاحب حیات تھے اور دلی میں مقیم تھے) کہ میر صاحب فی الحقیقت سید نہ تھے بلکہ میر تخلص ہونے کی وجہ سے سید خیال کئے جانے لگے۔ تذکرہ آبحیات میں ہے کہ کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سُنا ہے کہ جب اُنھوں نے میر تخلص کیا تو اُن کے والد

نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے اُسوقت انھوں نے خیال نہ کیا رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ پھر سودا کے ایک قطعہ کا حوالہ دیتے ہیں جس کا آخری شعر یہ ہے۔

میری کے اب تو سالے مسالے ہیں مستعد

بنیا تو گند نا بنے اور آپ کو تھمیر

مگر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور پھر آگے خود کہتے ہیں کہ میر صاحب کی سیادت میں[۱] شبہ نکرنا چاہیے اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے۔

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی		پھرتے میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کی سیادت کے متعلق کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا اسوجہ سے کہ اپنی سیادت کا اشارہ انھوں نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ ذکر میر نے اس امر کا قطعی طور پر فیصلہ کر دیا ہے۔ میر صاحب اپنے والد کا ذکر ہر جگہ میر علی متقی کے نام سے کرتے ہیں

[۱] مصنف آب حیات نے میر صاحب کی سیادت کے متعلق ایسے الفاظ میں لکھا ہے جن سے اُن کے سید ہونے میں شبہ بھی پایا جاتا ہے اور آگے چل کر اپنے اس شبہ کی خود ہی تردید بھی کر دی ہے۔ افسوس ہے۔ انھوں نے ایک غیر معتبر روایت "کہن سال بزرگوں کی" زبانی نقل کر دی کہ جب میر صاحب نے میر تخلص کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے اس زبانی اور غیر موثق روایت کے علاوہ سودا کا وہ قطعہ بھی پیش کرتے ہیں جس کے ایک شعر میں میر صاحب کی سیادت کے متعلق مذاق اُڑایا ہے مگر خود ہی اس پیش کردہ شہادت میں شبہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور آگے چل کر اپنی رنگین عبارت میں میر صاحب کی مسکینی و غربت اور صبر و قناعت وغیرہ کا محضر تیار کر کے ادائے شہادت کرتے ہیں کہ ان کی سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیئے۔ یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی اس وجہ سے کہ پہلے خود ہی شبہ کیا پھر اُس شبہ کی آپ ہی تردید کی۔ اس کے علاوہ شروع مضمون میں جہاں میر صاحب کے خاندان کا ذکر کیا ہے اُن کو "خلف میر عبداللہ" لکھتے ہیں یعنی اُن کے والد کی بھی سیادت کے قائل ہیں۔ اسی طرح مضمون کے آخر میں میر صاحب کے بیٹے کا نام "میر عسکری عرف میر کلو" بتاتے ہیں ۱۲۔

اپنا نام اپنے والد و بزرگوں کی زبانی میر محمد تقی لکھا ہے اپنے بیٹے کا نام میر فیض علی لکھا ہے۔ یہ روایت غلط ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص اختیار کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کیونکہ والد کی وفات کے وقت میر صاحب کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ کی نہ تھی اور اُس وقت شعر نہیں کہتے تھے" میر صاحب کا مذہب شیعہ تھا مگر ایسا تنگ نہیں جو دوسروں کے لئے ناگواری کا باعث ہو" آزاد نے اپنی نہایت قابل قدر، مگر واقعات کے اعتبار سے کسی قدر غیر معتبر تصنیف (آبحیات) میں بعض غلط بیانیاں بھی کی ہیں مثلاً بعض ایسے قصے اور اقوال میر صاحب کی طرف منسوب کیے ہیں جن سے اُن کی بد دماغی اور نازک مزاجی کا اظہار ہوتا ہے مثلاً وہ واقعہ جس میں میر صاحب کے سفرِ دلی کا ذکر کیا ہے، اور میر قمر الدین منت اور سعادت یار خاں رنگین کی شاگردی کے متعلق۔ افسوس ہے کہ ان واقعات کی تصدیق نہیں کر لی گئی اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کی غرض سے بہت سے بے بنیاد قصے اور سُنے سُنائے واقعات بلا تحقیق (ممکن ہے بعض غلط تذکرہ نویسوں کی تقلید کے خیال سے) داخل کر دیے۔ الحمدللہ کہ نکات الشعراء کے شائع ہو جانے اور دیگر معاصرین میر کے تذکروں کے دستیاب ہونے سے اکثر مشکوک واقعات اب صاف ہو گئے نکات الشعراء کے متعلق آب حیات۔

نکات الشعراء میں ہے "کہ نکات الشعراء شائق شعر کے لئے بہت مفید ہے۔ اس میں شعرائے اُردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے لائق ہیں مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا، ولی کہ نبی شعراء کا آدم ہے اُسکے حق میں فرماتے ہیں۔ وے شاعر یست از شیطان مشہور تر"، مگر واقعات ان سب باتوں کی تردید کرتے ہیں، نکات الشعراء اب شائع ہو گئی ہے اُس کے دیباچہ میں یہ سب باتیں کہیں نہیں ہیں اور نہ اس میں ایک ہزار

شاعروں کا ذکر ہے۔ بلکہ فی الحقیقت تقریباً سو شعرا کا حال ہے نہ اُن کے کلام کی تنقید میں سختی اور بد دماغی سے کام لیا گیا ہے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی عبارت نہایت سلیس اور مبالغے اور استعارے وغیرہ سے پاک و صاف ہے تنقید بھی نہایت مختصر اور زور دار الفاظ میں اور نہایت منصفانہ ہے۔ جہاں کہیں کسی شاعر کا حال زیادہ معلوم نہیں ہے تو صاف لکھ دیتے ہیں کہ فقیر کو اس کے حال سے آگاہی نہیں۔ یا اسی قسم کا کوئی اور جملہ۔ درشت اور طنزیہ جملے کہیں کہیں ہیں مگر بہت کم۔ اور صرف اُسی صورت میں جبکہ کوئی شخص اُس کا مستحق فی الواقع ہے۔ ولی کی نسبت شیطان سے زیادہ مشہور والا فقرہ ہم کو کہیں نہیں ملتا بلکہ برعکس اُس کے اُن کی نسبت تو یہ لکھتے ہیں "کہ از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد" پھر میر صاحب کے مذہب کے متعلق آب حیات میں ہے کہ "میر صاحب کے ماموں حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ اس پر نازک مزاجی غضب۔ غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے" یہ صحیح ہے کہ خان آرزو کے متعلق میر صاحب کی نازک مزاجی یا بد دماغی کا تذکرہ نکات الشعراء میں کہیں پتا نہیں چلتا بلکہ وہ تو اُن کو اپنا اُستاد و پیر و مرشد اور رہنمائے فن وغیرہ ایسے معزز الفاظ سے یاد کرتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب کو دیگر مذاہب کے ساتھ تعصب اور ناروا داری کا ہرگز خیال نہ تھا بلکہ وہ دیگر مذاہب کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے وہ علیحدگی جس کا ذکر مولانا آزاد نے کیا ہے میر صاحب نے اس کے متعلق ذکر میر میں تحریر کیا ہے لیکن ان کے کلام سے کہیں نہیں پایا جاتا کہ انھوں نے خان آرزو کے خلاف کوئی بد وضعی کی۔ ذکر میر میں سراج الدین علیخاں آرزو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کا منت پذیر ہوا اور وہیں کچھ دن رہا اور شہر کے بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں۔ جب میں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب (حافظ محمد حسن) کا خط پہونچا کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے ہرگز اس کی تربیت میں

سعی نہ کی جائے وہ عزیز (آرزو) واقعی دنیادار شخص تھا اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے ہو گیا جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلاوجہ بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے اور طرح طرح سے مجھے تکلیف پہونچانے کی کوشش کرتے میرے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا جیسا کسی دشمن سے ہوتا ہے" اس رنج وغم میں میر صاحب کی حالت جنون کی سی ہو گئی ایک روز خان آرزو نے میر صاحب کو کھانا کھانے کے لئے بلایا اور ناگوار و تلخ باتیں کرنا شروع کیں میر صاحب بغیر کھانا کھائے اُٹھ آئے شام کو اُن کے گھر سے چلے گئے اور پھر کچھ عرصے بعد اُن کی ہمسائگی بھی ترک کر دی آرزو کے شجاع الدولہ کے پاس جانے کے بابت لکھتے ہیں کہ میر خالو بادیہ پیمائے طمع ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب دوسری بیوی سے تھے اور پہلی بیوی سے حافظ محمد حسن جن کے آرزو خالو تھے اور میر صاحب کے سوتیلے خالو ہوئے۔ اُنھوں نے میر صاحب کی کچھ پرورش ضرور کی اور تعلیم میں بھی کچھ حصہ لیا۔ نکات الشعراء میں خان آرزو کے کمالات کا اعتراف ہے اور ذکر میر میں خانگی تعلقات کا بیان۔ پھر آزاد کے بیان سے ایک جگہ مترشح ہوتا ہے کہ میر صاحب نے اپنا تخلص میر سوز سے لیا جو پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ یہ بھی ایک بے بنیاد دعوٰے ہے کیونکہ میر صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں عرصہ سے یہ تخلص کرتا ہوں بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ جب سوز نے یہ دیکھا ہوگا کہ ان کے اچھے اشعار اُن کے ہم تخلص کی طرف منسوب کئے جائیں گے تو اُنھوں نے پہلا تخلص ترک کر کے سوز اختیار کیا ہوگا۔ خواجہ میر درد کی نسبت بھی میر صاحب نہایت عمدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بہت ادب و عزت سے اُن کا نام لیتے ہیں۔ مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ میر صاحب ان لوگوں کا ذکر جو دلی کے رہنے والے نہ تھے اور زبان اُردو سے اسی وجہ سے ناواقف تھے بہت حقارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے اس وجہ سے کہ میر صاحب نے اکثر ایسے شعرا کی بہت کچھ تعریف کی ہے جو دلی کے رہنے والے نہ تھے۔ مثلاً میاں

شرف الدین مضمون کی نسبت یہ دلچسپ الفاظ لکھتے ہیں "متوطن چھاچھو کہ قصبہ ایست متصل اکبر آباد حریف ظریف، بشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلسہا، ہر چند کم بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ"

میر صاحب کا کیریکٹر

اس میں کوئی شک نہیں کہ قسام ازل نے میر صاحب کو انتہا درجہ کی تمکنت، خود داری، اور ایک حساس طبیعت دی تھی۔ وہ اکثر روسا اور امرا کے ارتباط اور میل جول تک کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے کہ مبادا اِس سے اُنکی خودداری پر کوئی حرف نہ آئے۔ وہ بیحد ضابطہ، کم گو، اور آزاد طبیعت واقع ہوئے تھے۔ افلاس اور کم مائگی نے اُن کی عالی ظرفی کو اعلیٰ تر کر دیا۔

نازک دماغی

میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو آزاد نے بڑے مبالغے سے بیان کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نازک مزاج ضرور تھے۔ راجہ ناگرمل جو اُن کا بڑا قدر داں تھا اس کی رفاقت محض اس وجہ سے چھوڑ دی کہ جو معاہدہ وہ اُس کے ایما سے بادشاہی امرا سے کر کے آئے تھے اُس پر اُس نے عمل نہیں کیا۔ ایک امیر راجہ جگل کشور جو محمد شاہ کے عہد میں دیوان بنگالہ تھے اور بڑی ثروت سے بسر کرتے تھے میر صاحب کو گھر سے اٹھا لے گئے۔ اپنے کلام کی اصلاح کی خواہش کی میر صاحب نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور اُن کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔ مگر راجہ جگل کشور نے کچھ خیال نہ کیا اور راجہ ناگرمل سے ملاقات کرا دی اور میر صاحب کی انھوں نے بہت کچھ قدر کی رعایت خاں کی رفاقت میں چند روز رہے۔ ایک روز انھوں نے میر صاحب سے فرمائش کی کہ گویے کو ریختے کے اپنے دو تین شعر یاد کرا دیجیے گا تو وہ گانے کے قاعدے سے درست کر کے گائے گا۔ میر صاحب نے عذر کیا خاں صاحب نے اصرار کیا مگر میر صاحب خانہ نشین ہو گئے اور ان کی ملازمت چھوڑ دی عالمگیر ثانی بادشاہ نے بار بار بلایا مگر میر صاحب نہیں گئے۔ اس کا ایک سبب تو طبعی تھا اور دوسرے یہ کہ انھیں اپنی وضع کا

بڑا پاس تھا اور جب فقر و فاقہ در پے ہو تو وضعداری نبھانے میں نازک مزاجی آ ہی جاتی ہے۔ اُن کی نازک دماغی دوسروں کی ہمدردی کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ بسریع الغیظ اور جلد برہم ہو جانے والے تھے۔ اور اپنی اس کمزوری سے خود بھی واقف تھے چنانچہ اپنے بعض اشعار میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور میر حسن و لطف وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
ازبسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ولہٗ

ہر چند میر بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

ولہٗ

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ولہٗ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

ولہٗ

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی!
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشہ میں ہوں

ہر چند کہ اپنی نسبت بعض اشعار میں اور تذکرہ میں حقیر اور منکسرانہ الفاظ استعمال کئے ہیں اور اپنے شاگردوں کو اپنا دوست بتایا ہے مگر یہ سب بھی اُسی خلقی تمکنت کی ایک شان اور ایک ادا ہے۔ اُن کی مشہور مثنوی اژدگر نامہ جس میں کہ آپنے آپ کو ایک اژدہا قرار دیا ہے اور باقی شاعروں کو چھوٹے چھوٹے جانوروں سے تشبیہ دی ہے کوئی فرضی اور خیالی چیز نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ وہ اُن کے فطری غرور اور بد دماغی کی ایک بین مثال سمجھی جاسکتی ہے۔ اپنے معاصر شاہ حاتم کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں" مرد لیست جاہل و متمکن و مقطع وضع ...... دریافتہ نمی شود کہ ایں رگ کہن بسبب شاعری ست یا وضع او ہمیں ست خوب ست مارا با اینہا چہ کار ...... با من ہم آشنائے بیگانہ است" مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر وہ شخص کو اسی ناروا داری اور کم بینی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنے دوسرے معاصر اور حریف مرزا رفیع سودا کی نسبت اس طرح رطب اللسان ہیں" غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید سرآمد شعراے ہندی اوست بسیار خوش گوست ...... چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید" اسی طرح بعض خود اپنے شاگردوں کی بھی بہت کچھ تعریف کرتے ہیں۔ مگر مولانا آزاد نے اس قدرتی کمزوری کو رنگ اور گل بوٹے لگائے ہیں فرماتے ہیں" اگر یہ غرور و بد دماغی فقط امراء کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی اُنھیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ ہر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنما دھبہ ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔ بزرگوں کی تحریری روایتیں اور تقریری حکایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے کسی اور کی کیا حقیقت ہے" اس سخت اور غیر منصفانہ تنقید سے صاف ظاہر ہے کہ "نکات الشعرا" مولانا آزاد کی نظر سے نہیں گزری بلکہ انھوں نے میر صاحب کے غرور اور بدمزاجی کی اکثر بے بنیاد روایتیں ضعیف اور غیر قابل اعتماد تذکروں سے

علی الخصوص تذکرہ قاسم سے بغیر جانچے ہوئے لیں۔

میر کے کلام میں مایوسی و درد

میر ازل ہی سے دردمند دل لیکر آئے تھے اور اُن کو دُنیا میں سوائے رنج و الم کے کچھ اور نہیں دکھلائی دیتا تھا۔ چنانچہ میر صاحب خود لکھتے ہیں ؎

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ		قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

پھر والد کی درویشانہ زندگی اور تلقین کہ "اے پسر عشق بورز۔ عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است۔ اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست۔ بے عشق زندگی وبال ست دل باختۂ عشق بودن کمال ست عشق بسازد عشق بسوزد۔ در عالم ہر چہ ہست ظہور عشق است ... بے عشق نباید بود۔ بے عشق نباید زیست"۔ چنانچہ جابجا میر صاحب فرماتے ہیں ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو		سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

؎

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے		ایک عشق بھر رہا ہے زمیں آسمان میں

میر صاحب کی تربیت بھی سید امان اللہ کے زیرِ نظر ہوئی جو ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ زمانۂ طفولیت ہی سے شانِ درویشی اور صبر و قناعت پیدا ہوگئی تھی سید صاحب کی بدولت میر صاحب کو بہت سے درویشوں اور اہلِ دل سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اُن کی سوز و گداز بھری باتیں سُننے کا موقع ملا جو اُن کے دل میں اُتر گئیں اور جن کا اثر اُن کی طبیعت اور کلام میں ہمیشہ باقی رہا۔ میر صاحب کی زندگی بھی درد سے معمور رہی ہے۔ بچپن سے ہی مصیبت کا سامنا تھا۔ دس سال کی عمر میں باپ کا انتقال ہوا۔ تلاشِ معاش کے لئے باہر نکلے۔ بڑے بھائی نے بے رخی اختیار کی۔ دلی گئے وہاں بہت تکلیف سے کٹی۔ خان آرزو بھی درپے آزار ہوگئے۔ میر صاحب بہت ہی دل شکستہ

دل گرفتہ رہتے تھے۔ اس پر بے نوائی و بے بسی۔ اس غم و غصّہ میں ایک جنون کی سی حالت ہوگئی اور انھیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی جس سے ان کی وحشت و دیوانگی اور بڑھ گئی۔ اس حالت کا ذکر ذکرِ میر میں موجود ہے اور ان کی مثنوی خواب و خیال میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ قلبی واردات کی تصویر نظر آتی ہے اس کے جستہ جستہ اشعار ذیل میں درج ہیں :-

زمانے نے رکھا مجھے متصل		پراگندہ روزی پراگندہ دل
چلا اکبرآباد سے جس گھڑی		درو بام پر چشم حسرت پڑی
بس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت		بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جورِ گردوں سے خوں ہوگیا		مجھے رکتے رکتے جنوں ہوگیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام		لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
کبھو کف بلب مست رہنے لگا		کبھو سنگ در دست رہنے لگا
نظر آئی اک شکل مہتاب میں		کمی آئی جس سے خور و خواب میں

دلّی میں جب تک رہے روزی کا مستقل ٹھکانہ نہ تھا۔ آج گھر میں اناج تو کل نانِ شبینہ کے محتاج کبھی کبھی فاقہ کی نوبت پہونچی۔ اس فقر و مسکینی میں زندگی بسر کی۔ چنانچہ کلام میں بھی اس حالت کی جھلک موجود ہے ؎

نامرادانہ زیست کرتا تھا		میرؔ کی وضع یاد ہے ہم کو
بہت سعی کیجے تو مر رہیے میرؔ	ولہ	بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے
نہ مل میرؔ اب کے امیروں سے تو	ولہ	ہوئے ہیں فقیر اُن کی دولت سے ہم

پھر دلّی کی بربادی۔ عزیزوں اور خاندانوں کی تباہی۔ آئے دن کے انقلاب رہٹوں۔ جاٹوں۔ دُرّانیوں کی دستبرد و غارت گری اپنی آنکھ سے دیکھیں اور قلم سے لکھیں ؎

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں	وله	تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج وتخت کا
دلِ عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا		اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

مولوی عبدالسلام ندوی نے بہار بیخزاں کی روایت پر لکھا ہے کہ "میر صاحب تیغ عشق کے زخم خوردہ تھے اور ان کے دل پر ابتدا ہی سے یہ چرکہ لگ چکا تھا۔ عمر بھر ان کے دل میں یہ نشتر کھٹکتا رہا۔ اگرچہ یہ ایک راز ہے کہ عام طور پر تذکرہ نویسوں کو اس کی خبر نہیں ہے لیکن بعض تذکروں نے اس کو فاش کر دیا ہے۔ چنانچہ بہار بیخزاں میں ہے کہ بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع وسیل خاطر داشت آخر عشق او خاصہ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بخیہ بچارسوے رسوائی مے کند وحسن بے پردہ بجلوہ گری در آید از ننگ افشاے راز وطن واقربا بادلے بغل پرور دہ حسرت وحرماں دباخاطر ناشاد دست وگریباں قطع رشتہ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ براندازیہا بشہر لکھنو رسید وہمیں جا بصد حسرت جانکاہ جلا وطنی وحرماں نصیبی از دیدار یار ودیار جاں بجہاں آفریں داد۔ تا بقید رشتۂ حیات بود۔ طوق محبت بہ گردن وسلسلۂ دیوانگی بپا داخشت از کلام عاشقانہ و در دانگیزش پیدا است کہ صدآرزو بخاک بردہ"

میر صاحب کے بعض اشعار سے بھی در پردہ اس کی تصدیق ہوتی ہے ؎

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں		تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا		وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

لیکن ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچی۔ اشعار سے اس بات کو ثابت کرنا ایک قیاسی دلیل ہے۔

تصانیف | میر صاحب کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ چونکہ بہت بڑی عمر پائی تھی۔ لہذا تصنیف وتالیف کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ اُن کی تصانیف حسب ذیل ہیں :-

(۱) چھ ضخیم دیوان غزلوں کے

(۲) ایک دیوان فارسی (جو ہنوز شائع نہیں ہوا ہے)

(۳) متعدد مثنویاں

(۴) ایک رسالہ بزبان فارسی موسوم بہ فیض میر جس کے آخر میں چند لطیفے و حکایات ہیں۔ اُن میں بعض بہت فحش ہین اس سے اس زمانہ کا مذاق معلوم ہوتا ہے۔

(۵) ایک تذکرہ بزبان فارسی شعراے اُردو کا موسوم بہ نکات الشعرا دیوانوں میں نہ صرف غزلین ہیں بلکہ رباعیاں۔ مستزاد۔ واسوخت۔ مخمس۔ مسدس۔ ترجیع بند ترکیب بند مطلع۔ تضمینین۔ فردیات غرض کہ جملہ اقسام سخن موجود ہیں دیوانوں کے صدہا صفحے ہیں۔ اور غزلیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے۔ مگر اول توان کی تعداد کم ہے۔ دوسرے بمقابلہ سودا کے قصائد کے وہ زیادہ زوردار نہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی طبیعت غزل گوئی کے واسطے مخصوص تھی قصیدہ کی طرف مائل نہ تھی اسوجہ سے کہ وہ امیروں اور رئیسوں کی خوشامد اور بھٹی سے کوسوں بھاگتے تھے اور نیز یہ کہ استغراق خود داری اور قدرتی کم سخنی انکو بیجا لفاظی کی طرف کسی طرح مائل نہ ہونے دیتی تھی۔ مخمسات بعض مناقب میں ہیں اور بعض شہر آشوب کی صورت میں ہاں جن میں شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانہ کی شکایات ہیں۔

غزلوں کے بعد ان کی مثنویوں کا نمبر ہے جن کی تعداد بھی کثرت سے ہے مثنویاں اکثر عاشقانہ اور بہت مقبول ہین بعض متفرق مضامین پر ہین۔ تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱) مثنوی اجگر نامہ یا اژدر نامہ جس میں میر صاحب کے طبعی غرور اور دیگر معاصرین شعرا کی حقارت کا ایک منظر ہے اس میں اُنھوں نے اپنے آپ کو ایک اژدہا

تصور کیا ہے جو چھوٹے چھوٹے کیڑوں۔ سانپ بچھو وغیرہ کو کہا جاتا ہے اور ان حشرات الارض سے اس زمانہ کے کم مایہ شعرار مراد ہیں۔

(۲) شعلۂ عشق (۳) جوش عشق (۴) دریائے عشق

(۵) اعجاز عشق (۶) خواب و خیال (۷) معاملاتِ عشق

(۸) تنبیہ الجہال جس میں کہ فن نظم اور اس کے مرتبہ کا بیان ہے اُن کے علاوہ تین مثنویاں شکارنامہ کی ہیں جن میں نواب آصف الدولہ کے سیر و شکار کا حال ہے۔ کچھ اور چھوٹی چھوٹی نظمیں ایسی چیزوں کے متعلق بھی ہیں جن سے میر صاحب کو بہت انس تھا۔ مثلاً کتا۔ بلی۔ بکری وغیرہ۔ ایک مثنوی مرغباز اں۔ ایک ہیں موسم برسات اور اس کی تکلیفوں کا خاص کر اپنے گھر کا حال بیان کیا ہے جو بارش کی شدت سے گر گیا تھا۔ اسی طرح ایک میں سفر برسات کا ذکر ہے ایک چھوٹی سی مثنوی جھوٹ کی طرف سے خطاب کرکے لکھی ہے۔ کچھ مرثیے بھی لکھے ہیں مگر وہ چنداں قابل ذکر نہیں۔ تاریخ گوئی کا ان کو مطلق شوق نہ تھا۔ ایک ساقی نامہ بھی ہے۔

میر صاحب کی ایجادیں | میر صاحب اردو واسوخت کے موجد تسلیم کئے گئے ہیں اسی طرح اردو میں مثلث و مربع یعنی تین اور چار مصرعوں کی نظمیں بھی انھیں کی ایجاد ہیں۔ بعض فارسی کے شعروں کو تضمین کرکے کبھی مثلث کیا ہے اور کبھی مربع مثلاً اہلی شیرازی کا شعر ہے۔

امروز یقین شد کہ نہ داری سر اہلی	بیچارہ ز لطفِ تو غلط داشت گمانہا

اسپر میر صاحب نے ایک مصرعہ لگا کے اس طرح مطلب پورا کیا۔

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی پہلی	امروز یقین شد کہ نہ داری سر اہلی
بیچارہ ز لطفِ تو غلط داشت گمانہا	

میر صاحب کی شہرت خاصکر ان کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے۔ غزلوں

ہیں تو فی الحقیقت ان کا جواب نہیں مگر مثنویاں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو نہیں پہونچتیں پھر بھی ان کی بیساختگی اور فصیح البیانی و سادگی قابل داد ہے۔ دیوان فارسی بقول مصحفی ایک سال میں تیار ہوا تھا جب کہ ریختہ کہنا موقوف کر دیا تھا۔

تذکرۂ نکات الشعراء یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ عیسوی میں لکھا گیا یہ حسب دعوائے مصنف شعرائے اردو کا سب سے پہلا تذکرہ ہے اور واقعی نہایت دلچسپ اور مفید ہے افسوس ہے اس میں حالات زیادہ تفصیل سے نہیں دیئے گئے مگر پھر بھی جو باتیں معاصر شعراء کے متعلق اس میں ملتی ہیں وہ بہت کچھ قابل قدر ہیں جن شعراء کا ذکر ہے ان کا کلام بھی بطور نمونہ کے دیا گیا ہے۔

میر صاحب کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ میر صاحب نے اکثر فارسی ترکیبیں یا ان کے ترجمہ کو اردو میں داخل کر کے اس کو ریختہ بنایا۔ آزاد نے آبحیات میں اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ مثلاً

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا		پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا
دل کہ یک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش		ایک عالم کے سر بلا لایا
لے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائیگا		یہ قافلہ رہے گا نہ زنہار جائیگا

ترجمہ کی مثال

	گل کو محبوب ہم قیاس کیا	فرق نکلا بہت جو باس کیا	

باس کرنا یا بو کرنا فارسی ،بو کردن، کا ترجمہ ہے بمعنی سونگھنا

ان میں سے اکثر چیزیں پسند عام ہو کر منظور ہوئیں بہت سی ناپسند ٹھہریں جو رفتہ رفتہ متروک ہو گئیں۔ میر صاحب کے خیالات ریختہ کے متعلق جو نکات الشعراء کے آخر میں دیئے ہوئے ہیں خود انھی کی زبان سے سننے کے لائق ہیں فرماتے ہیں۔

بدانکہ ریختہ بر چندیں قسم ست۔ از انجملہ انچہ معلوم فقیر است نوشتہ می آید اوّل

آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی۔ چنانچہ قطعۂ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کہ نوشتہ[1] شد۔ دوم آنکہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی۔ چنانچہ شعر مرزا معز کہ نوشتہ آمد۔ سوم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار می برند، و این قبیح است چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آن جائز است۔ و این را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آن معیوب است و دانستن این نیز موقوف سلیقہ شاعری است و مختار فقیر ہم ہمیں است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔ پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف درین فن رواج داشت اکنوں طبعہا مصروف این صنعت کم است مگر بسیار شستگی بستہ بشود۔ معنی ایہام این است کہ لفظے کہ براو بنائے بیت بود آن دو معنی داشتہ باشد یکی قریب و یکی بعید و بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک او ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آن محیط ہمہ صنعتہا است تجنیس ترصیع۔ تشبیہ، صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ۔ این ہمہ در ضمن ہمین ست و فقیر ہم ازہمیں وتیرہ محظوظم۔ ہر کہ را دریں فن طرز خاصی است این معنی را می فہمد با عوام کار ندارم "

میر بحیثیت شاعر | عام طور پر اردو شاعری اردو تغزل کی مرادف ہے اور میر صاحب غزل گوئی میں مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہین۔ لہذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میر صاحب زبان اردو کے سب سے بڑے شاعر اور مسلم الثبوت اُستاد تھے میر صاحب کا پایہ مثنوی نویسی میں بھی بہت بلند ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل گوئی میں ان کا جواب نہیں اور اس مملکت میں وہ متفرد اور تن تنہا حکمران ہین۔ ان کے اشعار صاف۔ سادہ۔ فصیح

	زرگر پسرے چو ماہ پارہ نقد دل من گرفت و شکست	کچھ گھڑئے سنوارئے پکارا پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا	

[1] (table above)

[2] از زلف سیاہ تو بدل۔ دوم پری ہے ❊ در خانۂ آئینہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ گنا جوم پری ہے ۱۲

اور تیر و نشتر کا کام دینے والے درد و اثر سے مملو ہوتے ہیں ان میں دلکشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اظہار جذبات چستی بندش اور ترنم میں وہ اپنی آپ نظیر ہیں ان کے اکثر اشعار میں وہ ایک خاص کیفیت ہے جو سحر یا طلسم سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور جو تمام زبانوں کی حقیقی اور سچی شاعری کا طغراے امتیاز ہے میر صاحب کے بہتّر نشتر مشہور ہیں۔ مگر سچ پوچھیے تو ان کے صدہا ایسے شعر نکلیں گے جن میں حقیقی شاعری کے اوصاف بدرجۂ احسن موجود ہیں۔ جب کوئی پھڑکتا ہوا شعر سُنا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ انھیں بہتر نشتروں میں سے ہے۔ زبان شستہ کلام صاف بیان ایسا پاکیزہ اور دل آویز جیسی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اردو کے شیخ سعدی ہیں۔ ان کا کلام اکسیر شاعری ہے علی الخصوص چھوٹی بحروں کے تو وہ بادشاہ ہیں اور ہمارے نزدیک تو بڑی بحروں میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے ان کے کلام میں جو حزن و ملال حسرت و مایوسی سے مملو ہے وہی ان کی شاعری کی جان ہے یہی ناامیدی اور یاس اُن کی غزلوں کو زوردار اور مؤثر بناتی ہے میر صاحب شاعری اور زباں دانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عام طور پر لوگ ان کو خدائے سخن کہتے ہیں۔ غالب و ناسخ اور نیز تمام مشاہیر جو ان کے بعد ہوے ان کی عظمت اور استادی کے معترف تھے اور یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ وہ اپنے ہی زمانے میں بہت بڑے شاعر مانے جاتے تھے ان کے معاصر اور نیز بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے ان کی بیحد تعریف کی ہے۔ اور نہایت رنگین عبارت اور مبالغہ آمیز کلمات ان کی نسبت استعمال کئے ہیں۔ شاعر اور نثار دونوں ان کی تعریف کے معاملہ میں باہم مسابقت کرتے معلوم ہوتے ہیں اور آرٹ اور نیچر دونوں میں ان کے کمال کی مدح سرائی کے الفاظ و اصطلاحات ڈھونڈتے ہیں مثلاً میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ سرآمد شعراے ہند اور اپنے وقت کے افصح الفصحا اور بے نظیر و بے عدیل شاعر تھے اسی طرح مرزا علی لطف تذکرۂ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں کہ

"جو شخص کہ نظارہ گاہِ سخن میں چشم خوردہ بین رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیرین رکھتا ہے تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے کہ میر شیرین مقال ہیں اور ریختہ گویان سابق وحال ہیں نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سپید و سیاہ ہے" صاحب طبقات الشعراء لکھتے ہیں "مجموعہ قابلیت و ہنر صاحب طبع خوش فکر سرآمد مشہوران عصر محاورہ داں ومتین ہتلاشی مضامین نو و رنگین متجسس الفاظ چرب و شیرین در میدان غزل پردازی گوئے فصاحت از معاصران مے بردو ہرچند سادہ گو است اما در سادہ گوئی پرکار بیا دارد" حقیقت یہ ہے کہ میر و مرزا دونوں اپنے مابعد کے شعرا کے واسطے ایک صحیح نمونہ اور سرچشمۂ فیض تھے ان کے کلام کی حلاوت و دل آویزی ان کے اشعار کا درد و اثر اور رنگینی آج تک مشہور ہیں بلکہ جب تک زبان اردو قائم ہے مشہور رہیں گی۔

میر اور سودا کا مقابلہ میر صاحب کی شہرت ان کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے اور سودا قصیدہ اور ہجو کے استاد مانے جاتے ہیں۔ خود سودا کے زمانے میں یہی خیال اکثر ارباب فن کا تھا چنانچہ حکیم قدرت اللہ خان قاسم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی بوئے (میر تقی) نرسیدہ اما حق آنست کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگرست، مرزا دریائیست بیکراں و میر نہریست عظیم الشان۔ در معلومات قواعد میر را بر میرزا برتریست و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری"۔ اسی طرح ایک مشہور صاحبدل خواجہ باسط نے جو علاوہ کمالات عرفان و تصوف کے فن نقد میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اس مشکل اور نازک مسئلہ یعنی میر و مرزا کی شاعری کے فرق کو نہایت مختصر الفاظ میں فیصلہ کر دیا اور فرمایا "دونوں صاحب کمال ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ ہے"۔ اسی فرق کو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں امیر مینائی نے بھی

اپنے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑے شاعر اور اپنے اپنے طرز کے استاد تھے ۔ہماری ناچیز رائے میں ان دونوں بزرگواروں کے طرز کلام کا فرق ان کے مزاج اور طبیعت کے فرق پر بہت کچھ مبنی ہے ۔میر صاحب قدرتاً حزیں اور غمگین واقع ہوئے تھے ان کی زندگی حزن و یاس اور مصائب و ادبار کا نمونہ تھی ۔اس پر طرہ یہ کہ خودداری اور عزت کا ان کو بیحد احساس تھا جس سے وہ مجبور ہو گئے تھے کہ عزلت اور تلخکامی کی زندگی بسر کریں اسی وجہ سے عمر بھر تلخابۂ حیات پیتے رہے بزم طرب اور محفل سرور کے وہ فطرۃً اہل نہ تھے خوشی اور بشاشی کا حصہ قسام ازل نے ان کو دیا ہی نہ تھا برعکس اس کے سودا نہایت شگفتہ مزاج اور رنگین طبع واقع ہوئے تھے وارستگی اور آزادی ان کی طبیعت کا اصلی جوہر تھا خوشی و خرمی زندہ دلی اور ظرافت سے اُبلے پڑتے تھے خوشی کے مجمعوں اور ہنسی مذاق کے جلسوں کے روح رواں تھے جہاں ان کی قابلیت خدا داد کے جوہر کھلتے تھے ۔زندگی نہایت فارغ البالی اور شاد کامی سے بسر کرتے تھے ۔نظر بریں ان دونوں کی شاعری ان کے خیالات اور ان کے مزاج اور دنیا کے ساتھ ان کے برتاؤ کا بہترین آئینہ کہی جا سکتی ہے اسی طرح ان دونوں کے اپنی اپنی شاعری کے واسطے منتخب کیے ہوئے الفاظ بھی ان کے حسب مزاج اور موافق حال ہیں ظاہر ہے کہ درد و اثر کے لئے الفاظ نہایت نرم اور صاف و سادہ اور بندش نہایت سلیس اور بے تکلف ہونی چاہیئے اور یہی طرز غزل کے واسطے زیادہ موزوں ہے ۔علی الخصوص چھوٹی چھوٹی بحروں کے لئے جس میں کہ میر صاحب کی شاعری اپنے عروج کمال پر دکھائی دیتی ہے ۔ برعکس اس کے قصیدہ کے لئے شاندار الفاظ، علوئے مضامین، نادر تشبیہوں اور استعاروں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ قصیدہ کہنا ایک پژمردہ اور دل گرفتہ آدمی کا کام نہیں ۔ عاشقانہ خیالات مثلاً مصائب ہجر و فراق وغیرہ کے دردناک

حالات جن بے تکلف اور سیدھے سادے الفاظ سے ظاہر ہو سکتے ہیں وہ قصیدہ کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہیں۔ میر درد اثر اور سادگی کے مسلم الثبوت استاد ہیں ان کے وہ اشعار جو بہتر نشتر کے فرضی نام سے مشہور ہیں سب خود انھیں کے سچے اور دلی جذبات کا پرتو ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تخیل سے اسمیں رنگ آمیزی مطلق نہیں کی ہے۔

میر کی زندگی ایک درد والم کی زندگی ہے اور انگریزی شاعر شیلی کی یہ سطور ان کے حسب حال ہیں "حرماں نصیب لوگ غلطی سے گہوارۂ شعر میں ڈال دیئے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں"

اسی وجہ سے میر کے بہترین اور سب سے زیادہ موثر شعر وہی ہیں جن میں درد والم کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ سودا کے کلام میں میر کا سا درد نہیں میر کے اشعار غمگین اور چوٹیلے دلوں پر خاص اثر کرتے ہیں۔ ان کا قصہ غم کا قصہ ہے۔ وہ زندگی کا وہ رُخ جو یاس اور غم سے بھرا ہوا ہے نہایت آب وتاب اور سچائی سے پیش کرتے ہیں۔ برخلاف اسکے سودا اس کا دوسرا رخ دکھلاتے ہیں جو امید اور خوشی سے مملو ہے سودا کے اشعار پڑھنے والے کے لئے سامان طرب و نشاط مہیا کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت کسی محدود دائرے میں مقید رہنا پسند نہیں کرتی وہ جذبات کے تنگ عالم سے نکل جانا چاہتے ہیں اور ایک وسیع جولانگاہ اپنے اظہار خیال کے لئے تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے نئی نئی راہیں نکالیں اور ان کے اشعار ایک ایسے گلدستہ کا مزا دیتے ہیں جو انواع واقسام کے مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے بنا ہوتا ہے۔ انھوں نے انقباضی جذبات کو چھوڑ کر انبساطی جذبات کو بہت کچھ وسعت دی ہے میر کی دنیا تاریکی اور غم سے بھری ہوئی ہے جس میں کہ امید کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ ان کے تمام اشعار اس مقولہ کے تحت میں ہیں "جو کوئی اس غمکدہ میں قدم رکھے امید کو پیچھے چھوڑ

آئے"۔ میر کی ہنسی اور مذاق بناوٹی اوران کی طعن و تشنیع مصنوعی ہے یہ کہنا صحیح نہیں کہ میر نے ہجو اور قصیدہ نہیں لکھا فی الحقیقت ان دونوں صنفوں میں انھوں نے طبع آزمائی کی مگر چونکہ طبیعت ان اصناف کے واسطے موزوں نہیں پائی تھی لہذا ناکام رہے یہ بھی کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے مزاج کی خودداری اور دولت و اقتدار کی بے پروائی کی وجہ سے ان اصناف سخن میں سربسبز نہ ہوتے انھوں نے اجگرنامہ ضرور لکھا مگر وہ سودا کی ہجوں کا عشر عشیر بھی نہیں اسی طرح ان کے قصائد جو نواب آصف الدولہ کی تعریف مین ہیں، سودا کے قصائد کے سامنے ہیچ ہیں۔

دونوں بزرگوار میر اور سودا، حقیقت اور اصلیت بیان کرنے کے بادشاہ ہیں دونوں وہ کامل مصور ہیں جو خیالی تصاویر نظم مین ایسی خوبصورتی اور جزئیات کی تفصیل کے ساتھ کھینچتے ہیں کہ انکے لفظی مرقعے ہمارے دل کی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہین۔ یہ مرقع نگاری داخلی یا خارجی یعنی جذبات انسانی یا مناظر قدرت دونوں کی ہوسکتی ہے۔ پس جہاں تک کہ جذبات انسانی اور علی الخصوص درد و غم کے جذبات کا تعلق ہے ان کے اعلام و اظہار میں میر صاحب منفرد ہیں۔ مگر ان کے سوا دیگر جذبات پر سودا کو کمال حاصل ہے۔ سودا کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جن مضامین کی وہ اپنے اشعار میں تصویر کھینچنا چاہتے ہیں اُن کے مالہ اور ماعلیہ کا ان کو بدرجہ کمال علم ہوتا ہے۔ میر صاحب اپنی افتاد طبیعت، اپنی نازک عادات اور اپنے استغراق خودی کی وجہ سے مجبوراً فطرت انسانی کا مطالعہ اس وسیع النظری سے نہیں کرسکتے انکی محدود نظر اسی استغراق اور خود بینی کا نتیجہ ہے وہ اپنے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے ان کو اپنے کام مین اس قدر انہماک اور توغل تھا کہ سات برس تک اپنے کمرہ کے پائیں باغ کو نظر اُٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اس انہماک سے اتنا ضرور ہوا کہ

وہ اپنے خاص کام میں یکتائے زمانہ ہو گئے۔ وہ تنوع جو سودا کے کلام کی جان ہے میر صاحب کے یہاں مفقود ہے۔ سودا کی تصاویر نہایت رنگین اور خوشنما ہوتی ہیں بخلاف میر صاحب کے جن کی دنیا مایوسیوں سے تیرہ و تار جس کے پھول پژمردہ و افسردہ جن کی زمین تکلیفوں اور مصیبتوں کی قیام گاہ اور جس کا آسمان آلام و مصائب کی جائے پناہ ایسے عالم میں مفر کا بس یہی طریقہ ہوتا ہے کہ یا سکوت و محویت اختیار کی جائے یا نالہ و زاری سے دل کی بھڑاس نکالی جائے یا عالمِ خواب کی سیر کی جائے مگر وہ خواب بھی قوت متخیلہ ہی کے پیدا کئے ہوئے خواب پریشان ہوتے ہیں برخلاف اس کے سودا کی دنیا جیتی جاگتی دنیا ہے جس میں بجائے تاریکی کے امید کی روشنی جلوہ گر جس کے باغ سرسبز و شاداب۔ جس میں بادِ صبا خوبصورت پھولوں اور نازک نازک پتیوں کے ساتھ ہر وقت اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہے۔

تشبیہیں اور استعارے ہر شاعری کے جزو اعظم مگر خصوصیت سے مشرقی شاعری کی تو وہ جان ہیں۔ اگر اُستادی کے ساتھ برتے جائیں تو شعر کے حُسن میں وہ چار چاند لگا دیتے ہیں۔ سودا وہ استاد ہے جو ان کے صحیح استعمال پر قادر ہے اسکے یہاں دلچسپ تشبیہیں اور نادر استعارے میر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ وہ ان مختلف علوم و فنون سے بھی جن کو وہ شعر میں استعمال کرتا ہے بہ نسبت میر کے زیادہ واقف ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ سودا کی اکثر غزلوں میں قصیدہ کی شان پیدا ہو جاتی ہے اسکی کم و بیش یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ شاعر کا زبردست تخیل بعض وقت اس کو ایسے مضامین اور الفاظ سُجھاتا ہے جو غزلیت سے میل نہیں کھاتے وہ اپنی بلند پروازی اور تخیل کی تیزی کو روک نہیں سکتا۔ میر صاحب کے یہاں ایسے عیوب نہیں ہیں۔ سودا اس قسم کے اشعار ان قواعد کے ضرور خلاف ہیں جو ترتیب غزل کے واسطے مقرر ہوگئے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسی قسم کے شعر علیحدہ علیحدہ دیکھے اور

جانچے جائیں تو ان کی عمدگی اور کمال میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ ترتیب غزل کے قواعد سے استغنا اور بے پروائی متاخرین شعرائے فارسی کی تتبع میں ہے جن جن کے قدم بہ قدم اردو شعرا چلنا چاہتے ہیں نظم فارسی کی آخری منزل ارتقا میں غزل کا محدود دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اس میں بہت سی چیزیں مثلاً فلسفۂ مذہب، اخلاق تصوف اور دیگر علوم و فنون وغیرہ سب شامل کر لیے گئے تھے۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ عاشقانہ رنگ یا عشق مرتب اور منظم ہو کر سائنس کے درجہ پر پہونچ گیا تھا۔ اردو شاعری جو فارسی کی تتبع تھی اس انقلاب سے اس نے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ آخرالذکر مضامین سے بہرہ اندوزی بہ نسبت دل کے دماغ زیادہ کرتا ہے یعنی جس قدر ان مضامین کی کثرت ہوتی ہے اتنی ہی درد و اثر کی کمی ہو جاتی ہے۔ قصیدہ کی شان اور غزل کے رنگ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہمارے زمانہ کے نوآموز شعرا کے کلام میں جو سودا اور غالب وغیرہ ایسے استادوں کی تقلید کرنا چاہتے ہیں بخوبی نمایاں ہے۔

سودا اور میر دونوں موسیقیت الفاظ کے استاد ہیں ان کے شعر سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ بندش نہایت چست۔ اور زوائد سے پاک ہوتے ہیں نشست الفاظ پر سودا کو زیادہ توجہ تھی وہ ہر شعر کو اپنی جگہ پر مکمل بنانا چاہتے ہیں جو خود ایک بہت بڑا فن ہے شاذ و نادر معنی میں گنجلک بھی پیدا ہو جاتی ہے دونوں استاد دور از کار تلمیحات اور تشبیہات سے بچتے ہیں اگرچہ سودا کے یہاں کبھی کبھی اس قسم کی غلطی ہو جاتی ہے دونوں استادان فن کے کلام کا مقابلہ ایک کار آمد اور قیمتی چیز ہے اس وجہ سے کہ دونوں ہم عصر تھے اور متحدہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم طرح غزلیں کہی جاتی تھیں جن کا مقابلہ اس لیے بہت دلچسپ ہے

کہ اس سے دونوں کے مختلف مزاج اور طبیعت اور نیز انداز بیان کے فرق کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ دونوں کے کلام میں اس عہد کے بعض نقائص بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں دونوں کے یہاں کبھی کبھی مبتذل اور فحش الفاظ استعمال ہوئے ہیں بعض اوقات مضمون شعر میں فحش ہوتا ہے کہیں اختلاف تذکیر و تانیث اور شتر گربہ ہے اکثر اشعار معمولی بلکہ پھیکے اور بے مزہ بھی ہیں۔ میر صاحب کہیں کہیں ایہام بھی برتتے ہیں امرد پرستی جو اس زمانہ کی شاعری کا ایک قبیح موضوع ہے دونوں کے کلام میں جابجا پائی جاتی ہے

مختصر یہ کہ وسعت نظر، تنوع خیالات، جزئیات کے بیان کی قدرت دنیاوی معاملات کی واقفیت، اور سب سے بڑھ کے یہ کہ مذاق اور ظرافت میں سودا کو میر پر برتری ہے۔ سادگی الفاظ، سلاست زبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر فصاحت و بلاغت، اور تصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے کسی کا قول ہے اور سچ کہا ہے کہ دونوں کا کلام بیش بہا جواہر ہیں۔ میر صاحب کے یہاں صرف ہیرے ہیں سودا کے یہاں ہیروں کے علاوہ موتی، زمرد، اور یاقوت بھی بکثرت پائے جاتے ہیں سچی کسوٹی پر کھنے والے کا مزاج اور مذاق ہے" [۱]

اس عہد کے دیگر شعرا اس عہد میں ان دو بزرگواروں کے علاوہ اور بھی بہت سے شاعر گزرے ہیں مگر چونکہ وہ کثرت سے ہیں اور اُن کے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں لہذا یہاں اُن کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے ناظرین کو اگر ان کے کلام یا حال کے دریافت کرنے کا اشتیاق ہو تو اس عہد کے یا بعد کے تذکرے ملاحظہ کریں [۲]

---

[۱] میر و مرزا کے کلام کے مقابلہ کے لئے دیکھو بقا کے اشعار صفحہ ۲۰۴۔

[۲] اس عہد کے بعض شعرا کا حال مختصراً باب ، کے آخر میں بیان کیا گیا ہے دیکھو صفحہ ۲۰۹

باب ۷

اساتذۂ دہلی

طبقۂ متاخرین

انشاؔ اور مصحفیؔ کا زمانہ

طبقات کی ترتیب اس دَور کی ترقیاں

شعرا کے طبقات کی ترتیب کوئی فرضی چیز نہیں جیسا کہ بادی النظر میں وہ معلوم ہوتی ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ اکثر شعرا ایک دور کے ماقبل کے دور کے بعض شعرا کے معاصر رہے ہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ مابعد کے دَور کے شاعر دور ماقبل مین نوجوان اور نوآموز تھے اور اس وقت انھون نے کوئی شہرت نہیں حاصل کی تھی اور دَور ماقبل کے شاعر کہن سال، مشاق اور مشہور ہو چکے تھے، اسکے علاوہ زبان کا فرق بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے اس دور میں بمقابلہ دور ماقبل کے زبان اور نیز بندش کے اعتبار سے شعر میں بہت کچھ ترقی ہوئی بہت سے پُرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہوگئیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لی۔ اس معاملہ میں زبان اُردو انشار کی بہت احسان مند ہے جنھوں نے اس کی ترقی اور توسیع کے لئے بہت سے نئے تجارب اختیار کیے مصحفی البتہ قدما کے پیرو تھے جنھوں نے نظم کی قدیم روایات کو جاری رکھا جرأت بھی غزل میں میر کے پیرو تھے۔

شاعری دربار سے وابستہ ہوگئی

اس دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نظم اُردو کو

دربار کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ دور ماقبل کے شعرا رگو اپنے سرپرستوں سے انعام و اکرام اور وظیفے اور تنخواہیں پاتے تھے مگر اپنی آزادی اور خودداری کو ہمیشہ قائم رکھتے رہے وہ اپنی حیثیت ایک ملازم کی کبھی نہیں سمجھتے تھے اس دور میں یہ خرابی ہوئی کہ گو شعرا کی قدر دانی اور سرپرستی بڑھ گئی مگر ان کی خودداری اور عزت و آبرو کم ہو گئی شاعری کا اب صرف یہ کام رہ گیا کہ اس سے امیر و رئیس خوش کیے جائیں شاعر لوگ اپنے سرپرستوں کے چشم و آبرو ہر وقت دیکھتے تھے اور چونکہ ان کا دل خوش کرنا مقصود تھا لہذا اشعار بھی انھیں کے مزاج اور مذاق کے موافق کہے جاتے تھے مختصر یہ کہ اس دور کے شعرا نقال اور مسخرے پہلے تھے اور شاعر بعد کو۔ اب شاعری حصول زر کا ایک کامیاب ذریعہ ہو گئی تھی اور شاعر اُمرا اور رؤسا کے درباروں میں پہونچنا بلکہ اپنے مالکوں کے مزاج میں در خور حاصل کرنا بس یہی اپنا فخر سمجھتے تھے اس کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپس ہی میں سخت رقابت اور بد مزگی شعرا میں پیدا ہو گئی۔ اس کے قبل بھی اس قسم کی بدمزگیاں ظہور میں آئی تھیں مگر وہ فن سے متعلق اور حدود شائستگی کے اندر ہوتی تھیں۔ اب چونکہ شاعری امیر رسی کا ایک ذریعہ ہو گئی تھی لہذا شاعر ایک دوسرے سے سخت رقابت اور عداوت برتتے تھے۔ اور ان کے آپس کے شاعرانہ مقابلے اب تہذیب و شائستگی کی حد سے گزر کے گالی گلوج اور لپاڈگی کے درجہ تک پہونچ جاتے تھے۔ چنانچہ انشا اور مصحفی کے ہنگامے اس زمانہ کی تاریخ شاعری پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہیں۔

اس وابستگی کے خراب نتائج

شاعری کی اس درباری وابستگی کا ایک خراب نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی متانت اور پاکیزگی اور علوئے خیال میں بہت فرق آگیا۔ درباری اثر سے اسکی آئندہ ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ خیالات میں نفاست اور پاکیزگی کم ہو گئی شعر کی روحانیت اور بلند پروازی مفقود ہو گئی۔ معشوق سے اب تک عموماً معشوق حقیقی مراد

ہوتا تھا اب بجائے اسکے کوئی لونڈا یا رنڈی، جن کی ایسے عیش پرست درباروں میں کمی نہ تھی سمجھا جانے لگا۔ شہوانی جذبات بے تکلفی کے ساتھ بکثرت نظم ہونے لگے کیونکہ عیاش امرا اور ان کے مصاحبین اسی قسم کے اشعار سے خوش ہوتے تھے اور اسی قسم کے فواحش پر انعام و اکرام دیتے تھے۔ دلی کی یہ حالت نہ تھی یہاں کے شعرا میں، گوکہ وظائف اور تنخواہیں وہ بھی پاتے تھے، متانت اور سنجیدگی اور آزادی مزاج ابتک باقی تھی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہاں عموماً شاعری تصوف و عرفان کی گود میں پلی۔ شعر گوئی ایک مقدس ہو معزز مشغلہ سمجھی جاتی تھی۔ اہل اللہ کے دائروں اور خانقاہوں میں اس کی نشو ونما ہوئی۔ شاہ گلشن، خواجہ میر درد۔ مرزا مظہر جانجاناں، یہ سب مشہور اہل دل بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے شاعری کو بہت کچھ تحریک و ترقی دی۔ لکھنؤ میں برعکس اس کے شاعری کے سر پر سے روحانیت اور تصوف کا سایہ اُٹھ گیا اور اب وہ دربار سے متعلق ہوگئی۔ اب شاعر ولی ہونے کی نہیں بلکہ دربار رس ہونے کی تمنا کرتے تھے یہ سچ ہے کہ کچھ ایسے لوگ جو دلی چھوڑ کر لکھنؤ آگئے تھے کچھ دنوں یہاں کی ہوا اور خراب صحبت سے بچتے رہے مگر رفتہ رفتہ طمع اور شہرت پسندی اور سب سے زیادہ اس زمانہ کے بگڑے ہوئے مذاق نے ان کو اپنی راہ پر آخر لگا ہی لیا۔

ریختی ایک جدید صنف شاعری، یعنی ریختی، جس کو اس انحطاط مذاق کا بد ترین نمونہ سمجھنا چاہیے اسی دور میں آئی اس کے موجد سعادت یار خان رنگین تھے جنھوں نے اپنے زمانہ کے مدرسہ تعیش میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے تمام مدارج عیاشی و آوارگی کو یکے بعد دیگرے بہ تمام و کمال طے کیا تھا۔ ان کا کلام عورتوں کی زبان میں ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ عیاش مزاج لوگوں کو بہت دلچسپ معلوم ہوتا تھا مگر حقیقت میں سوائے فحش اور ابتذال کے اس میں اور کچھ نہ تھا انشا نے بھی بہت کچھ اس میں حصہ لیا۔

اس عہد میں فن شعر گوئی کو بہت قوت حاصل ہوئی اور کثرت مزاولت سے شعرا نے من حیث الفن بڑی ترقی کی۔ اگرچہ شیریں کلامی اور بلند خیالی شعر میں کم ہوگئی مگر تکمیل فن نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ اظہار قابلیت کی غرض سے لوگ مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور پھر وہ ایک نہیں بلکہ صدہا اسی قسم کی غزلیں کہہ ڈالتے تھے جو ان کے کمال کا نمونہ تو ضرور ہیں مگر وہ قدما کا درد و اثر اور صحیح جذبات کا ان میں نام نہیں۔ اس عہد کے شعرا نے شعر کی ظاہری درستی کی طرف جو خاص توجہ کی تھی وہی آئندہ چل کر ناسخ وغیرہ کے زمانہ میں ایک طرز خاص بن گئی۔

فنی مباحث کو چھوڑ کر شعرا نے شاعری کو حصول زر اور کسب معاش کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور وہ مباحث اب درباری نزاعوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے میاں مصحفی جو صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ کے استاد تھے انشا نے ان کو اس جلیل القدر درجہ سے ہٹانا چاہا اور یہ امر ایک عظیم الشان جنگ کا باعث ہوا جس کا تذکروں میں بالتفصیل ذکر ہے اس کی ابتدا تو معمولی طریقہ سے ہوئی تھی مگر آخر کو وہ بھکڑ مچا کہ خدا کی پناہ! ان کے مربی اس تھکا فضیحتی کا دور سے تماشہ دیکھتے تھے اور ان کے مہملات کی داد دیکر جانبین کی آتش حسد و نفاق کو اور بھڑکاتے تھے بالآخر شاعروں نے قلم ہاتھ سے رکھ کر لاٹھی پونگے اٹھا لئے اور بے تکلف ایک دوسرے سے دست و گریبان بلکہ ایک دوسرے کی جان اور عزت و آبرو کے درپے ہو گئے۔ سچ پوچھئے تو اس قسم کی لغو اور بیہودہ نظموں سے شاعری کی تہذیب و متانت میں فرق آ گیا اور مصحفی و انشا کی اس قسم کی نظمیں اب اس زمانہ کے پرشور مذاق اور بھکڑ کا ایک نمونہ رہ گئی ہیں جن کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے مگر رنج بھی ضرور ہوتا ہے۔

ہزل گویان اُردو | اس موقع پر چند ہزل گویان اردو کا بھی کچھ ذکر کر دینا ضروری ہے۔ حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں۔ میر اثل نارنولی۔ میر جعفر زٹل۔ زانی۔ چرکین۔ افسق

میر غلام حسین برہان پوری شاگرد زانی ۔ یہ منشی لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے ہمعصر تھے اور شفیق نے افسق کا ذکر اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں کیا ہے ۔

انشار متوفی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ عیسوی

سید انشار اللہ خان متخلص بہ انشا خلف حکیم میر ماشار اللہ خان انکے بزرگ نجف سے آئے تھے اور دلی میں بس گئے تھے رفتہ رفتہ امرائے شاہی مین داخل ہوئے انشا کے والد شاہی طبیب تھے اور کچھ شعر بھی کہتے تھے اور مصدر تخلص کرتے تھے ۔زوال سلطنت کے زمانہ مین وہ مرشد آباد گئے جو نوابان بنگالہ کا دارالحکومت تھا اور یہیں سید انشا کی ولادت ہوئی ۔ابتدائے عمر میں علوم رسمیہ اپنے والد ہی سے حاصل کئے شعر کہنے کا شوق انکو بچپن سے تھا کبھی کبھی والد سے اصلاح لیتے تھے مگر زیادہ تر اپنی طبیعت خداداد اور فطری ذہانت سے کام لیتے تھے انشا مرشد آباد چھوڑ کر شاہ عالم کے زمانہ میں دلی آئے ۔شاہ عالم اب محض برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور شاعروں کے بڑے قدر دان تھے انھون نے انشا کی بڑی قدر کی دربار اس وقت بالکل لٹا پٹا تھا مگر پھر بھی اس قدر دان بادشاہ نے اس جوان ہمت اور جوان طبیعت شاعر کو نظر شفقت و عنایت سے دیکھا اور اس کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا ۔ سید انشا اہل دربار میں داخل ہوئے اور انھوں نے بھی وہ وہ لطیفے اور چٹکلے بادشاہ اور اہل دربار کو سنانا شروع کئے کہ پھر تو یہ عالم ہوا کہ ان کی تھوڑی دیر کی بھی جدائی بادشاہ کو ناگوار ہوتی تھی آخر کار دلی کی تباہی سے بددل ہو کر اور نیز اس خیال سے کہ انکی قابلیت کے موافق یہاں انکی قدر نہیں ہوتی تھی اور خاص کر مرزا عظیم بیگ کے مناقشہ کی وجہ سے انشا نے لکھنو کا رخ کیا جو اس زمانہ میں دہلی سے نکلے ہوئے شعرا اور دیگر باکمالوں کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا ۔

یہاں پہونچکر انھون نے شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ متخلص بہ سلیمان کی ملازمت اختیار کر لی جو خود بھی صاحب دیوان اور شاعرون کے قدر دان تھے انشا نے

اپنی ظرافت اور بذلہ سنجیوں سے اُن کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل کیا اور تھوڑے عرصے بعد اُن کے قدیمی استاد مصحفی کی جگہ لے لی مگر اُن کی منچلی طبیعت جو ایک حال پر قائم رہنے والی نہ تھی ہمیشہ ترقی کے نئے راستے ڈھونڈھتی تھی۔

انشا کی تقریب نواب سعادت علیخان کے دربار میں

تفضل حسین خان علامہ[1] جو اپنی قابلیت اور حسن تدبیر سے سرکار انگریزی کے معتمد اور نواب سعادت علیخان کے مشیر کار تھے سید انشا ان کی صحبت میں آیا جایا کرتے تھے خان علامہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور اس خیال میں تھے کہ کوئی مناسب حال صورت ان کے لئے نکالیں اتفاق سے ایک دن سید انشا جوش تقریر میں ایک ایسا لفظ بول گئے جو دو معنیین تھا۔ اور اردو میں اس کے معنی قابل اظہار نہیں کہنے کو تو کہہ گئے۔ مگر خان علامہ کی نظر تاڑ کر بولے کہ زبان مارواڑی میں "بیوقوف" کو کہتے ہیں۔ انھوں نے کچھ سوچ کر کہا "خیر خاں صاحب انداز معلوم ہو گیا جلد کچھ صورت ہو جائیگی"۔ دوسرے دن نواب سعادت علی سے ان کے خاندان کی بزرگی اور ان کے ذاتی کمالات کا ذکر کر کے کہا کہ آپ کی صحبت میں ان کا ہونا شغل صغریٰ و کبریٰ سے بہتر ہوگا وہ سن کر مشتاق ہوئے۔ دوسرے دن خان صاحب سید انشا کو لے گئے انشا[2] نے اپنے لطیفوں اور چٹکلوں اور مذاق و ظرافت سے نواب کو ایسا پرچایا کہ ان کو ان کی ایک دم کی جدائی بھی ناگوار تھی۔ ان کی حاضر جوابیاں، انکے پر مذاق لطیفے، اُن کی ظرافتیں نواب کو ایسی اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ وہ اُن کو ایک دم بھی اپنے سے جدا رکھنا پسند نہ کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ

---

[1] وزیر علیخاں کی مسند نشینی اور بعد کو ان کے اخراج اور سعادت علی خان کی مسند نشینی انھیں کے حسن تدبیر کا نتیجہ تھی۔ خان علامہ علاوہ ایک مستند عالم فاضل اور باکمال ہونے کے اپنے زمانہ کے مشہور سیاست دان تھے۔ ان کو کئی زبانوں سے واقفیت تھی جن مین انگریزی اور لاطینی بھی شامل ہین سرآئزک نیوٹن کے ڈنشل کلکیولس کا ترجمہ انھوں نے فارسی میں کیا ہے [2] ماخوذ از آب حیات ۱۲

آخر میں رنگ میں بھنگ اور ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہوگئی۔ انشا اپنے مذاق اور دل لگی کی باتوں میں بعض وقت حد سے گذر جاتے تھے اور جو منھ میں آتا تھا کہہ جاتے تھے ایسی باتیں اکثر موقعوں پر تو نواب کو موجب تفریح ہوتی تھیں مگر بعض دفعہ مکدر ہو جاتے تھے اور ناک بھوں چڑھاتے تھے نواب کے مزاج کا پارہ حرارت ناپنے کے واسطے سید انشار بساادقات اچھے بیرامسٹر نہیں ثابت ہوتے تھے۔ مزاج میں بھی اختلاف تھا انشا کی آزاد طبیعت یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ موقع دبے موقع اور جا دبیجا نواب ہی کا کہنا مانا جائے اور ان کی ہاں میں ہاں ملائی جائے۔ چنانچہ ایک روز یہ واقعہ ہوا کہ دربار میں شرفائے خاندانی کی شرافت ونجابت کا ذکر ہو رہا تھا نواب نے کہا "کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں؟" انشا محض مذاق سے اور بغیر سمجھے بوجھے بول اٹھے "بلکہ انجب" (انجب عربی میں لونڈی بچہ کو کہتے ہیں) سعادت علی خان فی الحقیقت حرم سے تھے۔ اس بے ہنگام لفظ پر سارے دربار میں سناٹا چھا گیا مگر کمان سے نکلا ہوا تیر کیونکر واپس کیا جا سکتا ہے۔ نواب کے دل کی کھٹک کبھی نہیں نکلی اور اب اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی موقع پائیں تو انشار کو زک دیں۔ انشا کی بات بات کی گرفت ہونے لگی اور سخت سزائیں اور تکلیفیں اُن کے واسطے تجویز کی جانے لگیں۔ حکم ہو گیا کہ سوائے ہمارے کسی امیر کے یہاں ہرگز نہ جاؤ۔ یہ نظر بندی ان کے واسطے قید بے زنجیر تھی اس پر طرّہ یہ ہوا کہ جوان لڑکا تعالیٰ اللہ خاں مر گیا جس سے انکی کمر ٹوٹ گئی آخر میں ایک جنونی کیفیت بھی پیدا ہو گئی تھی جس کی ایک عبرتناک کیفیت میاں رنگین کی زبانی آب حیات میں بیان کی گئی ہے[1]۔ اسی اثنار میں تنخواہ بھی بند ہو گئی تھی جس سے فاقہ کی نوبت پہونچ گئی تھی۔

[1] آزاد نے انشا کے متعلق خصوصاً ان کے مجنون ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بہت سی روائتیں بیان کی ہیں جو پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچتیں اور بہت سی روائتیں مستند طور پر غلط قرار پائی ہیں حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے، جو میر انشار اللہ خان کے نواسے تھے (بقیہ حاشیہ پشت پر)

وہ شخص جو کبھی چہکتا ہوا بلبل بادشاہ کی ناک کا بال اور اپنے دوستوں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا بالآخر اسی خراب صحت اور فقر و فاقہ کی حالت میں اس دارفانی سے چل بسا۔ یہ واقعہ ۱۲۳۳ھ کا ہے جیسا کہ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے

	دل غمدیدہ تا نشاط شگفت		خبر انتقال میر انشا	
	"عرفی وقت بود انشا" گفت ۱۲۳۳		سال تاریخ او زجان اجل	

ان کے کلام کی خصوصیات | انشا کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے توسیع زبان کا کام جو مرزا رفیع سودا نے شروع کیا تھا جاری رکھا۔ انشا پہلے ہندوستانی شخص ہیں جنھوں نے زبان اردو کی صرف و نحو مدون کی اور جس تحقیق و تلاش اور محنت سے اپنی مشہور کتاب دریائے لطافت مرتب کی اس سے ان کا پایہ استادی بلند ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ ان کے کلام میں ہمواری اور استقامت نہیں ہے مگر ان کا اچھا کلام یقیناً بہت قابل قدر بلکہ قابل استناد ہے ان کے مختلف اصناف سخن سے پایا جاتا ہے کہ وہ زبان کو وسعت دینے کی غرض سے بہت سے تجربے کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ اپنی طبیعت اور زبان پر قابو رکھتے تو یقیناً وہ زبان اردو کے بڑے پایہ کے استاد سمجھے جاتے۔ انشاء کی خاص خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) ظرافت۔ مذاق اور ظرافت میں ان کا ہم پلہ شعرائے اردو میں سوائے سودا کے اور کوئی نہیں ہوا۔ ان کی روزمرہ کی گفتگو اور کلام نظم و نثر دونوں مذاق اور ظرافت سے بھرے ہوئے ہیں (۲) جامعیت۔ ان کی طبیعت ایسی تھی جیسے ایک ترشا ہوا نگینہ

کہ سید انشا نہ مجنون ہوئے اور نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی۔ صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علیخان نے حکم دیدیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی بغیر بلائے حاضر نہ ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں انشا و مصحفی میں جھگڑا ہوا اور ہجو تک نوبت پہونچی تو نواب وزیر نے انشا کو لکھنؤ سے چلے جانے کا حکم دیدیا تھا۔ وہ حیدرآباد گئے چند دنوں کے بعد نواب وزیر نے پھر بلالیا (تذکرہ خلاف شعرا)

جس کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ ان میں خاص صفت یہ تھی کہ ہر قسم کے مضامین کو اپنے
رنگ میں ڈھال لیتے تھے (۳) علم وفضل معلوم ہوتا ہے کہ مشکل مشکل مضامین علمیہ اپنے
دماغ کے چھپے ہوئے گوشوں سے ایک لمحہ میں حاضر کر سکتے تھے اور اپنے دعوے کے
ثبوت میں کوئی ایسا پر لطف قصہ یا دلیل یا شعر یا کوئی دوسری سند اس خوبی سے
پیش کرتے کہ حریف اس کو فوراً تسلیم کر لیتا (۴) نہایت ذہین اور طباع تھے اور انکی
قوت تخیل بجلی سے تیز تھی (۵) فارسی اور عربی کے فاضل زبردست تھے اور ان
دونوں زبانوں میں ان کے اشعار کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ ان کے علاوہ ترکی
پشتو۔ پوربی۔ پنجابی۔ مارواڑی۔ مرہٹی۔ کشمیری اور ہندی بھی خوب جانتے تھے۔
اور ان سب میں شعر کہہ سکتے تھے۔ غرضکہ ایک بہت زبردست اور قابل زباندان
تھے۔ تضمین بھی خوب کرتے تھے۔ نہایت تیز وطرار طبیعت پائی تھی۔ اور مشکل اور نئی نئی چیزوں
مین ان کو بڑا لطف آتا تھا۔ ایک مختصر دیوان صنعت غیر منقوطہ میں لکھا ہے بعض نظموں
میں دوسری صنعتیں بھی دکھائی ہین مثلاً واسع الشفتین یا ذولسانین وغیرہ ان کو اردو
کا امیر خسرو کہنا بجا ہے ان کو مشکل بحریں اور مشکل زمینیں بہت پسند تھیں اور اس میں اپنی
زبان دانی کی قوت دکھائی ہے۔ ان کے بعض قوافی بھی بہت غیر معمولی اور دشوار ہوتے
ہین اور گو کہ بہت ہوشیاری سے نظم کئے ہیں مگر پھر بھی کانوں کو برے معلوم ہوتے
ہیں کیونکہ غزل کے واسطے وہ موزوں نہیں ہین۔ ظرافت اور مذاق جو انکا خاصہ ہے
بعض اوقات اسکی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ مہذب طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے اور
شعر میں ندرت اور خوبصورتی پیدا کرنے کے بجائے اس کو ہلکا اور بھونڈا کر دیتا ہے
ظرافت کی کثرت شاید اس وجہ سے کی گئی ہو کہ اس زمانہ کے لوگوں کو جن کا مذاق بہت
گر گیا تھا یہ رنگ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا اسی وجہ سے انکا مذاق لطافت اور تہذیب
سے خالی ہے اور اسی تعلق سے اس عہد میں سختی کی بنا پڑی جس کا موجد اور مخترع انشار

اور رنگین کو سمجھنا چاہیئے۔ انشا کی بے ہنگام ظرافت نے تصوف ایسی مقدس اور پاک چیز کو نہ چھوڑا۔ چنانچہ اگر کسی کو تصوف اور مذاق کا بے جوڑ میل دیکھنا منظور ہو تو وہ ان کی مثنوی شیر برنج دیکھ لے۔

انشا کی خاص صفتیں یہ ہیں۔ زبان پر قدرت۔ ہمہ گیر طبیعت۔ ہر صنف شاعری میں مہارت۔ اعلیٰ قابلیت۔ قوت ایجاد و اختراع۔ وطن کی روایات قدیمہ سے محبت اور مذاق و ظرافت۔ انشا نے سودا کی طرح مگر اُن سے کسی قدر محدود درجہ پر ہندوستان کی تخئیل اور تلمیح سے اپنی غزلوں میں بہت کام لیا ہے ان کا بڑا عیب یہ ہے کہ انھیں تناسب کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے وہ صائب رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہمواری نہیں ہے غزلوں میں خیالات کی قلت اور الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے جس کی وجہ شاید ان کی مشکل زمینیں اور قوافی ہوں۔ قصیدہ اور غزل گوئی میں وہ معمولی قواعد شعر سے بے پروائی برتتے ہیں۔ اظہار ظرافت پر بھی قابو نہیں رکھتے نواب اور ان کے عیش پرست درباریوں کے خوش کرنے کے لئے کبھی کبھی فحش سے بھی اپنی زبان خراب کرتے ہیں یہ عیب ان کا خاص نہیں بلکہ اس زمانہ کا عیب ہے یہی حال عہد ریسٹوریشن کے انگریزی شعرا کا تھا جن کا کلام اس زمانہ کی خراب سوسائٹی کا آئینہ ہے انشا نے شعر کو اپنے نواب کے خوشی کے ماتحت کر دیا تھا وہ شعر کے بلند درجہ پر کبھی فائز نہیں ہوئے۔ شاعری ان کے واسطے حصول غرض کا ایک ذریعہ تھی ان کا کوئی اعلیٰ سطح نظر نہ تھا اور نہ کوئی پیغام ان کو پہونچانا تھا۔ درباری شاعر بن کر ان کو معقول سزا ملی جب کہ ان کے مسخرے پن کی باتوں اور ہزل و ہجو پر انعام و اکرام ملتے تھے اور ان کی قدر ہوتی تھی تو پھر اعلیٰ شاعری کی کوئی وجہ بھی نہ تھی وہ ایسے زبردست طبیعت کے پاک باطن بھی نہ تھے کہ اپنے زمانہ کے رنگ اور گرد و پیش کے حالات سے متاثر نہ ہوتے۔ بہر طور جو کچھ لکھا ہے وہ سب بیکار اور خراب بھی نہیں ہے

اُن کے کلام میں جا بجا نہایت بیش بہا جواہر بھی ملیں گے جو مرتبہ میں کسی سے کم نہیں ان کا قصیدہ جو جارج سوم کی تعریف میں ہے وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے سید انشا اور ان کی شاعری کے متعلق میاں بتیاب کا چبھتا ہوا جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ انشا کے علم وفضل کو ان کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو نواب سعادت علیخاں کی درباری نے ڈبویا۔ اگر کسی کو انشا کے مفصل حالات دلچسپ لطیفوں اور چٹکلوں کے ساتھ دیکھنا منظور ہوں تو وہ آبحیات میں ان کا حال پڑھے۔

تصانیف | ان کی تصانیف حسب ذیل ہین :۔

کلیات جس میں مندرجۂ ذیل چیزیں شامل ہیں،۔

(۱) ایک دیوان اردو غزلوں کا جس سے زبان پر ان کی پوری قدرت معلوم ہوتی ہے مگر ہمواری نہیں ہے فصیح الفاظ، عمدہ محاوروں چُست ترکیبوں کے ساتھ یہ عیب بھی ہے کہ کہیں کہیں قواعد شعر کی خلاف ورزی ہوگئی ہے بعض اشعار فی الواقع بہت اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ اور نظم اردو کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں

(۲) دیوان ریختی جس کے آخر میں کچھ مستزاد اور پہیلیاں اور طلسمات بھی ہین۔

(۳) قصائد اُردو و فارسی۔ جو حمد و نعت اور منقبت ائمۂ معصومین اور مختلف اشخاص کی تعریفوں میں ہیں۔ ان میں زبان پر قدرت اور الفاظ کی شان و شکوہ بہت پائی جاتی ہے مگر قواعد کا خیال کم کیا گیا ہے بعض جگہ مذاق اور ظرافت کے ساتھ نازک خیالی بھی خوب ہے اور عربی فارسی ترکی اور دیگر زبانوں کے شعر بھی شامل کئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں ان کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے جو قصیدہ کی شان کے خلاف ہے۔

(۴) دیوان فارسی کا بھی یہی حال ہے گو زبان کا زور اور لطف بہت کچھ ہے مگر اکثر جگہ صرف مسخراپن ہے اور کچھ نہیں۔ اگر اپنے رفیق طبعی یعنی تمسخر کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے ضبط سے کام لیتے تو ان کا پایۂ شاعری بہت بلند ہوتا۔

(۵) ایک فارسی مثنوی موسوم بہ شیر و برنج جو مولانا روم کی مشہور مثنوی کی بحر میں اور اسی طرز پر لکھی گئی ہے اور جس میں مسائل روحانیت و تصوف کو مذاق کے پیرایہ میں بیان کیا ہے مولانا آزاد نے خوب لکھا ہے کہ کھیر (شیر برنج) میں نمک ڈال کر تصوف کو تمسخر کر دیا ہے۔

(۶) ایک مثنوی بے نقط جس کی سرخیاں بھی بے نقط ہیں مثلاً "حمد" کے موقع پر لکھتے ہیں کہ لوحہ در حمد مالک الملک" "نعت کے واسطے "لوحہ در مدح سرور کل"۔ منقبت" کے واسطے "لوحہ مدح سوار دلدل، بادشاہ کی تعریف کے لئے "لوحہ در مدح حاکم عصر" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب سرخیاں بھی موزوں ہیں۔ اس سے ہم دو بے نقط شعر نقل کرتے ہیں جس سے نمونۂ کلام کے علاوہ تاریخ تصنیف بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

لوح سالِ کلام مسطور

دُر دَر سلکِ کلام کردم	گردِ کرمِ اله کردم
کردم سالِ ورا محرّر	طورِ الٰہ اسرارِ سطر گوہر

(۷) مثنوی شکار نامہ جو نواب سعادت علی خان کے حکم سے ان کے شکار دھرہرہ کے بیان میں بقید تاریخ بطور روز نامچہ کے لکھی گئی تھی اسکی نظم بہت دلچسپ اور ترکیبیں بہت چست ہیں تاریخ کے یہ دو اشعار بطور نمونہ دیئے جاتے ہیں

قطعہ در تاریخ

فوج ظفر موج بایں عز و جاہ	گر در سانید چو بر اوج ماہ
شوکتش انشا بخط زر نوشت	فقرۂ تاریخ مظفر نوشت

(۸) ہجویں ۔ گرمی ۔ بھڑوں ۔ کھٹملوں ۔ مکھیوں ۔ مچھروں وغیرہ کی شکایت
ہیں اور متفرق اشخاص کی ہجویں منجملہ جن کے میاں مصحفی کی ہجو جو بحر طویل میں ہے
بہت دلچسپ ہے ۔

(۹) مثنوی موسوم بہ شکایت زمانہ

(۱۰) چند مثنویاں جو عاشقانہ رنگ میں ہیں ۔ اور ایک میں ایک ہاتھی اور
چنچل پیاری ہتھنی کی شادی کا دلچسپ افسانہ ہے ۔

(۱۱) ایک مثنوی بزبان مارواڑی جس میں گیان چند ساہو کار کی ہجو ہے ایک
دوسری مثنوی موسوم بہ مرغ نامہ جس مین مرغبازی کے قواعد مذاق اور تمسخر کے ساتھ
بیان کیے ہین ۔

(۱۲) مائۃ عامل عربی بزبان فارسی

(۱۳) متفرق اشعار ، معمے ، رباعیاں ، قطعے ، تاریخیں ، پہیلیاں ، چیستانیں وغیرہ

(۱۴) دیوان بے نقط[1] ۔

کہانی ٹھیٹ ہندی میں | اس مضمون کے نام سے ایک کتاب نثر اردو میں لکھی ہے جس میں
ایک لفظ بھی عربی و فارسی کا نہیں آنے دیا اور نہ کوئی لفظ سنسکرت یا ٹھیٹھ ہندی
بھاشا کا ہے اور باوجود اس کے زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ اردو ہے مقدار
میں تقریباً ۵۰ صفحے ہوں گے ۔ اس کے اکثر حصے ان کتابوں میں نکل چکے ہیں جو فورٹ
ولیم کالج کلکتہ کی طرف سے شائع ہوئی تھیں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے عرصہ ہوا

[1] ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ دو کتابیں قلمی ابھی دستیاب ہوئی ہیں جن کو سید انشا نے نواب
سعادت علی خان کے حکم سے ان کی دلچسپی کے واسطے لکھا تھا ۔ ایک کا نام لطائف السعادت اور
دوسری کا نام بحر السعادت ہے آخر الذکر کا دریائے لطافت سے بھی کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے ممکن
ہے کہ اس کا نقش اول ہو ۔

اس کو کئی جلدوں میں شائع کیا تھا۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے:۔

ایک راجہ تھا جس کا نام سورج بھان تھا اور اس کی رانی کا نام لچھمی بائی تھا۔ ان کے ایک لڑکا تھا جو اودے بھان کے نام سے مشہور تھا اور وہی اس قصہ کا ہیرو ہے ایک دن وہ بغرض سیر و شکار جنگل کی طرف نکل گیا ایک ہرنی کے پیچھے گھوڑا ڈالا رات ہوگئی اور راستہ بھول گیا ایک باغ میں اس نے چند خوبصورت لڑکیوں کو جھولا جھولتے دیکھا جن مین راجہ جگ پرکاش و رانی کام لتا کی خوبصورت لڑکی رانی کیتکی بھی تھی دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے مدن بان رانی کیتکی کی سہیلی اور ہمراز تھی اسکے کہنے سے ان دونوں نے اپنی اپنی انگوٹھی ایک دوسرے سے بدل لی۔ کنور اودے بھان واپس آیا تو اس کی حالت کیتکی کے عشق میں خراب ہوگئی آخرش یہ راز اودے بھان کے باپ پر ظاہر ہوا تو اس نے شادی کا پیام راجہ جگ پرکاش کو بھیجا جسے اس نے بڑی حقارت سے رد کردیا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں راجاؤں میں جنگ چھڑ گئی۔ لڑائی کے دوران میں کنور اودے بھان نے ایک مالن پھول کلی کے ہاتھ ایک رقعہ رانی کیتکی کے پاس بھیجا اور خفیہ بھاگ چلنے کے لئے اصرار کیا۔ رانی کیتکی کی غیرت نے اس کو قبول نہ کیا جگ پرکاش نے دیکھا کہ فتح نصیب نہیں ہوتی تو اس نے اپنے گرو مہندر گر کو جو کیلاش پربت (کوہ ہمالیہ) پر رہتا تھا اپنی کمک پر بلایا اس نے اپنے علم کے زور سے سورج بھان کو شکست دی اور کنور اودے بھان اور سورج بھان اور مہارانی لچھمی باس ہرن ہرنی بن گئے اور کئی برس تک یوں ہی رہے چلتے وقت گرو نے راجہ جگ پرکاش اور اسکی رانی کو ایک شیر کی کھال اور بھبوت دی اور یہ ہدایت کی کہ اگر میری ضرورت ہو تو کھال میں سے ایک بال نکال کر جلا دینا میں فوراً پہونچ جاؤں گا اور بھبوت اس لیے ہے

کہ جو کوئی چاہے اس کا انجن لگائے وہ سب کو دیکھے اور اسے کوئی نہ دیکھے
رانی کیتکی کو اپنے عاشق کی جُدائی شاق تھی اور وہ نہایت پریشان و مضطرب تھی
ایک روز چالاکی سے آنکھ مچولی کھیلنے کے بہانے اس نے بھبوت مانگا اور اس کو
لگا کر رات کو نکل گئی اس کی سہیلی مدن بان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بھی کیتکی
کی تلاش مین بھبوت لگا کر نکلی ایک عرصہ بعد دونوں کی ملاقات ہوئی مدن بان
واپس آگئی اور رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی محبت کا راز راجہ
جگ پرکاش و رانی کام لتا پر ظاہر ہوگیا جب یہ معلوم ہوا تو اس نے کھال
کے بال سے مہندر گرد کو بلایا اور کل حالات بیان کیے رانی کیتکی اور اس کے
ماں باپ اپنے ملک کو چلے گئے اور مہندر گرد نے تلاش کر کے کنور اودے بھان
اور اس کے ماں اور باپ کو ان کی اصل صورت مین کر دیا راجہ اندر نے بھی
اس کام مین اس کی مدد کی تھی اور آخرش رانی کیتکی کی شادی بڑی شان و
شوکت و تزک و احتشام سے کنور اودے بھان کے ساتھ ہوگئی

نمونہ کلام یہ ہے: اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور
جیسا کچھ اسے لوگ پکارتے ہین کہہ سناتا ہے اپنا ہاتھ منھ پر پھیر کر مونچھوں پر
تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ
راؤ چاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں کہ آپ کے دھیان کا گھوڑا
جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہے دیکھتے ہی ہرن کے روپ اپنی
چوکڑی بھول جائے :: چوبکا

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں		کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی		کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

متعلق لکھی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء ہے۔ اس کی تصنیف میں
مرزا قتیل بھی شریک تھے۔ انشا نے اس کا پہلا حصہ لکھا جس میں زبان اردو کی صرف ونحو کا
حال ہے اس میں اول اُردو بولنے والوں کی مختلف زبانوں کے نمونے دکھائے ہیں
اور پھر قواعد بیان کئے ہیں طرز تحریر میں وہی ظرافت اور تمسخر ہے جو ان کے دم کے
ساتھ ہے دوسرا حصہ مرزا قتیل کی تصنیف ہے اس میں عروض و قافیہ، منطق،
معانی، بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ مرزا قتیل نے بھی اپنے دوست کی پیروی میں
مذاق اور ظرافت کو ہاتھ سے نہیں دیا مگر پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہے لطف
سے خالی نہیں شلاً تقطیع میں بجاے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن
کے پری خانم - پری خانم - پری خانم لکھا ہے اور مفعول مفاعیلن
مفعول مفاعیلن کی جگہ بیجان پری خانم بیجان پری خانم درج ہے مگر حقیقت
یہ ہے کہ دوسرا حصہ اتنا دلچسپ نہیں جتنا پہلا ہے۔ سید انشا پہلے شخص ہیں
جنھوں نے زبان اُردو کی اہمیت اور اس کے قواعد مرتب کرنے کی ضرورت
کو محسوس کیا تھا۔ انھوں نے صحیح محاورات لفظوں کی اصل، اور تلفظ کی تحقیق
و تلاش میں اپنا بہت سا وقت عزیز صرف کیا اور بیگماتی اور محلات کی جو زبان
لکھی ہے وہ بھی ہمارے واسطے دلچسپی سے خالی نہیں۔ انھوں نے بڑی محنت اور قابلیت
سے اس اثر کا بھی ذکر کیا ہے جو مختلف قومیں اور جماعتیں مشترکہ زبان اردو کی
ترقی پر ڈالتی ہیں۔ قواعد کو نہایت صفائی کے ساتھ اور مکمل طریقہ پر بیان کیا ہے
اردو کے حروف تہجی اور انکی آوازوں کو نظر تعمق سے دیکھا ہے ان کی رائے میں مجموعی
آوازوں کی تعداد ۸۵ ہے زبان کے مختلف شعبوں شلاً پوربی، مارواڑی وغیرہ کے
نمونے دیئے ہیں اور دکھایا ہے کہ ان کا اثر اردو پر کس طرح پڑتا ہے۔ یہ کتاب اس وجہ
سے بھی دلچسپ ہے کہ اسمیں بہت سے متروکات دیگران کی جگہ مروجہ الفاظ کو بیان

کیا ہے پوری کتاب کا طرز تحریر مذاق وظرافت سے بھرا ہوا ہے مگر باوصف اسکے وہ قدیم اُردو گرامر کی حیثیت سے نہایت قیمتی چیز ہے۔

غرض کل تصنیفات کی حالت مجموعی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انشاؔ من حیث الادیب اور نیز من حیث الشاعر بہت بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں اتنا تنوع ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں۔ تصرف اور ایجادوں کے حاکم علی الاطلاق اور ظرافت ولطافت میں طاق ومشتاق تھے۔ چنانچہ انکا ایک قطعہ خمخانۂ جاوید جلد اول سے نقل کرکے بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ فائق تخلص ایک شاعر تھا جس نے ان کی ہجو کہی اور خود لاکر سنائی تھی۔ انھوں نے بہت تعریف کی اور پانچ روپیے دیئے اور یہ قطعہ بھی کہہ کر روپیوں کے ساتھ ساتھ اس کے حوالہ کیا۔

فائق بے حیا چو ہجوم گفت	دل من سوخت سوخته به
صلہ اش پنج روپیہ دادم	دہنِ سگ به لقمه دوخته به

اس شاعر نے لفظ ید کو مشدد باندھا تھا انشاؔ نے اس کے جواب میں بطور تعریض کے جو قطعہ لکھا ہے درج ذیل ہے:۔

چه خوش گفت فائق شاعر غرّا	که چوں ذہن او ذہن رسا نباشد
یکے شعر نادر که در چند وزن	شود۔ خوانده و شک بمعنا نباشد
دراں لفظ ید را بدالِ مُشدّد	نوشت ست واین غلط اصلا نباشد
شنید ایں سخن را چو گرد سخن	زانشا که ہمسرش اصلا نباشد
بگفتا که من شاعر خوش فکرم	چو من ہیچ مغلّ گویا نباشد
تو گلستاں را ندانی درست	ترا ہیچ شعور و ذکا نباشد
سند یاد از استاد ست مارا	بکلام ما ہیچ خطا نباشد

چو تشدید در شعر ضرورت افتد		تشدید صحیح چرا نباشد

جرأت (متوفی ۱۲۲۵ھ) جرأت تخلص۔ مشہور نام شیخ قلندر بخش۔ اصلی نام یحییٰ امان تھا۔ ان کے والد کا نام حافظ امان ہے اور سلسلۂ خاندان رائے امان سے ملتا ہے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں دربار شاہی میں خدمت دربانی پر مامور تھے دلی میں کوچۂ رائے امان[1] انھیں کی طرف منسوب ہے اور یہ نادر شاہی حملۂ دہلی ۱۱۵۲ھ میں مارے گئے۔ جرأت کا زمانۂ بچپن فیض آباد میں گذرا جیسا کہ میر حسن کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وطن سے بہت کمسنی میں نکلے تھے۔ شروع میں نواب محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں کی رفاقت کی چنانچہ خود کہتے ہیں :۔

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

اس کے بعد ۱۲۱۵ھ میں صاحب عالم و عالمیان مرزا سلیمان شکوہ کے حاشیہ نشینوں میں داخل ہوئے اور آخر تک لکھنؤ ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی ناسخ کی تاریخ ہے ؎

جب میاں جرأت کا باغ دہر سے		گلشنِ فردوس کو جانا ہوا
مصرع تاریخ ناسخ نے کہا		ہائے ہندستان[2] کا شاعر مُوا

جرأت مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے علاوہ فن شاعری کے نجوم میں ماہر اور فن موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے اور ستار خوب بجاتے تھے[3]۔ افسوس ہے جوانی ہی میں

[1] گلی کے سرے پر جو بورڈ لگا ہے اس پر "کوچۂ رحمٰن" لکھا ہے ۱۲

[2] ہندستان بغیر واو کے پڑھنا چاہیئے ۱۲

[3] مرزا علی لطف اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "علم موسیقی میں مشغلہ بھلا چنگا رکھتا ہے اور ستار کے بجانے میں نہایت دست رسا رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظر احکام ہے" ۱۲

آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ بعض کہتے ہیں یہ حادثہ چیچک سے ہوا بعض کچھ دوسری وجہ بتاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں اس کو بہت طول دے کر لکھا ہے مختصر یہ ہے کہ ہمارا نوجوان عاشق مزاج شاعر جنس نازک کی پُر لطف صحبتوں کا بہت دلدادہ تھا مگر پردے کے سبب سے شرفا اور امرا کے گھروں میں گھسنے نہیں پاتا تھا ایک مرتبہ آشوب چشم کے بعد مشہور کر دیا کہ میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور مجھ کو اب کچھ نہیں سوجھتا اس بہانے سے رئیسوں اور امیروں کے گھروں میں اندھا بن کے جانے لگا اور خوبصورت عورتوں کو چپکے چپکے تاکنے لگا آخر کار اپنی اس بدکاری کی پاداش میں سچ مچ اندھا ہو گیا۔

جرأت زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے زبان عربی اور معمولی علوم و فنون سے ناواقف تھے مگر طبیعت بلا کی پائی تھی۔ شعر کا شوق انکو خلقی تھا۔ کبھی فکر شعر سے غافل نہیں رہتے تھے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں" دیوانۂ فن شعر است گہ گاہے بے فکر نمی ماند۔ بسیار دردمند و گداز است"

تصانیف | ایک دیوان اور دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں، دیوان میں غزلیں، فردیات، رباعیاں، مخمس، مسدس، ہفت بند، ترجیع بند، واسوخت، تاریخیں، ہجو، سلام، مرثیے، سب کچھ ہیں۔ ایک فالنامہ بھی ہے۔ دو مرثیوں کے آخر میں جو تاریخیں دی ہوئی ہیں ان سے ۱۱۹۱ھ اور ۱۱۹۲ھ نکلتے ہیں۔ مثنویوں میں ایک ۶۲ صفحات اور دوسری ۲۳ صفحات کی ہے۔ ایک میں برسات کی ہجو اور سن تصنیف ۱۱۹۵ھ ہے۔ دوسری مثنوی کا سن تالیف ایک تاریخ سے ۱۲۲۵ھ معلوم ہوتا ہے اس کا نام "حسن و عشق" اور اس میں ایک بزرگ خواجہ حسن نام اور لکھنؤ کی ایک حسین رنڈی بخشی کے عشق کا ذکر ہے۔ اس کی زبان نہایت فصیح و پُر لطف اور کلام نہایت نمکین و بامزہ ہے۔

جُرأت کی خصوصیات اور ان کا مقابلہ میر کے ساتھ

جرأت نے قصیدہ یا کسی دوسری مشکل اور متین صنف نظم کو اختیار نہیں کیا فارسی میں بھی کچھ نہیں کہا جیسا کہ اُس زمانہ کے ذی استعداد شعرا کا دستور تھا۔ وہ علی الخصوص ایسی محفل کے شاعر تھے جہاں شراب ناب کے دَور چلتے ہوں اور حسُن وعشق کے چرچے ہوتے ہوں عاشقانہ رنگ بلکہ اس میں بھی معاملہ بندی، ان کا خاص رنگ ہے اور اس میں اِن کو درجہ کمال حاصل ہے۔ یہی معاملہ بندی بعض وقت زیادہ تفصیل کے بعد فحش کی سرحد سے مِل جاتی ہے اوران کے اشعار کو مہذب صحبتوں کے لائق نہیں رکھتی۔ باعتبار رنگ کے ان کا اور میر کا کلام مِلتا جُلتا ہے۔ کیونکہ دونوں غزال تھے ان دونوں کا رنگ عاشقانہ ہے مگر میر کے جذبات اور وردواثر جرأت کے یہاں مفقود ہیں۔ میر عمیق اور جرأت سطحی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں معاشیق علی الخصوص معاشیق بازاری کے ناز وکرشمے، عشاق کی حرماں نصیبی، ہجر کی مصیبتیں، درباریوں کی ایک دوسرے کے ساتھ رقابت اور بے پروائی وغیرہ وغیرہ، غرضکہ جو کچھ ایک عیش پرست دربار اور عشرت طلب سوسائٹی کا تقاضا تھا۔ بہت خوبی اور بڑی کامیابی سے بیان ہوا ہے۔ غزل کے لئے اِن کی طبیعت بہت مناسب واقع ہوئی تھی۔ میر کے رنگ کو انھوں نے اختیار کیا اور اس کی شیرینی اور فصاحت و بلاغت میں ایک ایسی چاشنی اور شوخی اضافہ کی جس سے ان کا طرز علیحدہ ہوکر مقبول عام ہوگیا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ میر میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے میر کا تخیل بلند اور ان کا عاشقانہ رنگ بہت اعلیٰ اور ارفع قسم کا ہے، جرأت کا عشق مادی اور ادنیٰ درجہ کا ہے۔ میر کے قدردان اہل دل سخن شناس اور جرأت کے دلدادہ عوام الناس ہیں۔ سچ پوچھیے تو اصلی فرق دونوں کی طبیعتوں کا ہے۔ میر میں متانت، خودداری، استغراق اور گوشہ نشینی تھی اور وہ شاعری کو ایک نہایت معزز اور مقدس کام خیال کرتے تھے۔ برخلاف

اس کے جرأت ایک حریف ظریف، ہشاش بشاش خوش طبع آدمی تھے، ہمیشہ صحبت کے متلاشی اور شاعری کو ذریعۂ معاش اور جلب زر کا ایک زبردست آلہ سمجھتے تھے اور شعر کے ذریعے سے اپنے تئیں اپنے مربیوں اور سرپرستوں کا ایک دلچسپ کھلونا بنائے ہوئے تھے اور ان کے دل کو خوش کر کے ان سے کچھ اینٹھنا جانتے تھے۔ ان میں میر اور انشا کا سا علم و فضل اور قواعد شعر سے ویسی واقفیت نہ تھی لگر پھر بھی ان کا ایک طرز خاص ہے اور ان کے کلام میں ایسی سادگی اور مزہ ہے جو عام دلوں کو بہت مرغوب ہے۔ میر نے جو رائے اُن کی غزلوں کی نسبت ظاہر کی تھی وہ سننے کے قابل ہے اور بہت صحیح ہے۔ مرزا محمد تقی خان ترقی کے مکان پر ایک مشاعرہ تھا جس میں شہر کے سب نامی رئیس اور شاعر جمع تھے میر اور جرأت بھی تھے۔ جرأت نے جو غزل پڑھی اس پر بہت واہ واہ ہوئی اور بہت تعریفیں ہوئیں۔ وہ ازراہ تبختر یا شوخی سے، جو کچھ سمجھے، میر صاحب کے پاس آ بیٹھے اور اپنے کلام کی داد چاہی، میر صاحب نے دو ایک مرتبہ تو ٹالا مگر جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو تیوری چڑھا کر فرمایا: "تم شعر کہنا کیا جانو اپنے چوما چاٹی کر لیا کرو"۔ مختصر یہ کہ جرأت کا پایۂ شاعری بہت بلند نہیں، دربار کے توسّل نے اُن کو بھی مٹایا جیسا کہ انشا کو مٹایا تھا پھر بھی انشا کو اُن کے علم و فضل نے بچا لیا۔ ان کا تو یہ بھی سہارا نہ تھا۔ جرأت نے زبان یا نظم اردو کی ترقی میں بھی کوئی حصّہ نہیں لیا۔ جو شاہراہ متقدمین قائم کر گئے تھے اسی پر آنکھیں بند کیے چلے گئے۔ کہا جاتا ہے وہ عاشقانہ رنگ کے موجد ہیں ہمارے نزدیک یہ دعوے صرف اس حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے عام مذاق کی پیروی کی اور ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس کی تکمیل متاخرین میں

جرأت اور داغ	نواب مرزا خاں داغ کے ہاتھوں ہوئی ۔ ان دونوں شعلہ دل

میں باعتبار لفظ اور معنی دونوں کے فی الواقع بہت مماثلت اور مشابہت ہی

مصحفی (سنہ ۱۱۶۲ھ تا سنہ ۱۲۴۰ھ)	شیخ غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے

امروہہ کے رہنے والے تھے۔ آغاز جوانی میں وطن چھوڑ کر سنہ ۱۱۹۰ھ میں دلی آئے جہاں تکمیل علوم کی اور شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ ان کو پڑھنے کا اسقدر شوق اور کتب بینی سے اس قدر ذوق تھا کہ کتابیں عاریت لے لے کر پڑھتے تھے اور بطور خلاصہ اپنی یادداشت کے طریقہ پر لکھتے جاتے تھے۔ انھوں نے سنہ ۱۱۹۵ھ ہی میں شعر گوئی میں شہرت حاصل کر لی تھی کیونکہ تذکرۂ میر حسن میں ان کا ذکر عزت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خود مشاعرہ بھی کرتے تھے جن میں معزز شعرا مثل انشا اور میر حسن اور جرأت وغیرہ کے جمع ہوتے تھے۔ بارہ برس دلی میں رہ کر مثل اور شعرا کے لکھنؤ آئے جب کہ نواب آصف الدولہ سریر آرائے حکومت تھے۔ لکھنؤ میں انھوں نے مستقل قیام کیا اور شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہو گئے۔ لکھنؤ آنے سے پہلے کچھ دنوں ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں کے پاس رہے تھے۔ لکھنؤ تھوڑے دنوں رہ کر پھر دلی چلے گئے مگر کچھ دنوں کے بعد آب و دانہ کی کشش انکو پھر لکھنؤ کھینچ لائی آزاد کی تحقیق کے موافق سنہ ۱۲۴۰ھ میں تقریباً اسی برس کی عمر میں انتقال کیا جب کہ آٹھواں دیوان ترتیب دے رہے تھے شیفتہ بھی اپنے گلشن بیخار میں، جو سنہ ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ ان کو مرے دس برس ہوئے۔ حسرت موہانی اپنے تذکرہ میں ان کا سن ولادت سنہ ۱۱۶۴ھ لکھتے ہیں لہذا مرنے کے وقت ان کی عمر ۷۶ برس کی ہوگی

تصانیف	مصحفی اُردو اور فارسی دونوں کے پُرگو شاعر تھے سنہ ۱۷۹۴ء کے پہلے انھوں

نے دو دیوان فارسی مرتب کیے تھے ایک نظیری نیشاپوری کے جواب میں اور دوسرا اپنی طبعزاد غزلوں کا مجموعہ۔ ان کے علاوہ دو اور فارسی دیوان بھی لکھے ایک ناصر علی کے رنگ میں اور دوسرا جلال اسیر کے انداز میں یہ دونوں دیوان

چوری ہوگئے۔ اب ان کا صرف ایک دیوان فارسی مروّج ہے جس کا ذکر سب تذکرہ نویسوں نے کیا ہے ایک تذکرہ فارسی شعرا کا اور ایک اردو شعرا کا فارسی زبان میں لکھا۔ شاہنامہ کا ایک حصہ بھی لکھا ہے جس میں شاہ عالم کے خاندان تک حالات درج ہیں۔

تذکرہ شعرائے اردو مصنفہ ۱۷۹۴ء

مصحفی کی شہرت زیادہ تر ان کے ضخیم اردو دیوانوں اور تذکرہ پر مبنی ہے۔ آٹھ اردو دیوان ان کی یادگار ہیں جن میں ہزارہا غزلیں، قطعے، قصائد وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ تذکرہ شعرائے اُردو جو زبان فارسی میں ہے ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں ترتیب پایا۔ اور اب ملتا ہے۔ یہ نہایت مفید کتاب ہے اور اس میں تقریباً ساڑھے تین سو شعراء کا ذکر ہے محمد شاہ کے زمانہ سے لے کر مصنف کے زمانہ تک تھے انھوں نے اپنے معاصرین کا خصوصیت کے ساتھ مفصل ذکر کیا ہے اور کلام کے نمونے بھی دیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ ان کے شاگرد میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کی خاص فرمائش سے لکھا گیا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مصحفی کے آٹھوں دیوان اور دونوں تذکرے بھوپال میں کسی صاحب کے پاس موجود ہیں۔

خصوصیات کلام

سب سے بڑی صفت مصحفی میں یہ تھی کہ وہ نہایت زود گو تھے جب وہ شعر کہتے تھے اور قلمبند کرتے جاتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کتاب سے نقل کر رہے ہیں۔ مشاعروں کے لئے بکثرت غزلیں کہہ رکھتے تھے۔ معمولی غزلیں خریداروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے اور منتخب اشعار اپنے لیے رکھ لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زود گوئی یا پُر گوئی سے ان کے کلام میں ناہمواری پیدا ہوگئی کیونکہ پُر گوئی نے زیادہ جانکاہی اور غور و فکر کا موقع نہیں دیا۔ دوسری خصوصیت انکی یہ ہے کہ وہ مسلم الثبوت جگت استاد تھے اور بڑے بڑے استاد انکے دامن

تلمذ سے وابستہ تھے۔ مثلاً میر مستحسن خلیق۔ ضمیر۔ آتش۔ شہیدی۔ عیشی وغیرہ۔ بلکہ اگر سچ پوچھیے تو ان کے زمانہ کے بعد کے اکثر شعراء بالواسطہ یا بلا واسطہ انھیں کے شاگرد تھے، ناسخ کی نسبت مشہور ہے کہ انکو کسی سے فخر تلمذ حاصل نہ تھا مگر وہ بھی محمد عیسی تنہا کے ذریعہ سے جو مصحفی کے شاگرد رشید تھے، اسی مائدۂ سخن کے زیرہ چین ثابت ہوتے ہیں، جیسا کہ خود مصحفی نے اپنے چھٹے دیوان کے دیباچہ میں ان کی نسبت لکھا ہے اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہو سکتا ہے کہ جتنے استادان کے شاگردوں میں نکلے اتنے اور کسی کو نصیب نہیں ہوئے تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قواعد نظم کے یہ نہایت سخت پابند رہے اور شتر گربہ کے عیب سے جو میر و سودا ایسے استادوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے، ان کا کلام پاک ہے ناسخ نے اور بھی اس اصلاح کے آئین کو درجۂ تکمیل پر پہونچایا۔ مگر ان کے کلام میں رطب و یابس شامل ہونے کی وجہ سے ہمواری نہیں ہے کہیں میر تقی میر کا درد و گداز ہے۔ کہیں سودا کی بلند پروازی، کہیں فغان کی رنگینی۔ کہیں میر سوز کی سادگی۔ کسی مین جرأت کی شوخی اور کہیں کہیں انشا کا بھی رنگ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ انکا کلام اعلی درجہ کا قدما کے رنگ کا بھی بہت ہے مگر زیادہ تر غزلیں معمولی ہین اور کسی خاص رنگ کی نہیں ہین بعض غزلوں کی زمینیں سودا کے تتبع میں نہایت سخت اور ردیف و قافیہ مشکل رکھے گئے ہین اور گو کہ ان مین شاعری کا کمال دکھایا ہے مگر پھر بھی سودا کا سا زور اور استادی نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ میر تقی اور میر سوز کے تتبع میں بہت سے اشعار سادہ اور فصیح اور دردناک لہجہ مین کہے ہین مگر پھر بھی مذکورۂ بالا اشادوں کی وہ بات کہاں مختصر یہ کہ غزل میں ان کا کوئی خاص رنگ نہیں اور بعض اشعار کی عمدگی کو من اولہ الی آخرہ نباہ نہیں سکتا یہی حال ان کے قصیدہ کا بھی ہے۔ جن میں قواعد کی پابندی اور الفاظ و معانی کی بلندی تو ضرور ہے مگر متقدمین کا زور اور شان و شکوہ پیدا نہیں ہو سکا۔ چند

تنویاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک "بحرالمحبت" میر کی مثنوی "دریائے عشق" کے رنگ میں بلکہ اسی کی نقل ہے قصہ کا مضمون اور طرز عبارت وغیرہ سب اسی سے ملتے جلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں، وہ متقدمین کے پیرو تھے اور نہایت زود گو اور پُر گو تھے۔ مختلف اصناف سخن پر انھیں کمال حاصل تھا۔ ملکی خصوصیات ان کے یہاں جرأت سے زیادہ اور انشا سے کم ہیں۔ نہ تخیل میں بلندی ہے نہ جذبات میں دلکشی ہے الفاظ بھی بعض جگہ ایسے لکھ گئے ہیں جو اب متروک ہو گئے زبان میں اکثر جگہ میر و سودا کی پیروی ہے گو کہ زمانہ انشا اور جرأت کا پایا تھا۔

مصحفی اور سید انشا کے معرکے مصحفی اور سید انشا کے معرکے نہایت مشہور ہیں جن میں مختلف ہجوؤں اور مذاق و تمسخر سے، جو بسا اوقات فحش کی حد تک پہونچ جاتا تھا۔ بہت کام لیا گیا ہے۔ یہ واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ آبحیات میں درج ہیں اگر کسی کو دیکھنا ہوں تو اس کتاب میں دیکھنا چاہیئے یہاں بھی مختصراً بمصداق مشتے نمونہ از خروارے لکھے جاتے ہیں۔ ابتدا اس واقعہ کی یوں ہوئی کہ میاں مصحفی پہلے شہزادہ سلیمان شکوہ کے کلام پر اصلاح دیتے تھے جب سید انشا پہونچے تو ان کے سامنے ان کا رنگ کب جم سکتا تھا۔ چنانچہ اب غزلیں ان کے پاس آنے لگیں جس سے مصحفی کو بڑا قلق ہوا اسی اثنا میں ان کی تنخواہ بھی کم کر دی گئی جس کے متعلق انھوں نے ایک قطعہ لکھ کر شہزادہ موصوف کو گزرانا جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

چالیس برس کا ہی ہو چالیس کے لائق	تھا مرد معمر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے	ہم بھی تھے کسی روز دں میں پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر	ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

مشاعروں میں بھی ہم طرح غزلوں میں نوک جھونک ہوتی اور ایک دوسرے

کا مذاق اڑایا جاتا مثلاً ایک جلسہ میں میاں مصحفی نے غزل پڑھی جس کا مقطع تھا:

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ	تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

اس شعر کو انشا نے یا ان کے یار دوستوں نے الٹ دیا اور کہا

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ	رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

اسی زمانہ مین مصحفی نے ایک غزل کہی تھی جس کا یہ مطلع ہے:۔

سر مشک کا ہی تیرا تو کافور کی گردن	نے موے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اس غزل پر سید انشا نے بہت سے اعتراض وارد کیے اور ایک قطعہ بھی نظم کیا۔ غزل کا مطلع ہے

توڑوں گا خمِ بادۂ انگور کی گردن	رکھ دونگا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

ور قطعہ اس طرح شروع کیا۔

سن لیجئے گوش دل سے مری مشفقانہ عرض	مانند بید غصہ سے مت تھرتھرائیے
بلور گو درست ہو لیکن ضرر کیا	خواہی نخواہی اس کو غزل مین کھپائیے
دستور وطور و نور یہ ہین قافیے بہت	اس میں جو چاہیئے تو قصیدہ سنائیے
کیا لطف ہی کہ گردن کافور باندھ کر	مُردے کی باس زندوں کو لا کر سنگھائیے

اسی قسم کے اور بہت سے اشعار ہیں جن میں مصحفی کے زباندان ہونے پر اعتراض کیا ہی مصحفی نے جواب الجواب اپنی غزل کی طرح میں دیا اور انشا کی غزل میں جو ان کے نزدیک قابل اعتراض باتیں تھیں ان پر اعتراض جمائے مثلاً

اے آنکھ معارض ہو مری تیغ زباں سے	تو نے سر عذر میں مستور کی گردن
ہے آدم خاکی کا بنا خاک کا پتلا	گر نور کا سر ہوے تو ہو نور کی گردن
لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں	کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن تو صراحی کے لئے وضع ہے ناداں	بیجا ہے خُمِ بادۂ انگور کی گردن

اس مباحثہ اور مناظرہ کے بعد پھر تو وہ پھکڑ شروع ہوا جو دونوں آدمیوں کی تہذیب و متانت سے بہت دور تھا۔ فریقین کے شاگردوں نے اپنے اپنے استادوں کی بیچ میں وہ طوفان اٹھائے کہ خدا کی پناہ۔ ایک دن میاں مصحفی کے سب شاگرد اکٹھا ہوئے شہدوں کا سوانگ بھرا اور ہجو کہکر اس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کے مکان کی طرف روانہ ہوئے اور آمادہ تھے کہ مارپیٹ بلکہ کشت و خون سے بھی دریغ نہ کریں۔ سید انشا کو اس کی پہلے سے خبر ہو گئی تھی وہ نہایت متحمل اور سمجھدار آدمی تھے بجائے ان لوگوں پر غصہ کرنے یا انکا مقابلہ کرنے کے انھوں نے ان کی بہت خاطر و مدارات کی ان کو مٹھائیاں کھلائیں۔ گلوریاں اور ہار پھول ان کے سامنے پیش کئے اور اپنی ہجویں اپنے سامنے پڑھوا کر خود بھی بہت خوش ہوئے اور انکو نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا مگر دوسرے دن جو جواب سید انشا نے تیار کیا وہ غضب کا تھا ایک پُرتکلف بارات کی نقل بنائی جس میں ایک مجمع کثیر شامل تھا اور لوگ ڈنڈوں پر کچھ اشعار پڑھتے ہوئے اور ایک گڑا اور ایک گڑیا ہاتھ میں ہلاتے ہوئے جاتے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن	لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

ان معرکوں میں نہ صرف معمولی لوگ بلکہ اُس زمانہ کے معزز شعرائے لکھنؤ سب شامل تھے اور اس پرفتنہ مذاق سے لطف اٹھاتے تھے۔ اکثر امرائے اور خاصکر مرزا سلیمان شکوہ نے سید انشا کا ساتھ دیا تھا جس سے مصحفی کو بہت رنج ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اسی افسردہ دلی میں ایک غزل کہی جس کا مطلع و مقطع یہ ہے۔

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں	کچھ اسکے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں
اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا	سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

ادھر مرزا سلیمان شکوہ کو یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ اس شکوہ و شکایت میں ہم پر بھی چوٹیں

کی ہیں اور وہ ناراض ہو گئے تھے۔ مصحفی نے اس کی معذرت میں ان کے حضور میں ایک قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع ہے۔

قسم بذات خدائیکہ ہے سمیع و بصیر		کہ مجھ سے حضرت شہ میں نہیں ہوئی تقصیر

اس میں ممدوح کی عزت و شان اور اپنی بے حقیقتی کا مقابلہ کرکے کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ یہ نمکخوار قدیم حضور کی نسبت کوئی بُرا لفظ کہے۔ یہ افتراسب انشاء کا بنایا ہوا ہے جس نے حضور کے مزاج کو مجھ سے منحرف کر دیا ہے۔ اس قصیدہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بریت اور سید انشا کی خطا ثابت کی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ معرکہ بھی بحیثیت شعر و شاعری ایک یادگار معرکہ ہے ہر چند اس میں خلاف تہذیب نظمیں کہی گئیں مگر پھر بھی یہ بہت دلچسپ اور اس زمانہ کی ایک خاص یادگار ہے۔

رنگین ۱۱۶۹ھ تا ۱۲۵۱ھ	سعادت یار خان رنگین طہماسپ بیگ خان تورانی کے

فرزند ارجمند تھے۔ سرہند میں پیدا ہوئے ان کے والد توران سے آکر چند دنوں لاہور میں حصین الملک میر منور خان کی سرکار میں ملازم رہے۔ اس کے بعد دلی آئے جہاں پیشگاہ سلطانی سے منصب ہفت ہزاری اور خطاب محکم الدولہ اعتضاد جنگ بہادر عنایت ہوا رنگین نے شاہزادہ مرزا سلیماں شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی وہ بہت اچھے شہسوار اور فنون سپہگری سے خوب واقف تھے۔ دکن میں نظام حیدرآباد کی فوج میں افسر توپخانہ رہے لیکن بعد کو نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ انشاء کے وہ بڑے دوست تھے اور اکثر ان سے لکھنؤ میں ملا کرتے تھے اوائل عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور سب سے پہلے شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ مشہور ہے کہ میر صاحب سے اصلاح لینا چاہتے تھے مگر انھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا امیر آدمی کے لڑکے ہو تم کو شاعری نہیں آسکتی تمھارے لئے شہسواری ورزش وغیرہ مناسب ہے تم کو اس سے کیا واسطہ حاتم کے بعد وہ محمد امان نثار کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور جرمن مستشرق بلوم ہارٹ

کی تحقیق ہے کہ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ رنگین کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا اور نہایت عاشق مزاج واقع ہوئے تھے چونکہ امیر آدمی تھے حسین بھی تھے لہذا زندگی نہایت عیش وعشرت سے پریوشوں کے جمگھٹے میں گزارتے تھے۔ بے انتہا خلیق۔ متواضع اور مہذب آدمی تھے ڈاکٹر اسپرنگر اور کریم الدین کی تحقیقات کے بموجب یہ اسّی برس کی عمر میں ۱۲۵۱ھ میں فوت ہوئے مگر شیفتہ اور گارسن ڈیٹاسی ان کی عمر اکاسی اور سن وفات بارہ سو پچاس بتاتے ہیں

تصانیف (۱) "مثنوی دلپذیر" جس میں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے اس میں شاہزادے ماہ جبین اور رانی سری نگر کا قصہ ہے اسکا سنہ تصنیف ۱۲۱۳ھ ہے جیسا کہ جرات اور انشا وغیرہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے

(۲) "ایجاد رنگین" یہ بھی ایک مثنوی ہے اس میں فحش قصے اور دلچسپ حکایات ہیں

(۳) چار دیوان جن کے علیحدہ علیحدہ نام "دیوان ریختہ۔ دیوان بیختہ۔ دیوان آمیختہ دیوان انگیختہ" ہیں اور مجموعاً ان چار دیوانوں کا نام "چار عنصر رنگین" ہے۔

(۴) مثنوی "مظہر العجائب یا غرائب المشہور" اس میں بھی حکایتیں ہیں۔

(۵) "مجالس رنگین" یہ انکی بہت اچھی تصنیف ہے اور اسمیں اپنے زمانے کے شعراء کا حال لکھا ہے اور ان کے کلام کی تنقید بھی کی ہے۔

(۶) فرسنامہ مصنفہ ۱۲۱۰ھ اسمیں گھوڑوں کی شناخت نیک و بد اور ان کے علاج وغیرہ کا ذکر ہے۔ پہلا دیوان ۱۲۲۹ھ میں تیار ہوا تھا جیسا کہ ایک تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ۲۰۷ صفحہ غزلیات ۲۲ صفحہ رباعیات اور دو منظوم خط اور ایک قصیدہ ۶۰۰ شعروں کا ہے دوسرا دیوان ۹۴ صفحہ کا غزلیات اور رباعیات

پر مشتمل ہے۔ تیسرے دیوان میں ان کے ہزلیات شامل ہیں۔ اور اسی میں ایک قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے چوتھا دیوان ریختی کا ہے۔ اسکے دیباچہ میں مصنف نے مستورات کے خاص خاص محاورات اور عورتوں کی اصطلاحیں بیان کی ہیں اور نیز بدچلن عورتوں کی جنکو وہ عروس شیطان لکھتا ہے، بول چال درج ہے

ریختی سے کیا مطلب ہے اور اسکی ایجاد کے اسباب

ریختی کے طرز میں ایک قسم کی دلچسپی ضرور ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ اس میں اکثر غیر مہذب اور فحش آمیز اشارے ہوتے ہیں ناسخ کی رائے ہے کہ اس طرز خاص کے موجد میاں رنگین تھے اور رنگین نے خود بھی یہ دعویٰ اپنی نسبت اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طرز قدیم شعرا رعلی الخصوص شعرائے دکن میں بھی موجود تھا مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری جو دکن کے ایک مشہور شاعر تھے اور مولانا قادری جو ولی کے ہم عصر تھے اور جن کا تخلص خاکی تھا اور جن کا دیوان ۱۱۰۸ھ میں مرتب ہوا ہے ان لوگوں کے یہاں بھی ریختی کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ ان قدیم شاعروں کی ریختی ایک خاص قسم کی تھی جس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ان کے کلام میں بھاشا کا زیادہ اثر ہے لہذا اسی کے تتبع میں اظہار عشق عورت کی جانب سے اور اسی کے الفاظ میں کرتے ہیں بخلاف معمولی اُردو کے جس میں اظہار عشق عموماً مرد کی جانب سے ہوتا ہے اسی وجہ سے اس قسم کی ریختی میں فحش اور ابتذال مطلق نہیں ہوتا۔ برخلاف انشا اور رنگین کے طرز کے جن کا دارو مدار عیاشی اور شہوت پرستی پر ہے ان کی غرض عموماً یہ ہوتی ہے کہ ایسا کلام پڑھکر لوگوں کو ہنسی آئے یا ان کے نفسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو اسی وجہ سے اس قسم کی نظموں میں خلوص اور بلند خیالی یہانتک کہ بے ضرر سادہ مذاق بھی نہیں ہوتا۔

یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ ہمارے ملک میں عورتوں اور مردوں کی علیحدہ علیحدہ

زبان ہونے کے اسباب کیا ہیں ان دونوں کی زبانوں میں صرف الفاظ و محاورات کا فرق ہوتا ہے۔ بعض الفاظ و محاورے مستورات کے لئے مخصوص ہیں جنکو عام طور پر مرد نہیں استعمال کرتے۔ ہمارے نزدیک اس خصوصیت اور فرق کی بڑی وجہ پردہ ہے جس سے اس ملک کی شریف گھرانے کی عورتیں غیر مردوں کے سامنے نہیں آسکتیں اور ان کے ساتھ بے تکلفی سے نہیں مل سکتیں اکثر پرانے خیال کے لوگوں میں تو پردہ کے بارہ میں یہاں تک سختی ہے کہ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں تک سے پردہ کرتی ہین پس ایسی قید کی صورت میں لازم ہوا کہ عورتیں اپنے واسطے کچھ خاص اصطلاحین اور محاورے مخصوص کرلیں۔ مثلاً مرد چونکہ آزاد تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں لہذا وہ دوسری زبان کے الفاظ بے تکلف بولنے لگتے ہیں۔ عورتیں برعکس اس کے اپنے پردہ اور عدم تعلیم کی وجہ سے اپنی خالص زبان کی پابند رہتی ہین۔ اور اس کی صحت اور بے میل رہنے کی حفاظت کرتی رہتی ہیں۔ پھر چونکہ عورتوں کے مزاج میں فطرتاً قدامت پسندی اور تغیر ناآشنائی ہوتی ہے اس وجہ سے دوسری زبان کے ثقیل اور کڈھب الفاظ ان کو پسند نہیں آسکتے۔ مزید برآں ان میں چونکہ قدرتاً شرم وحیا اور ضعیف الاعتقادی ہوتی ہے ایسے الفاظ ان کو ایک رمز و کنایہ سے اور خاص طریقہ سے وضع کرنا پڑتے ہیں۔ جن کے نام لینے میں ان کو شرم وحیا مانع ہو یا وہم وخوف دامنگیر ہو۔ یہ تخصیص اصطلات و محاورات ظاہر ہے کہ اُن گھرانوں میں بہت زیادہ ہے جہاں پردہ کی زیادہ سختی سے پابندی ہوتی ہے اس فرق مذکورۂ بالا سے انشا اور رنگین نے اپنے خاص اغراض کے لئے فائدہ اٹھایا اور اپنی نو ایجاد طرز کا دارومدار اسی مخصوص عورتوں کی زبان اور نیز عیاشی اور بداخلاقی پر رکھا۔

ریختی اس زمانہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا بہترین آئینہ ہے جبکہ لکھنؤ کے عیش پسند

فرمانرواں اور امرا کی محفلوں میں عیش و عشرت اور حسن پرستی کا بازار گرم تھا اور بازاری عورتوں کا عشق داخل فیشن ہوگیا تھا۔ شہر کے نوجوان امرا اس قسم کی بے اعتدالیوں سے متنبہ ہونے کے بجائے انکو کھلم کھلا اور بلا خوف لوم لائم عمل میں لاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی نظم بھی ان کے جذبات اور اُن کے مذاق کا آئینہ ہونا چاہیئے۔ مگر حقیقت میں اس قسم کی ناشائستہ اور غیر مہذب نظمیں نہایت ہی مخرب اخلاق اور نوجوانوں کے حق میں سم قاتل ہیں چنانچہ خود انشانے بھی اس قسم کے فواحش کے بُرے اثر کا ذکر ایک جگہ اپنے دریائے لطافت میں کیا ہی بہرطور یہ طرز اس زمانہ میں بہت مقبول تھا اور اسکی ترقی کی معراج میر یار علی المتخلص بہ جانصاحب کے زمانہ میں ہوئی۔ جان صاحب میر امن کے بیٹے اور نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے وطن اصلی لکھنؤ تھا مگر آخر عمر میں بسبب ملازمت زیادہ تر رامپور میں رہے جانصاحب نے اپنی تمام عمر اسی خاص صنف میں بسر کردی اور اپنی خاص روش میں خوب کہتے تھے مشاعروں میں زنانہ لباس سے شریک ہوتے اور بالکل عورتوں کے طریقہ سے پڑھتے جس سے سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے ۱۸۴۷ء میں وہ دلی گئے تھے اور وہاں سے تلاش روزگار بھوپال آئے مگر ناکام رہے آخر کار رامپور میں نواب کلب علیخاں کے دامن دولت سے وابستہ ہوگئے اور یہیں رامپور میں کچھ اوپر ستر برس کے سن میں ۱۸۹۷ء میں انتقال کیا۔

غرضکہ یہ صنف شاعری اب مقبول نہیں ہے اور مہذب جلسوں میں اس کو کوئی پسند نہیں کرتا البتہ مذاق و ظرافت کے وہ اشعار جو دائرہ تہذیب سے خارج نہوں عام طریقہ سے پسند کیے جاتے ہیں۔

شاعر شاہان دہلی
شاہ عالم ثانی
۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۶ء

آخر زمانہ کے شاہان دہلی شعراء کے مربی بھی تھے اور خود بھی اچھے خاصے شاعر تھے مثلاً شاہ عالم ثانی جو آفتاب تخلص کرتے تھے ایک

مثنوی موسوم "بہ مضمون اقدس" کے مصنف ہیں جس میں ایک فرضی افسانہ مظفر شاہ بادشاہ چین کا ہے یہ مثنوی کا تاریخی نام ہے[لہ] جس سے ۱۲۰۱ نکلتے ہیں۔ اس مثنوی کے علاوہ ان کا ایک دیوان غزلوں کا ۴۴ صفحات کا ہے وہ فارسی بھی کہتے تھے چنانچہ ان کا فارسی دیوان بھی موجود ہے اور وہ قصیدہ جس میں نمک حرام غلام قادر کے ظلم و ستم کا اور اپنی آنکھیں نکالے جانے کا ذکر کیا ہے بہت ہی دردناک ہے۔ بڑے بڑے شاعر مثلاً سودا۔ میر۔ نصیر۔ اعظم۔ انشاء۔ زار۔ ممنون۔ احسان اور فراق وغیرہ یہ سب انکی سرکار کے دعاگو تھے۔

مرزا سلیمان شکوہ متخلص بہ سلیمان | شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے تھے۔ غلام قادر کی بغاوت کے بعد دہلی سکونت چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور مثل اپنے برادر بزرگ مرزا جواں بخت بہادر ولی عہد کے وہیں رہنے لگے۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے اخراجات کے لئے چھ ہزار ماہوار مقرر کر دیے تھے۔ نواب سعادت علیخان اور غازی الدین حیدر ۱۸۱۷ء تک ان سے جھک کر ملتے تھے اور نذریں دیتے تھے جب غازی الدین حیدر نے تاج شاہی پہنا تو ملاقات بدرجہ مساوات چاہی شاہزادہ نے باقتضائے مصلحت وقت مرزا نصیر الدین حیدر ولی عہد سلطنت کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی جنھوں نے سلطان بہو کا خطاب پایا۔ مگر شوہر و بیوی میں ناموافقت رہی ۳۸ سال لکھنؤ میں رہ کر کاسگنج اپنے پرانے دوست کرنل گارڈنر کے پاس چلے گئے بعد کو اکبرآباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں کئی بار دہلی آئے ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا اور سکندرہ میں مدفون ہوئے شعرا کے بہت سرپرست تھے خود بھی اچھے خاصے شاعر صاحب دیوان ہیں۔ ابتدا میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے اسکے بعد مصحفی اور انشاء کو کلام دکھایا۔ دہلی سے جو باکمال

[لہ] تاریخ صحیح نہیں نکلتی اس سے صرف ۱۱۰۱ نکلتے ہیں ۱۲۔

لکھنؤ جاتا پہلے ان کے یہاں حاضر ہوتا اور صاحب عالم بھی الطاف امیرانہ سے پیش آتے لکھنؤ میں شاعرے کرتے مصحفی قتیل۔ انشا۔ میر حسن سب اسی سرکار کے دعاگو تھے۔ ان کا قلمی دیوان لالہ سری رام صاحب مصنف خمخانہ جاوید کے کتبخانہ میں موجود ہے۔

اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۶ تا ۱۸۳۷ء	ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی حضرت شاہ عالم ثانی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۰۶ء

میں تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا۔ ظفر نے تاریخ کہی ہے ؎

پے سال وفات گفت ظفر	عرش آرامگاہ عالی قدر

موزوں طبع تھے۔ اپنے باپ کے تخلص "آفتاب" کی رعایت سے شعاع تخلص کرتے تھے فکر سخن کی طرف توجہ کم تھی لیکن شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے میر نظام الدین ممنون غالب علی خان سید۔ شاہ نصیر وغیرہ ان کے دربار کے شاعر تھے۔

بہادر شاہ ثانی متخلص بہ ظفر	خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار مرزا ابوالمظفر سراج محمد بہادر شاہ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ ولادت ۱۷۷۵ء میں ہوئی اور باپ کے

مرنے کے بعد ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھے اور غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں معزول ہو کر ملک برہما میں جلاوطن کیے گئے جہاں ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا۔ بہادر شاہ شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور اکثر اپنا وقت اس میں صرف کرتے تھے۔ چونکہ سلطنت کا کام کاج کچھ نہیں تھا زیادہ تر وقت شعر گوئی میں گزرتا تھا استاذ ذوق اور مرزا غالب کو کلام دکھاتے تھے۔ مگر قبل اس کے شاہ نصیر سے استفادۂ سخن کیا تھا شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی ان کو اچھا دخل تھا انکی اکثر ٹھمریاں شمالی ہند میں بہت مقبول ہوئیں۔ خوشنویس بھی بہت اچھے تھے اور اکثر اپنے ہاتھ

کے لکھے ہوئے قرآن شریف دلّی کی بڑی مسجدوں میں بطور ہدیہ کے بھیجے تھے انھوں نے ایک شرح گلستاں بھی لکھی جو ایک اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے مگر انکی شہرت کی اصلی بناد انکے ضخیم کلیات پر ہے جو بہت مشہور ہے چار دیوان ان کے شایع ہو چکے ہیں ان کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کی غزلین اسقدر مقبول ہین کہ اکثر ناچ رنگ کے جلسوں میں گائی جاتی ہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انکے استاد ذوق اور غالب اُن کو غزلیں کہکر دے دیتے تھے اور اسمیں شک نہیں کہ ظفر کی بعض غزلوں میں ان دونوں استادوں کا رنگ پایا جاتا ہے مگر پھر بھی ظفر کے خود شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں کیونکہ انکی بہت سی غزلیں ان کے خاص رنگ کی ہیں جو ذوق و غالب سے بالکل علیحدہ ہی معلوم نہیں کہ ظفر نے بحالت قید بھی شغلہ شعر و شاعری جاری رکھا تھا یا نہیں اغلب ہے کہ یہ دلچسپ شغلہ ان سے نہ چھوٹا ہو اور پھر ان کا اس زمانہ کا بھی کلام موجود ہو کیا تعجب ہے کہ سعی و تلاش اس معاملہ میں آیندہ کامیاب ہو۔

ان کا طرز کلام بہت صاف اور سادہ ہے۔ کلام بہت مزیدار سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور ایک خاص درد و اثر رکھتا ہے جو ان کے مصائب کی اصلی تصویر ہے۔ ظفر اکثر جگہ مشکل مشکل بحریں اور سخت ردیف و قافیہ میں بھی غزلین کہتے تھے۔ جو بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ ان کے خیالات بلند اور تشبیہیں رنگین اور جذبات دلنشین ہوتے ہیں

اس دور میں مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ اور بھی شعرا گذرے ہیں جو اگرچہ ان پایہ کے نہ تھے مگر پھر بھی مشاہیر میں انکا شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً قائم۔ قاسم۔ حسرت۔ منت۔ ممنون وغیرہ۔ ان کے علاوہ بعض شعراے دور سابق کا بھی کچھ حال جو گذشتہ باب میں رہ گیا تھا مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

قائم چاند پوری | شیخ قیام الدین نام تھا بڑے اعلیٰ درجہ کے شاعر خاصکر قطعات اور رباعیات میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے

مگر ملازمت کے تعلق سے زیادہ حصہ دہلی میں بسر ہوا جہاں وہ داروغہ توپخانہ تھے شروع میں اپنا کلام خواجہ میر درد کو دکھاتے تھے۔ بعد کو سودا کے شاگرد ہو گئے انھوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا ہے جو کمیاب ہے۔ دلی کی تباہی کے بعد وہ ٹانڈہ (قریب آنولہ) میں نواب محمد یار خاں کی رفاقت میں رہتے تھے اسکے بعد رامپور گئے جہاں سنہ ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔ انکی نسبت مصحفی لکھتے ہیں "در ریختگی کلام و چستی مصراع غزل درویہ و قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استاد راہ می رفت در بعضی مقام رجحان می جست" اور مرزا علی لطف اپنے تذکرہ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں "مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے راقم آثم کو تو طور گویائی اس سخن آفرین کا نہایت مرغوب ہے۔

منت | میر قمر الدین منت دلی کے رہنے والے ننھیالی رشتے سے سید جلال بخاری کی اولاد سے تھے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سایہ عاطفت میں دلی میں پرورش پائی۔ روحانی تعلیم مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی اور مشورہ شعر و سخن میر نور الدین نوید اور میر شمس الدین فقیر سے کرتے تھے۔ بہت پر گو شاعر تھے ایک کلیات تخمیناً ڈیڑھ لاکھ اشعار کا اپنی یادگار چھوڑا۔ متعدد مثنویاں تصنیف کیں۔ جس میں سے ایک شکرستان ہے جو شیخ سعدی کی گلستان کے جواب میں لکھی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

دریں عمر دہ مثنوی گفتہ ام	بہ آئین طرز نوی گفتہ ام
چو اشعار من در عدد میر سد	شمار قصائد بصد میرسد
بود شعر من در غزل سی ہزار	زیا نصد رباعی اگر گرفتم شمار

دلی چھوڑ کر سنہ ۱۱۹۳ھ میں لکھنؤ آئے۔ یہاں مسٹر جانسٹن سے ملاقات ہوئی کر

جو اُن کو کلکتہ لے گئے اور مارکوئس آف ہسٹنگز کے روبرو ان کو پیش کیا۔ لارڈ موصوف نے خطاب ملک الشعرائی ان کو عنایت کیا۔ ان کی مدح میں ان کے اکثر قصائد ہیں۔ ۱۲۰۰ھ میں گورنر جنرل نے ایک خاص سفارت پر ان کو حیدرآباد بھیجا۔ وہاں پہونچ کر حضور نظام کی مدح میں انھوں نے قصیدہ پیش کیا جس کے صلے میں بہت انعام واکرام پایا۔ بعد واپسی حیدرآباد عظیم آباد میں مہاراجہ ٹکیٹ رائے کی مصاحبت میں چند دنوں رہ کر پھر کلکتہ کا رُخ کیا جہاں پہونچتے ہی ۱۲۰۵ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

اس آنے کا کچھ ہے لطف پیارے		ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم
	ولہ	
آہ اب کثرت داغ غم خوباں ہے مدام		صفحۂ سینہ پراز جلوۂ طاؤسی ہے
	ولہ	
گر اس لب جاں بخش کی کچھ بات سناؤں		علیٰ بھی جو کچھ پوچھے تو صلوات سناؤں

ممنون | میر نظام الدین ممنونؔ خلف میر قمر الدین منتؔ۔ ان کے آبا واجداد سونی پت کے رہنے والے تھے مگر ان کی ولادت دلی میں ہوئی اور وہیں نشو و نما پایا۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو فخر الشعرا کا خطاب عطا کیا اور اکثر لوگ انکے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہوگئے۔

کچھ دنوں یہ اجمیر میں بحیثیت صدر الصدور رہے تھے۔ مگر پھر دلی آگئے جہاں ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔ خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور شاگرد بھی نامی و گرامی چھوڑے۔ مثلاً مفتی صدر الدین خاں آزردہ وغیرہ ان کا دیوان کمیاب ہے اسکے دیکھنے سے ان کی قادر الکلامی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

حسرت دہلوی | مرزا جعفر علی نام حسرتؔ تخلص، ابو الخیر عطار کے بیٹے تھے دلی میں

پیدا ہوئے اور ابتدائً عطاری کا پیشہ کرتے تھے۔ شعر سے ان کو فطری ذوق تھا اور اس فن میں انھوں نے کمال حاصل کیا۔ جب شاہ عالم ثانی سریر آرائے سلطنت ہوئے تو حسرت بھی اور شعرا کے ساتھ دامن دولت سے وابستہ ہوگئے۔ جب نمکحرام غلام قادر نے بدنصیب بادشاہ کی آنکھیں نکالیں اور اسی قسم کی دوسری زیادتیاں کرکے لوٹ مار و بیگمات شاہی کی بیحرمتی وغیرہ کا ہنگامہ برپا کیا تو اس عبرتناک منظر کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا چنانچہ اسی قیامت خیز واقعہ کی نسبت انکی ایک دردانگیز نظم ہے۔ حسرت دلی چھوڑ کر فیض آباد گئے جو اُس وقت اودھ کا دارالسلطنت تھا۔ اپنے سفر کے مصائب اور حالات کے بیان میں انھوں نے ایک دلچسپ نظم لکھی ہے جس میں سفر کی تکلیفیں، دھوپ کی شدت، پانی کی قلت، سُست رو گاڑی کی مصیبت وغیرہ وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ فیض آباد پہونچ کر انھوں نے نواب کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا اور اسکے صلے میں کچھ وظیفہ مقرر ہوگیا جب شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نواب ہوئے تو حسرت نے انکی تہنیت میں ایک دوسرا قصیدہ کہکر ان کے سامنے پڑھا۔ ۱۱۹۵ھ میں جب لکھنؤ دارالسلطنت ہوا تو حسرت بھی اپنے دوستوں کے اصرار سے لکھنؤ آگئے اور یہاں گھنٹا بیگ کی گڑھیا پر قیام تھا۔ شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں حسرت کے شاگرد رشید میاں جرأت بھی اپنے استاد کے پاس رہنے لگے اور یہ دونوں شاگرد و استاد لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہوکر اپنی پرکیف غزلوں پر سامعین سے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔ حسرت سب سے پہلے مرزا احسن علی خاں بہادر کی رفاقت میں تھے اس کے بعد پرنس جہاندار شاہ کے ملازم ہوگئے مشہور ہے کہ یہ پالکی میں سوار ہوتے تھے جو امرا کے لیے مخصوص تھی اس سے ان کے ہم پیشہ ساتھیوں کو رشک ہوا اور انھوں نے ان کے چڑھانے کے لیے بہت سی

ہجویں کہیں اور تمسخر کے اشعار لکھے۔ سودا نے بھی اس میں حصہ لیا۔ خود حسرت نے ایک لکھنؤ کے حکیم کی ہجو لکھی جس میں اس کے پیشہ اور قابلیت پر حملہ کیا ہے انکو شاہزادۂ سلیمان شکوہ بھی کچھ درماہہ دیتے تھے۔ وہ راے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے اور خود انکے بھی شاگرد بکثرت تھے چنانچہ میر حسن تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "کثرت شاگرد انش چنان ست کہ در صورت شناسی خود ہم حیران ست ان سب میں جراًت اور نواب محبت خاں محبت بہت نامور شاعر ہوئے ہیں۔ مشہور ہے کہ وفات ۱۲۱۰ھ میں ہوئی اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے تصنیفات میں ایک کلیات ہے۔ جس میں ساقی نامہ، مثنوی، واسوخت، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس، قصیدے، رباعیاں، اور دو دیوان غزلوں کے ہیں۔ غرض کہ اصناف سخن میں ہر قسم کے نمونے اس میں پائے جاتے ہیں۔ خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ غزل کو اکثر قطعہ پر ختم کرتے ہیں اور اکثر مسلسل غزل ایک ہی مضمون پر لکھتے ہیں

قدرت | شاہ قدرت اللہ قدرت میر شمس الدین فقیر کے برادر عمزاد تھے اور کوئی عجب نہیں کہ ان کے شاگرد بھی ہوں۔ نساخ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ مرزا مظہر جانجاناں اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے ۱۲۰۵ھ میں مرشد آباد میں انتقال کیا میر انکی نسبت کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے اور ان کو "عاجز سخن" لکھا ہے۔ مگر میر حسن نے اُن کے کلام کی بہت تعریف کی ہے لکھتے ہیں "سمند نظمش در میدان فارسی و ہندی چالاک وچست وتصویر بینظیر معانیش در استخوان بندی الفاظ درست بندہ دیر ایک بار در مشاعرہ بہ لکھنؤ دیدہ ام" اسی طرح مرزا علی لطف بھی انکے بہت مداح ہیں چند اشعار بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں سے

ہنگامۂ پرہیز دو سہ اب بسر آیا
اے بادہ کشو مژدہ کہ پھر ابر تر آیا

کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے
شاید تہ مژگاں کوئی لخت جگر آیا

ولہ

مجھ کو غفلت نے خبر ایام فرصت کی نہ دی	آہ جب جاتے رہے دن تب ہیں پچھتانے لگا

ولہ

سینہ اس کا ہے دل اسکا ہی جگر اُسکا ہے	تیر بیداد جدھر رُخ کرے گھر اس کا ہے

ولہ

ایک ہی پردے کے گر سمجھو تو یہ سب ہیں الاپ	گر صدائے چنگ ہی یا نغمۂ ناقوس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے	اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
کل ہوس اسطرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے	کیا ہی ملک روم ہے کیا سر زمین روس ہے
گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجے زندگی	اس طرف آواز طبل اودھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہوئے گلگلوں کا دور	شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشہ میں سب تجھے	چل دکھاؤں گیا تو اپنی آز کا مجبوس ہے
لیگئی اکبارگی گورِ غریباں کی طرف	جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے	یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و تمکنت دنیا سے آج	کچھ بھی ان کے ہاتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا
آج رہن جام ہے یہ خرقۂ سالوس ہے

بیدار — میر محمد علی عرف میر محمدی متخلص بہ بیدار خواجہ میر درد کے دوست اور شاگرد بھی تھے۔ فارسی میں مرتضیٰ قلی خاں فراق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ حاتم کو بھی کلام دکھایا تھا۔ مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کے مریدوں میں تھے آخر عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے جہاں سنہ ۱۲۰۹ھ مطابق سنہ ۱۷۹۴ع میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے میر درد مرزا کے ہمعصر تھے۔ دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے

ان کے کلام میں صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بھی اچھا خاصہ ہے دوچار شعر نمونہ کے دیے جاتے ہیں ؎

ہم خاک بھی ہو گئے و لیکن		جی سے نہ ترے غبار نکلا
	ولہ	
تیرے رخسار و قد و چشم سے ہیں عاشق زار		گل جدا، سرو جدا نرگس بیمار جدا
	ولہ	
بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی		صحرا میں قیس، کوہ میں فرہاد رہ گیا
	ولہ	
چھوڑ کر کوئے بتاں جاتا ہے تو کعبہ کو		جلد پھر یو تجھے بیدار خدا کو سونپا
	ولہ	
ربط جو چاہیئے بیدار سو اس سے معلوم		مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

ہدایت | ہدایت اللہ خاں دہلوی خواجہ میر درد کے مریدوں اور شاگردوں میں تھے ۱۲۱۵ھ میں انتقال کیا۔ صاحب دیوان ہیں۔ اور بقول مرزا علی لطف ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں بھی خوب لکھی ہے۔ میر تقی میر اور میر حسن دونوں ان کے کمالات شاعری کے معترف ہیں۔

فراق | حکیم ثناء اللہ خاں متخلص بہ فراق ہدایت اللہ خاں ہدایت مذکورۂ بالا کے بھتیجے تھے۔ کسب سخن اور کسب باطن خواجہ میر درد سے کرتے تھے۔ مشاہیر عصر میں سے تھے اور دلی کے بہت نامور حکیم سمجھے جاتے تھے مصحفی اور میر حسن نے اُن کا ذکر خیر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ میرے سامنے انھوں نے تحصیل طب کی اور جب میں شاہجہان آباد میں تھا تو مجھ سے اور ان سے مراسم دوستی و محبت بہت تھے۔

ضیا | میر ضیاء الدین ضیا دہلوی سودا کے معاصر تھے دلی سے فیض آباد اور لکھنؤ آئے اور یہاں سے عظیم آباد گئے جہاں مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے راجہ بہادر متخلص بہ راجہ ان کے شاگرد ہو گئے پٹنے ہی میں انتقال کیا میر حسن اور مرزا علی لطف ان کے کلام کے معترف ہیں اور آخر الذکر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "اکثر شعر در زمین سنگلاخ گفتن و الفاظ نامقبول رامقبول دلہا ساختن کار اوست" میر حسن ابتدا میں انھیں کے شاگرد تھے انکو قصیدے اور مثنوی وغیرہ سے شوق نہ تھا صرف غزل کو پسند کرتے تھے جیسا کہ میر حسن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے سنگلاخ زمینوں میں کہنے کا شوق تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

رسوائیوں کی اپنے مجھے کچھ ہوس نہیں		ناصح یہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں
کسی دشمن کی بھی یارب نہ گذرے شب جدائی کی	ولہ	کہ جیسے اس سے میرے وصل کا اکدن گذرتا ہے
راز دل ہیں پوچھتے اور بولنے دیتے نہیں		بات منھ پر آرہی ہے لب ہلانا منع ہے
	ولہ	
اے آہ بیچ نکل نہ کہیں دل تھلک پڑے	ولہ	یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے
کون سے زخم کا کھلا ٹانکا		آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

صاف تھا جب تک تو ہم کو بھی جواب صاف تھا
اب جو خط آنے لگا شائد کہ خط آنے لگا
کل کی رسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے ننگ خلق
اس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

بقا | شیخ بقاء اللہ اکبرآبادی حافظ لطف اللہ خوش نویس کے بیٹے تھے دلی میں پیدا ہوئے مگر لکھنؤ میں توطن اختیار کیا فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اردو میں شاہ حاتم اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ فارسی میں حزیں اور اردو میں بقا تخلص کرتے تھے۔ جو اپنے استاد شاہ حاتم کے کہنے سے رکھا تھا۔ میر و سودا دونوں کو

خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان دونوں سے اور ان سے اکثر چوٹیں چلتی تھیں چنانچہ جب ان کے دوآبہ کا مضمون میر صاحب نے بھی باندھا تو انھوں نے جل کر کہا ؎

میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا یا خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے	اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

اِک اور موقع پر میر صاحب کی اس طرح خبر لیتے ہیں ؎

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میرؔ	اور بستی نہیں یہ دلی ہے

ایک جگہ میر و مرزا کی شاعری کا فرق اپنے مذاق اور ٹھٹھول میں اس طرح دکھایا ہے ؎

میر و مرزا کی شعر خوانی نے کھول دیوان دونوں صاحب کے کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن	بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی اے بقا ہم نے جب زیارت کی ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی

یعنی ایک کے کلام میں روکھی پھیکی اخلاق آموزی ہے اور دوسرے کے یہاں محض ظرافت و تمسخر۔ مفلسی سے تنگ آکر تسخیر کواکب کے اعمال کا شوق کیا تھا اس سے انکا دماغ خراب ہوگیا آخر کار ہر طرف سے مجبور ہو کر ۱۲۰۶ھ میں عتبات عالیات کی زیارت کو چلے مگر راستے ہی میں انتقال کیا۔ اپنے زمانہ کے مشہور شاعروں میں تھے، صاحب دیوان ہیں۔

حزیں میر محمد باقر حزیں مرزا مظہر جانجاناں کے ممتاز شاگردوں میں تھے بزرگ استاد سے بہت حسن عقیدت اور محبت رکھتے تھے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

جسطرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیںؔ	حضرتِ استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

مصائب روزگار سے تنگ آکر دلی سے پٹنہ عظیم آباد پہونچے۔ وہاں نواب صولت جنگ

نے ان کی بڑی قدر دانی کی ۔ ایک دیوان یادگار ہے جس میں قصائد اور غزلیں ردیف وار موجود ہیں دو تین شعر بطور نمونہ کے یہاں دیے جاتے ہیں

کچھ کہا شاید اس نے قاصد سے	دل میں میرے وہ اضطراب نہیں
حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ	اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو
ہر نصیحت میں تری مانو نگا اے ناصح پر ایک	دلبروں کے دیکھنے میں جی مرا تا چار ہے

بیان خواجہ احسن اللہ کشمیری النسل تھے اور دلی میں پیدا ہوئے ۔ مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد اور مولانا فخرالدین کے مرید تھے ۔ آخر عمر میں حیدرآباد گئے اور نواب آصف جاہ ثانی کی ملازمت میں زندگی عزت سے بسر کی ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی اور حیدرآباد ہی میں مدفون ہوئے ان کی وفات کی تاریخ ہے "استاد از جہاں رفت" میر حسن اپنے تذکرہ میں ان کے بڑے معترف ہیں لکھتے ہیں "شاعر عذب البیان از خوش گویان زمان خواجہ احسن اللہ المتخلص بہ بیان از تلامذہ مرزا مظہر جانجاناں، زیچ نامہ اش مشہور ست بسیار خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد" نمونہ کلام یہ ہے

کوئی کسی کا بیان آشنا نہیں دیکھا	سوائے اسکے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا
مصلحت ترک عشق ہے ناصح	لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
کہتا نہیں میں عرش پہ اے نالہ جا پہونچ	کانوں تلک تو اسکے تو اے نارسا پہونچ

عرش تک جاتی تھی اب لب تک کبھی آسکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاں اب مجھ کو اپنی آہ پر

صاف منھ پر میں نہیں کہتا کہ ہر گا اس کے پاس
ورنہ کیا واقف نہیں میں دل ہے میرا جس کے پاس

کافر ہوں گر زیادہ کچھ اس سے آرزو ہو	اک تنگل مکان ہو جس میں ہوں اور تو ہو
وصل کی شب کا ماجرا کیا کہوں تم سے ہمنشیں	شام سے لیکے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

تغافل کے قرباں تجاہل کے صدقے		بیان کون ہے اب تلک پوچھتے ہو	
	ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی		جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی

راسخ — شیخ غلام علی راسخ شاگرد میر سنہ ۱۱۶۲ھ پٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے شروع میں مرزا فدوی اور مرزا اشرف کو کلام دکھاتے تھے مگر آخر میں باقاعدہ طور پر میر تقی میر کے شاگرد ہو گئے تھے اور میر صاحب ان کا بڑا خیال کرتے تھے سنہ ۱۲۲۱ھ تک کلکتہ، غازیپور، دلی، لکھنؤ کی سیاحت میں مصروف رہے۔ اس کے بعد اپنے وطن مالوف کو واپس آئے اور شعر و شاعری کا مشغلہ وہاں بہت زور و شور سے شروع کر دیا۔ چہتر برس کی عمر پا کر سنہ ۱۲۳۸ھ یا ۱۲۴۰ھ میں وفات پائی، زبان پاکیزہ اور طرز بیان صاف و سادہ ہے سادہ اشعار کے ساتھ رنگین شعر بھی بہت ملتے ہیں جب لکھنؤ میں تھے تو نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی تعریف میں قصیدے بھی کہے تھے۔

باب ۳

اساتذۂ لکھنؤ

ناسخ و آتش کا زمانہ

مرکز شاعری لکھنؤ میں منتقل ہوتا ہے — شاعری کا مرکز ترقی دلی سے ہٹ کر اب لکھنؤ میں آ گیا اس کے اسباب مختصراً یہ تھے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری فرمانروا بہت کمزور اور محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ سب سے پہلا حملہ جس نے قصر سلطنت کو متزلزل کر دیا نادر شاہ کا تھا جس سے شیرازۂ حکومت بکھر گیا اور درخت اقبال کی جڑیں کمزور ہو گئیں۔ نادر شاہ کے حملے کی تباہی اور بربادی سے ابھی سلطنت

نہیں سنبھلی تھی کہ احمد شاہ دُرّانی اور مرہٹوں کی قتل و غارت نے لوگوں کی جان و مال کو اور زیادہ غیر محفوظ کر دیا۔ شاہ عالم ثانی۔ بدبخت اور نمک حرام غلام قادر کے مظالم کا نشانہ بنے جس نے ایسے نیک دل اور فرشتہ سیرت بادشاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں اور ان کو قید کر لیا۔ ستم رسیدہ بادشاہ نے اپنی اس مصیبت و پریشانی کی حالت میں سیندھیا اور انگریزوں سے مدد چاہی۔ چنانچہ ان کے اس دردناک قصیدے کے جو اس مصیبت کے وقت میں لکھا تھا چند اشعار یہ ہیں ؎

شاہ تیمور[1] کہ دارد سر نسبت با من	زود باشد کہ بیاید بمدد گاری ما
مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من ست	ہست مصروف تلافی ستمگاری ما
راجہ و راؤ زمیندار و امیر و چہ فقیر	حیف باشد کہ نسازند بہ غمخواری ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند	چہ عجب گر نمایند مدد گاری ما

اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کے امرائے دولت بھی اپنے باہمی رشک و حسد اور فساد و عناد سے باز نہیں آتے تھے۔ اس عام بد امنی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے وہ شاعر جو سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ مثلاً میر، سودا، میر حسن، انشا وغیرہ انھوں نے بھی دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رُخ کیا جو اس وقت ان کا قدر شناس اور ان کے واسطے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی قدر دانی میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا۔ شعرائے دلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے سلطنت کی طرف سے ان کے واسطے جاگیریں وظایف و انعام و اکرام مرحمت ہوئے۔ اور ان کی نازک مزاجیاں اور بد دماغیاں تک بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں بلکہ اکثر انھیں صفات کی تعریف کی جاتی تھی سلسلۂ روابط

[1] تیمور شاہ والی کابل ان کے بہنوئی تھے ۱۲

کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے نوابان عہد اور امرائے وقت نے اکثر شعرا کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کرلیا اور انکو اپنا رفیق و مصاحب بنالیا۔ مگر سچ پوچھیے تو یہی ربط و ضبط اور دربار کا تعلق بالآخر شاعری کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا۔ شروع میں جب کہ سرمایہ داران شعر آزاد مزاج اور خود دار ہوتے تھے تو اس میل جول سے کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس نے شاعری اور زبان کی ترقی میں بہت مدد دی۔ مگر مابعد کے زمانہ میں جبکہ شعرا، اپنی عزت و آبرو کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے تھے اور اپنے کلام کو اپنے عیش پرست مالکوں کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے اس سے بہت بُرے نتائج سرزد ہوئے مرتبہ شاعری پست ہوگیا۔ شعرا نے اپنے ہاتھوں خود کو ذلیل کرلیا مثال کے لئے میر و سودا اور انشا و مصحفی کی حالت پر نظر کرو اول الذکر دونوں اصحاب گو کہ سلطنت کے وظیفہ خوار تھے مگر نہایت بلند اور آزاد طبیعت رکھتے تھے وہ کبھی اپنے اشعار میں کسی کی دست اندازی یا کسی خاص رنگ کی پیروی جو ان کی طبیعت کے خلاف ہوتی گوارا نہیں کرتے تھے برعکس اس کے مؤخر الذکر دونوں بزرگ درباداری کے اثر سے متاثر ہوگئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بجائے الہامی ہونے کے محض رسمی اور تکلفات کی رہ گئی۔

لکھنؤ کا طرز شاعری | اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ میں چراغ شاعری دلی والوں نے روشن کیا۔ اور شاعری کا مذاق یہاں انھوں نے پھیلایا ان لوگوں کے آنے سے پہلے مشہور مقامی شاعر یہاں کوئی نہیں تھے۔ لکھنؤ کے مستقر الخلافت ہو جانے اور شعرائے دہلی کے یہاں بکثرت آجانے سے یہاں مذاق شاعری بہت پھیل گیا اور شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ بادشاہ بڑے ذوق و شوق سے شاعروں کو اپنی مصاحبت میں جگہ دیتے تھے سودا کے بلائے جانے کا واقعہ مشہور ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے ان کو طلب کیا اور ایک خوبصورت حیلہ سے انھوں نے اس کو ٹال دیا۔ شعر کا اتنا چرچا پھیلا کہ جا بجا

لہ دیکھو صفحات ۱۱۰ و ۱۱۱

مشاعرے ہونے لگے۔ امرا اور رؤسا اور نیز عوام الناس بھی شاعری کے دیوانے تھے عمدہ اشعار پڑھ کر اور سُن کر لوٹ جاتے تھے۔ مشاعروں کی محفلیں ماہوار اور اور ہفتہ وار سے ترقی کرکے اکثر جگہ روزانہ ہوتی تھیں جس میں شعرا اپنی اپنی عمدہ غزلیں پڑھتے تھے اور سامعین کی تعریف سے ان کے دل بڑھتے تھے اس مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ علاوہ کلام کی کثرت کے لوگ ایک دوسرے پر فوقیت لے جانیکی کوشش کرتے تھے اور یہی فوقیت اور سرسبزی کا خیال لوگوں کے لیے مایۂ ناز تھا۔ اسی کثرت شوق نے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی جو بالکل مقامی تھا۔ دونوں اسکولوں کی نوعیت میں کوئی اہم اور اصولی فرق نہیں ہے مگر مضامین منتخب میں پسند طبع کے نمونے جُدا جُدا ہیں اور اسلوب بیان میں بھی فرق ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو جدت پسند طبائع نے قدامت پرستی سے گھبرا کر اپنے نام و نمود اور ندرت کے خیال سے نئی نئی راہیں نکالیں اور شعرائے دہلی کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ دیا۔ ناسخ اس طرز جدید کے پیشوائے اعظم ہیں اور ان کے بعض مشہور شاگرد بھی ان کے قدم بقدم چل کر کامیاب ہوئے یہاں تک کہ زمانۂ موجودہ میں وہ طرز خاص نامقبول ٹھہری اور اب شاعری نے ایک جدید روش اختیار کی۔

طرز دہلی اور طرز لکھنؤ کا فرق اور انکا تقابل

طرز دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذبات کی تصویر سادہ اور پراثر الفاظ میں کھینچی جاتی ہے تخئیل اور جذبات پر رعایت لفظی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ ناسخ اور ان کے متبعین نے برخلاف اسکے اپنی تمام تر توجہ شعر کے حسن ظاہری اور رعایت لفظی اور صنائع بدائع پر صرف کردی۔ یعنی الفاظ کی مصوری ایک بڑے اسلوب سے کی۔ شکوہ الفاظ پر بلند خیالی اور مصوری جذبات کو قربان کردیا۔ الفاظ میں صرف وہی لفظ منتخب کیے جو کسی پہلو سے مراعات النظیر میں شامل ہو سکتے تھے۔ مثلاً اگر کسی باغ کا منظر دکھانا ہوتا تو باغ ہی کی رعایت کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔ دوسرے الفاظ گو کتنے ہی مناسب اور موزوں

ہوتے نگران کو جگہ نہ ملتی اور سختی کے ساتھ ان کو برطرف کردیا جاتا اس رعایت لفظی کی بے انتہا پاسداری کا یہ اثر ہوا کہ شعر سے سادگی اور بے تکلفی جاتی رہی اور تکلف اور تصنع کی بھرمار ہوگئی ایسے الفاظ ڈھونڈھے جانے لگے جو مضمون سے کسی نہ کسی جہت سے ظاہری تعلق رکھتے ہوں گو دیگر وجوہ وہ کیسے ہی نامناسب اور بے موقع ہوں۔ گویا محض رعایت لفظی شعر کی خوبی اور عمدگی کا دار مدار رہ گئی اور الفاظ کے قربانگاہ پر درد، واثر، جذبات، سادگی، سلاست، فصاحت، بلاغت وغیرہ سب بھینٹ چڑھا دی گئیں اور اس کمی کو اغراق۔ غلو۔ اور دور از کار تشبیہوں نے پورا کیا۔ اس طرز میں کیفیات اور صحیح جذبات کی نازک تحلیل نہیں ہوتی۔ اور وہ روح کے اہتزاز کی پوری پوری ترجمانی نہیں کرتی اس میں شعر الفاظ رنگین کا محض ایک خوشنما گھروندا ہوتا ہے جو نظروں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر کبھی دلکش نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے پیش نظر صائب اور بیدل کا کلام تھا جس کا مطالعہ انھوں نے غور سے کیا تھا صائب کی طرح تمثال دوسرے مصرع میں پیش ہوتی تھی اور دعوے پہلے میں کیا جاتا تھا۔ یہ تمثالیں کہیں کہیں تو عمدہ اور دلچسپ ہوئی ہیں مگر بسا اوقات بالکل معمولی اور بے مزہ بیدل کی تتبع میں نازک اور باریک تشبیہوں اور نازک خیالیوں سے کام لیا گیا مگر اردو میں آکر وہ محض نقل ہوگئیں اور گورکھ دھندا بن گئیں۔ اس قسم کی بے قابو تخئیل پرانے شعرا کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ لکھنؤ کا طرز شاعری دماغ کو تو متوجہ کرتا ہے مگر دل پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ ایسے کلام کی صورت ظاہری بہت اچھی ہوتی ہے اور اسکا وہی حال ہے جیسا کہ انگریزی میں پوپ[1] اور اس کے متبعین کی شاعری کا ہے جسمیں سراسر تکلف اور تصنع ہے اور اصلیت اور درد و اثر مطلق نہیں جس سے گو دماغ لطف اندوز

[1] ایک مشہور انگریزی شاعر کا نام ہے ۱۲

ہوتا ہے مگر دل کو کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا شعر گوئی کی زحمت کے مقابلہ میں ایسے اشعار کا نتیجہ بالکل بے حقیقت ہوتا ہے پہلے پہلے تو تبدیل ذائقہ کے طور پر اس قسم کے اشعار اچھے معلوم ہوئے مگر جدت پسند طبیعتیں ان سے گھبرا گئیں کیونکہ معمولی کاریگروں کے ہاتھ میں شاعری تمسخر انگیز ہو گئی۔ بیہودہ اشعار کی کثرت سے لوگوں کا دل بھر گیا اور اب وہ انیس و دبیر کی جادو نگاری اور غالب و مومن کی مضمون آفرینی سے لطف اندوز ہونے لگے ہر دور کی شاعری اس وقت کا آئینہ ہوتی ہے یہی حال لکھنؤ کی بھی شاعری کا ہے۔ ناسخ اور اُن کے شاگردوں کا کلام اس زمانہ کی نسوانیت کا پتہ دیتا ہے ان کی غزلوں سے اس زمانہ کے زنانہ لباس اور زیور اور آرائش کی ایک مکمل فہرست مرتب ہو سکتی ہے کبھی کبھی اُن کے کلام سے زنانہ گفتگو مترشح ہوتی ہے جو دلی والوں کے یہاں نہیں ہے۔ دلی والے فارسی کے انداز میں چھوٹی چھوٹی غزلیں کہتے اور پامال اور فرسودہ خیالات سے بہت بچتے تھے۔ بخلاف اس کے شعرائے لکھنؤ ایک ایک زمین میں چھ غزلے اور پنج غزلے کہتے تھے اور یہ خراب رسم مصحفی اور جرأت کی نکالی ہوئی تھی اسی کثرت کی وجہ سے اکثر اوقات شعر میں بدمزگی اور بے لطفی اور کبھی کبھی ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔

تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا زمانہ

اس زمانہ میں اور نیز اس کے بعد کے زمانہ میں تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ جس کی ابتدا شیخ ناسخ نے کی اور انکے شاگردوں کی کوششوں سے یہ رنگ لکھنؤ اور رام پور میں پھیل گیا۔ یہی لوگ اصطلاح میں زباندان کہلاتے ہیں۔ رشک، بحر، سحر، منیر، جلال، برق، واجد علیشاہ اختر، اسیر وغیرہ یہ سب لوگ مناسب الفاظ کے انتخاب میں نہایت جانفشانی کرتے تھے اور ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ صحیح الفاظ و محاورے اشعار میں استعمال کیے جائیں۔ ہندی الفاظ اور محاورات کے صحیح استعمال میں بھی یہی لوگ سند سمجھے جاتے تھے۔ اس چھان بین

اور وقتِ نظر کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے الفاظ خارج کر دیے گئے اور لغات شعریہ بہت کم رہ گئے۔ اسی وجہ سے زبان مین ایک گرختگی پیدا ہو گئی کیونکہ جو الفاظ و محاورات منتخب شدہ تھے وہ صرف مقرر کردہ طریقہ پر استعمال کیے جا سکتے تھے اور مقرر کردہ قواعد کی خلاف ورزی معیوب سمجھی جاتی تھی۔

اس جدید طرز لکھنؤ نے زبان میں بھی بعض اختلافات پیدا کر دیے۔ لکھنؤ کے شعرا اور عوام الناس نے بعض الفاظ و محاورات کو خاص خاص محل پر استعمال کرنا شروع کیا اور انکا یہ دعویٰ ہے کہ یہ استعمال دہلی کے طریقہ استعمال سے بہتر اور موزوں تر ہے نیز یہ کہ ان کے پسند کردہ الفاظ و محاورات زیادہ تر لطیف و فصیح ہوتے ہین یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے زبان کی صرف و نحو تک پہونچ گیا اور تذکیر و تانیث میں فرق کیا جانے لگا یعنی بعض الفاظ جو اہل لکھنؤ کے نزدیک مذکر ہین وہ دہلی میں مؤنث بولے جاتے ہیں۔ اور بعض جو وہاں مونث ہیں وہ یہاں مذکر بولے جاتے ہیں یہ اختلاف جو بہت زیادہ اہم نہیں ہے اور صرف چند الفاظ تک محدود ہے اس کی ابتدا میر علی اوسط رشک شاگرد ناسخ نے کی تھی۔ ان کے بعد سے یہ قضیہ ابتک چلا آتا ہے اور ان دونوں مقاموں کے شعرا اب بھی اس فرق کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ متوفی سنہ ۱۲۵۴ھ مطابق سنہ ۱۸۳۸ء

شیخ امام بخش متخلص بہ ناسخ زبان اُردو کے بہت بڑے شاعر اور طرز لکھنؤ کے موجد تھے ان کے خاندانی حالات صحیح طور پر نہیں معلوم ہیں کہا جاتا ہے کہ ایک شخص مسمی خدا بخش خیمہ دوز جو لاہور کا ایک دولتمند سوداگر تھا اور کوئی اولاد نہیں رکھتا تھا انکو متبنیٰ کر لیا تھا اس نے ان کو بہت اچھی تعلیم دی اور مثل اپنی اولاد کے ان سے محبت کرتا تھا اس کے مرنے کے بعد اسکے بھائیوں نے وراثت کا جھگڑا کیا اور ناسخ کی بنیّت کو غلط ٹھہرا کر ان کو اپنے بھائی کا غلام بتایا رفتہ رفتہ کچھ مصالحت کی صورت

پیدا ہوئی اور اسی اثنا میں ناسخ کو زہر دینے کی تدبیر کی گئی مگر وہ کارگر نہ ہوئی یہ معاملہ بالآخر عدالت میں پہونچا جہاں سے ناسخ کے حق میں فیصلہ ہوا اور ان کے دیوان کی چند رباعیوں میں ان واقعات کی طرف حوالہ ہے مثلاً

(۱)

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام		پر کرتے نہیں غور خواص و عوام
وارث ہونا دلیل فرزندی ہے		میراث نہ پا سکا کہیں کوئی غلام

(۲)

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام		میراث پدر پائی مگر میں نے تمام
اس دعوئے باطل سے ستمگاروں کو		حاصل یہ ہوا کر گئے مجھ کو بدنام

فارسی اور عربی کی درسیات انھوں نے حافظ وارث علی اور علمائے فرنگی محل سے پڑھیں جو لکھنؤ میں ایک بہت بڑا تعلیمی مرکز ہے۔ وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعری میں ان کو کس سے تلمذ تھا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ میر کے پاس بغرض شاگردی گئے تھے مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ یہ بات کسی قدر اعتبار سے مصحفی کی سند سے کہی جا سکتی ہے کہ ناسخ تنہا سے اصلاح سخن لیتے تھے جو مصحفی کے شاگرد تھے مگر یہ تعلق زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا وہ اپنی ہی طبیعت پر زور دیتے تھے اور مشاعرہ کی غزلوں سے جو جو مزاولت بڑھتی جاتی تھی اسی قدر اُن کو کلام پر قدرت حاصل ہوتی جاتی تھی۔ بالآخر استاد مانے جانے لگے اور خود بیسیوں شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دینے لگے جن میں سے اکثر مرتبۂ کلام میں اُن سے کم نہیں ہیں۔ ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ بڑے تن و توش کے اور قوی ہیکل آدمی تھے اور کھاتے بہت تھے شادی نہیں کی تھی دن میں صرف ایک مرتبہ کھاتے تھے مگر اسوقت تقریباً پانچ سیر غذا نوش جان کر لیتے تھے رنگ سیاہ تھا اسی وجہ سے ان کے حریف اور بامذاق لوگ دُم کٹے بھینسے

کی پھبتی کہتے تھے۔ روزانہ معمول یہ تھا کہ صبح سویرے اٹھتے ورزش سے فراغت کرکے نہاتے پھر اپنے شاگردوں اور دوستوں سے ملتے اسکے بعد قریب بارہ بجے کے کھانا کھاتے اور تھوڑی آرام کرتے سہ پہر کو پھر وہی شاگرد اور احباب جمع ہوتے اور شعر و شاعری کا چرچا ہوتا۔ رات کو فکر سخن کرتے جس میں اپنی غزلیں بھی کہتے اور شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے بہت بڑے صاحب وضع تھے اور اسی پاسداری وضع کو دوسروں سے بھی چاہتے تھے جو ان سے ملنے آتے تھے۔ ان کی صحبت اور باتوں میں بڑی کشش تھی اسواسطے کہ باوجود شاعرانہ بد دماغی اور آزاد مزاجی کے لوگ کثرت سے ملنے آتے تھے جن میں اکثر لکھنؤ کے بڑے بڑے امرا اور رئیس ہوتے تھے، خود کبھی کسی کی ملازمت نہیں کی اور اپنے قدر دانوں کی قدرشناسی اور فیاضی کی بدولت نہایت آرام سے زندگی بسر کرتے تھے مشہور ہے کہ ۱۸۳۱ء میں نواب آغا میر نے سوا لاکھ روپیہ انکو دیا تھا۔ وہ انھوں نے کہیں رکھوا دیا تھا لوگوں نے جانا انہی کے یہاں ہے چور نے رات کو نقب لگائی مگر کچھ نہ پایا انھوں نے تاریخ کہی ؎

دزد و در خانۂ ناسخ چو زده نقب امشب	نہ زر و سیم نہ بد مس خجل آمد بیرون
بہر تاریخ مسیحی چہ بریدم سر دزد	دزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیرون

اس سے ۴ کے تخرجہ کے بعد ۱۸۳۱ء نکلتے ہیں۔

ناسخ ایک مرتبہ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ سے چلے گئے تھے وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ بادشاہ موصوف انکو اپنے دربار سے متعلق کرنا اور خطاب ملک الشعرائی دینا چاہتے تھے ناسخ کو یہ امر بہت ناگوار ہوا اور یہ کہکر خطاب واپس کر دیا کہ غازی الدین حیدر کو نہ تو شاہان دہلی کا مرتبہ حاصل ہے اور نہ سرکار انگریز کا سا اقتدار۔ پھر میں ایسا بادشاہ کا خطاب لے کے کیا کروں۔ اس حقارت آمیز جواب سے بادشاہ کو غصہ آیا اور ناسخ کو وطن چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ سے وہ الہ آباد گئے جہاں چندروز قیام کیا۔ یہاں راجہ چندو لال

دیوان سلطنت آصفیہ حیدرآباد دکن نے انکو بارہ ہزار روپیہ بھیجے اور ایک خط لکھا کہ اگر آپ دکن آئیے تو وہاں حسب مراتب آپ کی قدرو منزلت کی جائیگی وطن کی محبت سے انھوں نے اسقدر دور دراز جانے سے انکار کیا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ اور انھوں نے اسی قسم کا پیغام بھیجا تھا جس کے ساتھ پندرہ ہزار روپیہ بھی ارسال کیے تھے غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد وہ لکھنؤ واپس آئے مگر حکیم مہدی کی دشمنی کی وجہ سے جو ان کے سرپرست اور قدردان آغا میر کے دشمن تھے ان کو پھر لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ابکی مرتبہ فیض آباد الہ آباد بنارس کانپور اور پٹنہ میں تھوڑے تھوڑے دن قیام کیا مگر وطن کی محبت کبھی نہ بھولے آخر کار حکیم مہدی کے انتقال کے بعد ۱۲۴۷ھ سنہ میں پھر لکھنؤ واپس آئے۔ جہاں چند سال رہ کر ۱۲۵۴ھ ہجری میں انتقال کیا میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی ؎

	دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے	

تصانیف ان کے تین دیوان ہیں جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔ ایک دیوان الہ آباد کے قیام میں مرتب کیا تھا جس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۲ ہجری ہے اسکا نام دفتر پریشان رکھا اسمیں غزلوں رباعیوں اور تاریخوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں دوسرے اور تیسرے دیوان کا سنہ تالیف علی الترتیب ۱۲۴۳ھ اور ۱۲۵۴ھ[1] ہے ان کے دیوانوں میں جو تاریخیں ہیں وہ اس لیے بہت قابل قدر ہیں کہ ان سے اکثر نامی گرامی شعرا اور دیگر مشاہیر کا سنہ وفات معلوم ہو جاتا ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ناسخ نے کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ان کے کلام میں

---

[1] فقیر مؤلف کے پاس جو نسخہ کلیات ہے اسکے آخر میں یہ عبارت ہے: "الحمد للہ کہ لفرمائش شاہزادہ والا جاہ مرزا فرخندہ بخت بہادر دام اقبالہ کلیات رئیس شعرائے زمان سر دفتر بلغائے آدان در علم و عمل راسخ شیخ امام بخش متخلص بہ ناسخ دیوان اول مسمیٰ "بہ دیوان ناسخ" در متن و دیوان دوم مسمیٰ بہ دفتر پریشان" برحاشیہ و دیوان سوم مسمیٰ بہ دفتر شعر دیم ردیف ملحق بہ دفتر پریشان بتاریخ چہارم جمادی اول ۱۲۶۲ھ در مطبع مولائی واقع بازار راجہ ٹکیٹ رائے منطبع گردید"

قصائد کی جگہ اکثر قطعات نے لی ہے ہجو اور مذاق کا بھی پتہ ان کے یہاں نہیں
ان کی ایک مثنوی بھی ہے جس کا نام "نظم سراج" ہے، جو تاریخی نام ہے۔ اس سے
۱۲۵۸ نکلتے ہیں یعنی اس سال اُن کے شاگرد رشک نے ان کی وفات کے بعد اس کو شائع
کیا تھا۔ ایک مولود شریف بھی شیخ صاحب کی تصنیف ہے مگر یہ دونوں کتابیں مصنف کے
پایہ سے بہت گری ہوئی ہیں۔

ناسخ کا اثر شاعری اور زبان پر | شیخ ناسخ تین چیزوں کے واسطے مشہور ہیں۔ ایک ان کی
قادر الکلامی جو ان کی غزلوں سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے وہ طرز جدید جو انھوں نے
ایجاد کیا تھا۔ تیسرے ایک بڑی جماعت مشہور شاگردوں کی جن کو اپنے بعد وہ چھوڑ
گئے اس میں کوئی شک نہیں کہ ناسخ ایک مسلم الثبوت استاد تھے جن کو زبان اُردو و
فارسی پر قدرت حاصل تھی شعر کی آرائش ظاہری کما حقہٗ کرتے تھے لکھنؤ کے حلقۂ شعراء میں
ان کا بہت بڑا اثر تھا اور اب تک کسی متنازع فیہ ادبی مسئلہ میں مثلاً کسی محاورے
یا لفظ کی صحت کے متعلق ان کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے۔ الفاظ اپنی جگہ پر
خوب صرف کرتے تھے اور ایسے الفاظ جو سودا و میر کے زمانہ کی یادگار رہ گئے
تھے ان سے اجتناب کرتے تھے برخلاف ان کے مصحفی زمانۂ قدیم کے بہت بڑے
متبع تھے۔ ناسخ کے کلام میں یہ نقص ضرور ہے کہ اُنھوں نے الفاظ کی تلاش و
جستجو پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی اور بدنصیبی سے کہیں کہیں ایسے مغلق اور
ادق الفاظ فارسی و عربی داخل کرنا چاہے جو غزل کے شایاں نہیں ہیں اسی وجہ سے

---

[1] آب حیات میں ڈھونڈھ کے ایک تاریخ ان کی نکالی ہے جس سے انکی تفریح طبع اور مذاق کا خیال
معلوم ہوتا ہے میر گھسیٹا نام ایک شخص مر گئے تو شیخ صاحب نے فرمایا ؎

جب میر گھسیٹا مر گئے ہائے — ہر ایک نے اپنے منہ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ سن کے تاریخ — افسوس کہ موت نے گھسیٹا

ان کلام حسن ظاہری سے تو آراستہ ہے مگر دلچسپی اور تاثیر سے خالی ہے۔ یہی حال انگریزی میں پوپ شاعر کا ہے جسمیں کوئی ظاہری سقم تو نہیں مگر درد و اثر مطلق نہیں ہے۔

ناسخ کی غزلیں

ان کی غزلیں شاندار الفاظ اور طرح طرح کی تشبیہات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ مگر جذبات و اثرات سے خالی ہیں۔ تصنع ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے تشبیہیں اکثر نئی تو ہیں مگر عجیب ہوتی ہیں حسن ظاہری بجائے غرض ثانوی کے ان کے یہاں غرض اصلی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ الفاظ کی مناسبت کی بہتات میں شعر کا مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلیں صائب اور مرزا بیدل کے رنگ میں ہوتی ہیں یعنی اول الذکر کی تشبیہات اور آخر الذکر کی نازک خیالیاں کہیں کہیں انمیں پائی جاتی ہیں۔ ناسخ کے چند ایسے اشعار جنمیں عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

غیر کوثر کسی دریا کا میں سیّاح نہیں	بنشۂ شیر خدا بن کہیں سیّاح نہیں
ظلم طولِ شبِ فرقت کے تطاول نے کیا	دادرس کوئی بجز خالق الاصباح نہیں
بیخطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر	دوڑتا تھا جس طرح ثعبان موسیٰؑ مار پر
دیکھو ناسخ سرِ شیخ معمّم کی طرف	کیا کلس سواک کا ہے گنبدِ دستار پر
کیونکر اے ناسخ خوارِ عجل دشمن ہو نہ خوار	کیسے موسیٰ کا علی شیرِ خدا ہارون ہوا

معمولی کلام کا انداز یہ ہے

روئے جاناں کا تصور ہے جو نظّارا ہوا	دل میں تھا جو داغِ حسرت عرش کا تارا ہوا
وہ مہِ خانہ نشیں گلیوں میں آوارا ہوا	اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارا ہوا
محفلِ مے میں جو آیا تو برائے میکشی	تھا جو شیشہ جوش مے سے ایک فوارا ہوا
چشم بد دور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف	سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارا ہوا
قسب ہوا سے ہل گئی جو اسکی زلف عنبریں	زم میں موم شمع سارا عنبر سارا ہوا

پیٹھ پیچھے میرے بد کہنے سے زاہد یہ ملا	پیٹھ پر بار گنہ کا جمع پشتارا ہوا
دُور پھینکا ساقیا لیتے ہی تیرے ہجر میں	ہاتھ میں جام مئے گل رنگ انگارا ہوا
جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا	حوض میں روشن برنگ شمع فوارا ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو
قتل آج اس کی گلی میں ایک بیچارا ہوا

تاریخیں تاریخ گوئی میں ان کو خاص ملکہ تھا - بات بات پر تاریخ کہتے تھے - بعض تاریخیں بہت عمدہ اور دلچسپ ہیں مثلاً کسی نے ان کے خطوط چرائے تو کہا ؎

سیاہ ہمچو قلم باد روئے حاسد من

پھر چار خط جاتے رہے تو کہا ؎

صد حیف تلف چہار نامہ

پیارے شاگرد خواجہ وزیر کا بیاہ ہوا تو فرمایا ؎

شدہ نوشہ وزیر من امروز

جب ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو صبح کا وقت تھا فرمایا ؎

صبح طالع شد بر آمد آفتاب

جب حکیم مہدی معزول ہو کر فرخ آباد گئے تو انھوں نے تاریخ کہی ؎

افتاد حکیم از وزارت	تاریخ بطرز نو رقم کن
از جائے حکیم ہشت برگیر	سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

قصیدہ نہیں کہا | عجب ہے کہ اس صنف خاص میں انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی درحالیکہ اس کی ترتیب میں درد و اثر کی زیادہ ضرورت نہ تھی - بلکہ انکا شوق شکوہ الفاظ کا اس کا ممد و معاون ہوتا ممکن ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ انکی فطری طبیعت کی آزادی نے خوشامد اور چاپلوسی کی اجازت نہ دی ہو - وہ تصوف سے بھی بیگانہ ہیں - ان کے بعض

اشعار جو صوفیانہ کہے جا سکتے ہیں اُن میں بھی انھیں کا رنگ غالب ہے اور حقیقی تصوف کہیں چھو نہیں گیا ہے۔ مزاح و ظرافت کا بھی کہیں ان کے کلام میں ذکر نہیں ان کے ہنسی بنا دٹی ہوتی ہے اور مذاق پھُس پھُسا۔ کہیں کہیں مذہبی حملے اور طعن و تشنیع سے بھی کام لیتے ہیں مگر اس میں کسی قسم کی لطافت اور خوبی نہیں ہوتی بلکہ ان کے مرتبہ سے گری معلوم ہوتی ہے۔

نقائص کلام | کلام میں وہی نقائص ہیں جو عام طور پر انکے ایجاد کردہ طرز میں پائے جاتے ہیں یعنی کسی عمدہ خیال کا ان میں پتہ نہیں۔ ان کے کسی شعر پر پڑھنے والے کا دل نہیں پھڑکتا۔ نہ اس میں کسی قسم کا انعکاس اور باریک نظری ہے۔ اشعار ٹھس اور بے لوچ ہوتے ہیں۔ عام طور پر نقائص کلام یہ ہیں تصنع اور تکلف، فارسی تشبیہات جو اردو کا جامہ پہنکر بدنما ہوگئی ہیں بڑے بڑے فارسی عربی مغلق الفاظ جن کی اردو غزل متحمل نہیں ہوسکتی شعر کی ظاہری آرائش کو مقدم سمجھنا۔ معمولی اور پست خیالات کا بموقع اظہار شاندار الفاظ میں۔ سرقہ کا بھی الزام بھی ان پر لگایا جاتا ہے مگر سچ پوچھیے تو یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔

ناسخ کے کارنامے | ناسخ اپنے تخلص کے اعتبار سے طرز قدیم کے مٹانے والے تھے مگر غور سے دیکھیے تو اس تغیر کا شوق اور خیال لوگوں کے دلوں میں پہلے سے چلا آتا تھا۔ مگر انھوں نے اس کی ابتدا کی اور اپنے کلام میں اس کو برتا۔ مرزا حاجی صاحب اس زمانہ کے ایک متمول اور بارسوخ رئیس تھے جو خود بھی ذی استعداد تھے اور انکی سرکار میں مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق خاں اختر وغیرہ ایسے باکمال لوگ جمع رہتے تھے ناسخ کو خوش نصیبی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہوگئی جہاں ایسے کامل لوگوں کی صحبت میں انکو بھی زبان کی تراش و خراش اور تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہوا اور ان کے دل بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا رفتہ رفتہ طبیعت میں اُمنگ

اور دل میں جوش بڑھ گیا غرضکہ مرزا حاجی کی مہربانی سے انکی شاعری خوب چمکی اور اس کو لکھنؤ میں خوب فروغ حاصل ہوا۔ ناسخ نے جو تغیرات غزل میں کئے ان میں سے بعض یہ ہیں۔ لفظ اردو بجائے ریختہ کے استعمال کیا جو لکھنؤ میں جاری ہو گیا۔ مگر دلی میں عرصہ تک وہی پرانا لفظ قائم رہا۔ ایسی غزلیں کہیں جن کی ردیفیں اکہری۔ مثلاً کا، کو ہے۔ نہیں۔ سے۔ نہیں۔ پر۔ تک وغیرہ ہیں۔ افعال میں بھی تغیر کیا۔ مثلاً آئے ہے۔ جائے ہے کی بجائے آتا ہے۔ جاتا ہے۔ اور آئیاں۔ دکھائیاں وغیرہ ترک کر دیا یہ آخری فرق لکھنؤ اور دلی کی زبان کا بہت متمائز فرق تھا جو ابھی تک کسی قدر باقی ہے۔ نا مہذب اور فحش الفاظ جو بعض قدما کے کلام میں پائے جاتے تھے انھوں نے خارج کر دیئے۔ عربی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اور ہندی لفظوں کو بسا اوقات بے ضرورت خارج کیا۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سخت قواعد مقرر کئے غزل کا دائرہ وسیع کیا الفاظ کا صحیح استعمال مقرر کیا ایک طولانی فہرست اس قسم کے تغیرات کی جو ان کے زمانہ میں عمل میں آئے، تذکرہ جلوۂ خضر اور شعر الہند میں دی ہوئی ہے۔ ناسخ کی تعریف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مقرر کردہ قواعد پر خود بھی سختی سے عمل کیا اور اپنے شاگردوں کو عمل درآمد پر مجبور کیا ان کے انتقال کے بعد انکے شاگرد میر علی اوسط رشک نے ان سب تغیرات کو ایک کتاب کی صورت میں منضبط کیا

شاگرد | ناسخ کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سے چند مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:۔

وزیر۔ برق۔ رشک۔ بحر۔ منیر۔ مہر۔ نادر۔ آباد۔ طاہر۔

برق | فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق، مرزا کاظم علی خان کے بیٹے اور واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے مصاحب خاص اور استاد بھی تھے۔ بادشاہ کے ساتھ ان کو بہت محبت تھی چنانچہ جب بعد انتزاعِ سلطنت بادشاہ کلکتہ گئے تو وہ

بھی ان کے ہمراہ تھے جہاں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ یہ شعر ان کا ان کے حسب حال ہے

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے جان دی آپ کے دروازہ پہ مر کر اُٹھے	

برق شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی مشہور تھے۔ بانک۔ بنوٹ وغیرہ اچھی جانتے اور تلوار خوب لگاتے تھے۔ لکھنؤ میں باعتبار ان کے عالی خاندان اور ذی مرتبہ ہونے کے اور نیز ان کے اخلاق وسیر چشمی کی وجہ سے ان کی بڑی شہرت تھی۔ پرگو شاعر تھے اور اپنے استاد ناسخ کے تبع تھے ان کے کلام میں بھی مثل ان کے استاد کے تکلف اور تصنع بہت ہے مگر زبان پر قدرت اور شعر میں مزہ ہے ایک ضخیم دیوان چھوڑا جس میں مختلف اصناف سخن موجود ہیں ایک شہر آشوب لکھنؤ کی تباہی کا بہت درد انگیز لکھا ہے۔ یہ بھی گو کہ اپنے پرانے رنگ میں ہے مگر اکثر اشعار بہت موثر و درد انگیز ہیں۔ جلال اور سحر ان کے دو مشہور شاگرد تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

اذان دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا		کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا
	ولہ	
قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو		دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو
	ولہ	
نکلا غبار دل سے صفائی تو ہو گئی		اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا
	ولہ	
آتا نہیں قرار دل بیقرار کو		غم میں پھنسا ہوں دام محبت سے چھوٹ کر

بحر | شیخ امداد علی بحر شیخ امام بخش اپنے استاد ناسخ کے ہمنام کے بیٹے تھے عمر بھر پریشانی اور عشرت میں گزری۔ آخر عمر میں نواب کلب علیخاں والی رامپوران کی

سرپرستی فرماتے تھے رامپور ہی میں پچھتر برس کی عمر میں ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ ان کے دیوان کی ترتیب ان کے دوست نواب سید محمد خان رند شاگرد آتش نے کی۔ ان کے کلام میں بھی پیچیدہ تمثیلیں اور دقیق استعارات پائے جاتے ہیں مگر پھر بھی اس قدر تصنع اور الفاظ کی بھرمار نہیں ہے جیسا کہ دیگر شاگردان ناسخ کے یہاں ہے اکثر اشعار بہت صاف اور سلیس اور پُر اثر بھی ہوتے ہیں صحت الفاظ اور تحقیق لغت کے استاد تھے۔ ناسخ اور رشک کے بعد لکھنو کے دور متوسط کے شعراء میں بہت بڑا درجہ رکھتے تھے اور تحقیق الفاظ کے معاملہ میں خاصکر بہت مستند سمجھے جاتے تھے کچھ صاف و سادہ اشعار بطور نمونے کے پیش کئے جاتے ہیں ؎

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا		میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا
	ولہ	
ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ		اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں
	ولہ	
مدت سے التفات مرے حال پر نہیں		کچھ تو کجی ہے دل میں کہ سیدھی نظر نہیں
	ولہ	
افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں		دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں
	ولہ	
کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلبروں نے کی		پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

آباد مرزا مہدی حسن خان متخلص بہ آباد مرزا غلام جعفر کے بیٹے تھے ۱۲۲۸ھ میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔ نوابان فرخ آباد سے سلسلۂ قرابت رکھتے تھے اور لکھنو کے روسا میں شمار کئے جاتے تھے۔ شعر گوئی سے بڑا شوق تھا مقررہ اوقات پر اپنے مکان پر مشاعرہ

کرتے تھے اور دوسرے مشاعروں میں بھی بالالتزام جاتے تھے، پر گو شاعر تھے دو دیوان ایک مثنوی اور تین واسوخت یادگار چھوڑے ہیں جن میں سے ایک دیوان موسوم بہ "نگارستان عشق" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ ان کا ایک مجموعہ "بہارستان سخن" جس میں ناسخ و آتش کی ہم طرح غزلیں جمع کی ہیں بہت مشہور ہے۔ جس سے ان دونوں استادوں کے کلام کے موازنہ کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ آباد کے کلام میں کوئی خاص خصوصیت نہیں، البتہ کہیں کہیں کوئی پھڑکتا ہوا شعر نکل آتا ہے۔

خواجہ وزیر	خواجہ محمد وزیر المتخلص بہ وزیر خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے۔ سلسلہ خاندان

ان کا باپ کی جانب سے حضرت خواجہ بہار الدین نقشبندؒ سے ملتا ہے۔ لکھنؤ میں عالی خاندان ہونے اور نیز اپنے ذاتی تقدس کی وجہ سے بڑی عزت سے بسر کی آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی اور شعر و سخن سے نفرت ہوگئی تھی۔ فتوح اور تسخیر اعمال کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے سو روپیہ ماہوار سے خرچ کم نہ تھا مگر آمدنی کہیں سے کچھ نہ تھی۔ آزادی مزاج کا یہ حال تھا کہ واجد علی شاہ بادشاہ نے دو مرتبہ یاد فرمایا مگر وہ کچھ نہ کچھ عذر کرکے اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ بالآخر ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ منشی اشرف علی شاگرد نسیم دہلوی نے مادہ تاریخ خوب نکالا ہے

	مزہ شعر کا ہائے جاتا رہا	

ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں اور دوستوں نے ان کا کچھ کلام بصورت غزلیات جمع کرکے شائع کیا اور اس کا تاریخی نام "دفتر فصاحت" رکھا جس سے ۱۲۶۳ فصلی مطابق ۱۲۷۱ھ اس کی تاریخ اشاعت نکلتی ہے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سب سے مشہور فقیر محمد خاں گویا ہیں خواجہ وزیر کا رنگ وہی ہے جو ان کے استاد کا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اپنے استاد کے سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ محبوب شاگرد یہی تھے۔ مشکل مشکل طرحوں میں طبع آزمائیاں کی ہیں اور اپنے طرز کے

موافق خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اپنے عہد کے شعرا میں خواجہ وزیر بہت بڑے پائے کے شاعر تھے نمونہ کلام یہ ہے

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہوکر اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے		زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہوکر اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہوکر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو		کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو
	وله	
ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے		فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے
	وله	
نہ کر تحوض مرے جرم و گناہ بیحد پر کہیں عدو نہ کہیں مجھ کو دیکھ کر محتاج		الٰہی تجکو غفور الرحیم کہتے ہیں یہ اُن کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

رشک میر علی اوسط رشک میر سلیمان کے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن فیض آباد تھا مگر ان کی نشو و نما لکھنو میں ہوئی اور یہیں انکی شاعری بھی پروان چڑھی۔ ناسخ کے مشہور شاگرد تھے زیادہ تر انکی شہرت ان کے مبسوط اور جامع لغت موسوم بہ "نفس اللغۃ" پر مبنی ہے جو زبان فارسی میں ہے اور اردو اور ہندی الفاظ و محاورات کی صحت کی تحقیق اس میں کی گئی ہے یہ تاریخی نام ہے جس سے سن تالیف ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے وہ انکی زندگی ہی میں مشہور و مقبول ہو چکی تھی اب اس کا ایک حصہ نشتر کاکوروی نے چھپوا کر دفتر نور اللغات سے شائع کر دیا ہے اس کے علاوہ اُن کے دو دیوان بھی ہیں جن کے علی الترتیب تاریخی نام "نظم مبارک" (۱۲۵۳ھ) اور "نظم گرامی" (۱۲۶۱ھ) ہیں۔ رشک کا بھی رنگ وہی ہے جو اُن کے اُستاد ناسخ کا ہے۔ ان کا کلام بھی بالکل بے مزہ اور سیٹھا پھیکا ہے اور اس زمانے کے عیوب اس میں بھی سب موجود ہیں رشک تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔ اپنے بعد انھوں نے بہت

شاگرد چھوڑے جن میں منیر مشہور ہیں۔ منیر پہلے ناسخ کے شاگرد تھے مگر ان کے بعد رشک سے اصلاح سخن لیتے تھے رشک کچھ دن کانپور اور الہ آباد میں بھی رہے ہیں آخر عمر میں کربلائے معلے چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۸۴ھ میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی، ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور خود اپنے اُستاد کے زمانے میں بھی اسی بات کے لئے مشہور تھے۔ ان کے کلام میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی کا پتہ نہیں۔ معمولی باتیں کہتے ہیں اور بالکل معمولی طریقے سے کہتے ہیں ان کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ جو لفظ جسطرح معمولی بول چال میں بولا جائے اسی طرح وہ نظم بھی کیا جائے مثلاً ہم آپ میں آئیں گے تو وہ آئیں گے آپی (آپ ہی)

دل ہی میں سُراغ در دلدار ملے گا

بہت پر گو تھے مگر کلام رعایت لفظی اور ضلع جگت کی پیچیدگیوں میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ دو چار شعر بھی اچھے مشکل سے ملتے ہیں۔ ان کی ایک طویل غزل ہے جس کا قافیہ "لگاؤ ۔ تاؤ" وغیرہ ہے چونکہ قافیہ مشکل تھا انھوں نے محنت و جانفشانی سے بہت سے ہم قافیہ لفظ جمع کئے تھے نمونے کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں ؎

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں	وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں
پرزوں میں دستخط کروں کیا حال	ایک دو تین چار تاؤ نہیں
گنگ کو بحر غم سے کیا نسبت	یہ وہ دریا ہے جس میں ناؤ نہیں
رکی جاتی ہیں اور نالہ و آہ	اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں
چاول الماس گوشت لخت جگر	فرقت یار میں پلاؤ نہیں
سیر کھانے سے کیوں نمک ہی کباب	یا وہ روٹی ہے نانپاؤ نہیں
ہجر میں کیوں طرح طرح نہ دبائے	بارِ غم پر مرا دباؤ نہیں
یہ زمین غزل وہ ہے اے رشک	جس میں ذرہ کہیں بھراؤ نہیں

اتفاق سے "بلاؤ" کا قافیہ رہ گیا تھا اس کی کمی کسی ظریف نے پوری کر دی اور خود انھیں کی طرف منسوب کر دیا

دور سے جھمپڑے دکھاؤ نہیں
رشک بیٹھا ہے بن بلاؤ نہیں

مہر مرزا حاتم علی بیگ متخلص بہ مہر ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور خاندان اصفہانی کے نونہال تھے۔ اُن کے والد مرزا فیض علی بیگ قزلباش ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں علیگڈھ کے تحصیلدار تھے۔ ان کے دادا مرزا مراد علی خاں بعہد نواب شجاع الدولہ لکھنؤ آئے اور خطاب رکن الدولہ سے سرفراز ہوئے۔ وہ کسی زمانہ میں رائے بریلی کے ناظم تھے۔ والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ ان کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا اور چودہ برس کے سن میں شعر کہنے لگے تھے۔ جب ان کے بھائی مرزا عنایت علی بیگ متخلص بہ ماہ آتش کے شاگرد ہوئے تو خود انھوں نے زانوے شاگردی ناسخ کے سامنے تہ کیا اور کہتے کہتے پختہ کار ہو گئے ۱۸۴۸ء میں سرکاری امتحان پاس کر کے چنارگڈھ ضلع مرزاپور کے منصف ہوے چنانچہ انکا یہ شعر اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے

از بسکہ سوز ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم
منصف چنارگڈھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

وہ عدالت العالیہ ہائی کورٹ کے وکیل بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں انھوں نے چند انگریزوں کو پناہ دی تھی جس کے صلے میں خلعت فاخرہ اور ۲ دو گاؤں جاگیر میں سرکار سے عنایت ہوئے اسکے بعد وہ آگرے گئے جہاں وکالت کرتے تھے اور کچھ دنوں آنریری مجسٹریٹی بھی کی ہے ۱۸۷۹ء میں بمقام ایٹہ انتقال کیا وہاں ان کے بیٹے مرزا سخاوت علی کچھ دنوں تحصیلدار رہے ہیں۔

مہر مذہب امامیہ رکھتے تھے مگر متعصب بالکل نہ تھے اکثر مشہور لوگوں سے دوستی تھی

مثلاً غالبؔ، انیسؔ، دبیرؔ، غلام امام شہیدؔ، صہباؔ، منیرؔ وغیرہ چنانچہ غالبؔ کے اکثر خطوط اُن کے نام اردوے معلیٰ میں موجود ہیں۔ مہاراجہ بلونت سنگھ راجہ بنارس جو اُن دنوں آگرے میں ٹھہرے تھے ان کے شاگرد ہوئے اور پچاس۵۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا

تصانیف | مہرؔ کی اکثر تصانیف زمانۂ غدر میں تلف ہوگئیں مگر کتب ذیل مطبوعہ و غیر مطبوعہ یادگار باقی ہیں

(۱) دیوان اردو موسوم بہ "الماس درخشاں" تاریخی نام "خیالات مہر" ۱۲۸۶ھ اس کو ان کے پوتے مرزا قاسم حسین قزلباش نے شایع کرادیا ہے۔

(۲) "پیرایۂ عروض" ایک مختصر رسالہ فن عروض میں۔

(۳) "ایاغ فرنگستان" ابتدائی عملداری انگریزی کی مختصر تاریخ ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔

(۴) "مثنوی داغ بگار" جو ایک دن میں لکھی تھی

(۵) "داغ دل مہر" واسوخت۔

(۶) "مثنوی شعاع مہر" ۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی جس کی تعریف مرزا غالب نے اپنے خطوط میں بہت کی ہے۔

ان کے علاوہ "شبیہ عشرت" "ضبط انتقام" "ہمدم آخرت" "دربیان بخشائش الٰہیہ قصیدۂ پنجبہ مہر" "توقیر شرف" اور اور نظمیں بھی ان کی طرف منسوب ہیں۔ بہت پر گو تھے مختلف مضامین پر لکھتے تھے اور تاریخ خوب کہتے تھے دوسرے درجہ کے شعرا میں مہر کا مرتبہ بلند ہے۔ ان کے کلام میں سلاست و روانی، تناسب اور زبان پر قدرت ہے بعض اشعار ان کے نہایت صاف و سلیس اور بہت پُر لطف ہوتے ہیں۔

منیرؔ | سید اسمٰعیل حسین متخلص بہ منیرؔ خلف سید احمد حسین شاد شکوہ آباد ضلع مین پوری

کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں عرصے تک رہے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے اردو دیوان "منتخبات عالم" کے شروع میں جو فارسی دیباچہ لکھا ہے اس میں انھوں نے اکثر اپنے واقعات زندگی بیان کئے ہیں۔ پہلے ناسخ سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح سخن لیتے تھے پھر کانپور میں جب وہ نواب نظام الدولہ کی ملازمت میں تھے اور ناسخ وہاں پہونچے تو یہ ان سے ملنے گئے اور شاگرد ہو گئے اور انہی کی ہدایت کے بموجب وہ رشک سے بھی مشورہ کرنے لگے چنانچہ اپنے کلام میں ان دونوں بزرگواروں کا ذکر بہت ادب و احترام سے کرتے ہیں اور ان کی قابلیت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کلکتہ، مرشد آباد، اور الہ آباد میں بھی رہے تھے مگر لکھنو کے عاشقوں میں تھے یہاں کی دلچسپیاں ان کو مجبور کرتی تھیں کہ اپنی مستقل سکونت وہاں اختیار کریں اور شعر و شاعری کے جلسوں میں برابر شریک ہوں۔ اس شوق کا ذکر ان کے کلام میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ وہ کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ضرور آتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ یہاں ظفر الدولہ نواب علی اصغر خاں کے ملازم بھی ہو گئے مگر تھوڑے دنوں کے بعد پھر کانپور واپس جانا پڑا جہاں تھوڑے دن رہنے پائے تھے کہ لکھنو کی کشش نے پھر زور کیا اور اب کی مرتبہ نواب سید محمد ذکی متخلص بہ ذکی کے سلسلۂ رفقا میں داخل ہوئے اور ان کے کلام کو اصلاح بھی دینے لگے لکھنؤ میں دو سال قیام کر کے نواب تجمل حسین خاں کی فرمائش سے فرخ آباد گئے جہاں نواب موصوف کی حین حیات قیام کیا۔ اسی عرصہ میں مہاراجگان دھولپور اور الور نے بھی ان کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا مگر انھوں نے باندے میں ملازمت کر لی جہاں نواب علی بہادر والی ریاست کے استاد مقرر ہو گئے۔ بعد غدر ایک رنڈی مسماۃ نواب جان کے قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی مگر سنہ ۱۸۶۰ء میں قید سے رہائی پائی۔ بالآخر بعہد نواب کلب علی خاں رامپور میں قیام کیا اور یہیں کی خاک میں سنہ ۱۸۸۱ء میں آرام کیا۔

تصانیف | تین دیوان یادگار چھوڑے ہیں (۱) "منتخبات عالم" (۲) تنویر الاشعار (۳) نظم منیر۔ مثنوی معراج المضامین" جس میں ائمۂ معصومین کے کشف وکرامات بیان کئے ہیں انھیں کی تصنیف ہے۔ بہت پُرگو شاعر تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے مرثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ قصیدے بڑے روز دار کہتے تھے اور قطعہ، رباعی، مخمس وغیرہ میں بھی بہت زور طبیعت دکھاتے تھے ان کا رنگ ان کے استاد۔ ناسخ اور رشک کا سمجھنا چاہیئے۔ اکثر اشعار میں بلند پروازی اور عمدہ تخئیل ہے۔ قطعات بہت صاف سادہ اور سلیس ہیں، غزلوں میں پورا لکھنؤ کا رنگ ہے مختصر یہ کہ منیر کا مرتبہ اس زمانہ کے شعرا میں بہت بلند ہے۔

آتش متوفی ۱۲۶۳ھ ہجری خواجہ حیدر علی آتش خلف خواجہ علی بخش دلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی چھوڑکر فیض آباد آئے اور محلہ مغلپورہ میں سکونت اختیار کی۔ آتش کی ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ یہ بہت صغیر سن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اسی وجہ سے تعلیم سے بھی محروم رہے اور اور بُری صحبت میں بیٹھ کر مزاج میں شوریدہ سری اور بانک پن آگیا نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی کی ملازمت اختیار کر لی اور انھیں کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ یہاں اس زمانہ میں مصحفی اور انشا کے زور دار مقابلے ہورہے تھے اسی کو دیکھکر ان کو بھی شعر وسخن کا شوق پیدا ہوا۔ مصحفی کے شاگر ہوگئے اور چند روز کی محنت میں ایسی مشق بہم پہونچائی کہ خود صاحب طرز ہوگئے۔ ناسخ اور انشا کی طرح انکی استعداد علمی درجہ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی البتہ درسی کتابیں دیکھی تھیں اور ایک رسالہ فن عروض کا عربی میں پڑھا تھا۔

ناسخ اور آتش کی طرز زندگی میں بھی مثل ان کے کلام کے بین فرق تھا۔ آتش نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے جس میں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہ تھا وہ حسن کے

عاشق تھے اور آزاد مزاج واقع ہوئے تھے۔ سپاہیانہ وضع اور لباس رکھتے تھے مگر اس میں بھی بانکپن کو دخل تھا۔ تلوار باندھتے تھے اور مشاعروں تک میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ قناعت اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کی کبھی کسی امیر کی اس کی دولت کی وجہ سے خوشامد نہیں کی۔ شاگرد کبھی کبھی خود سلوک کرتے تھے مگر ان کا دست سوال کسی کے سامنے دراز نہیں ہوا۔ اسّی روپیہ مہینہ بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا۔ جس سے بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ اور کبھی کبھی کوئی شاگرد بھی اعانت کرتا تو کوئی انکار نہ تھا محلہ سعالیخاں کی سرائے، میں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جس میں غریبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مزاج میں انتہا درجہ کی وضعداری اور خود داری تھی۔ امراء سے بہت نوک کی لیتے تھے۔ مگر معمولاً بہت منکسر المزاج اور خلیق واقع ہوئے تھے آخر میں ان سے اور انکے استاد مصحفی سے کچھ بگاڑ ہو گیا تھا اصلاح لینا بند کر دی تھی اور آپ اپنی غزلوں پر ایک گہری نظر اصلاحی ڈالتے تھے۔ ناسخ کے معاصر تھے۔ لکھنؤ اس عہد میں دو فرقوں پر منقسم تھا۔ ایک جانبداران ناسخ دوسرا طرفداران آتش اس آپس کے مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ دونوں استادان سخن مقابلہ کے خیال سے طبیعت پر بہت زور دے کر کہتے تھے۔ البتہ ایک لطیف پیرایہ میں ایک دوسرے سے نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ مگر انشا اور مصحفی کی طرح دائرہ تہذیب سے باہر نہ ہوتے تھے۔ اس قسم کے دو چار شعر نمونتاً لکھے جاتے ہیں:-

ناسخ سے

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب	بو مسیلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب

اس پر آتش نے یہ کہا

آتش سے

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیواں کا جواب	جس نے دیواں اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

آتش نے ایک مرتبہ کہا سے

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں		ہمارے گنجفہ میں بازیِ غلام نہیں

ناسخ کی طرف سے جواب دیا گیا

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں		ہزار بار جو یوسفؑ بکے غلام نہیں

مگر باوجود اس کے آتش اپنے حریف ناسخ کا بہت احترام کرتے تھے چنانچہ مشہور ہے کہ ناسخ کی وفات کے بعد انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ آتش نے ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ کہی ؎

خواجہ حیدر علی اے وا مردند

طرز کلام | کلام میں اُن کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے۔ تصنع اور تکلف مطلق نہیں۔ نہ معمولی اور مبتذل خیالات ہیں جن کا عیب شکوہ الفاظ سے چھپایا گیا ہو نہ بیجا اور فضول تمثیلوں سے شعر بے مزہ کئے گئے ہیں۔ ترشے ہوئے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر اشعار میں روانی، موسیقیت کی حد تک پہونچ گئی ہے محاورات ایسے برمحل استعمال کئے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں تیز انعکاس اور میر کی طرح درد و اثر کی تڑپ نہیں ہے پھر بھی ان کے بعض اشعار پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔ بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ جذبات کو نہایت موثر اور دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ فوق البھڑک الفاظ ان کے یہاں بہت کم ہیں۔ زبان بہت مزیدار اور روز مرہ کی بول چال ہے جس میں ابتذال نہیں ہے شعر باسانی سمجھ میں آتے ہیں اور بہت لطف دیتے ہیں۔ محاورات بہت منتخب اور برمحل ہوتے ہیں۔ تلاش الفاظ بہت قابل تعریف ہے۔ خیالات میں بلندی ہے اگرچہ غالب کی ایسی نہیں اور عموماً فواحش سے پاک وصاف ہیں۔

تصانیف | پہلا دیوان خود انھیں کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا اور نہایت مقبول ہوا تھا۔ دوسرا دیوان جسے پہلے دیوان کا ضمیمہ سمجھنا چاہیئے ان کے عزیز شاگرد میر دوست علی خلیل نے ان کے مرنے کے بعد مرتب کر کے پہلے دیوان میں شامل کر دیا انھوں نے سواے غزل کے اور کسی صنف شعر میں طبع آزمائی نہیں کی۔

نقائص کلام بعض کوتاہ نظر لوگ ان کے کلام میں یہ سقم نکالتے ہیں کہ ان کے یہاں فقط باتیں ہی باتیں ہیں۔ کلام میں پختگی اور اشعار میں مضامین عالی نہیں اور اس سے نتیجہ انکی بے استعدادی کا نکالتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حقیقی شاعری علم و فضل پر مبنی نہیں ہی گو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کم علمی کی وجہ سے وہ اکثر الفاظ غلط استعمال کرتے تھے مثلاً المضاف بجاے المضاعف، حلوۂ بید و د بجاے حلوائے بید و د کفارا بجاے کفارہ بتشدید فا، مطالع بجاے مطالعہ وغیرہ۔ اس کے جواب میں ان کی طرف سے یہ عذر پیش ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تلفظ مروجہ کے موافق ان الفاظ کو استعمال کیا اور لغوی صحت کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور بہت اچھا ہوا کہ انھوں نے زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا کیونکہ اسی چھان بین نے زبان کو سخت اور بے لوچ کر دیا اور اجنبی غیر ملکی الفاظ کی بھر مار کر دی۔

ناسخ اور آتش کا مقابلہ | دونوں اُردو کے کامل استاد اور صاحب طرز تھے اب اس زمانے میں ناسخ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لوگ اس کو پسند نہیں کرتے البتہ جب وہ اپنے عروج پر تھا تو اس کی بڑی قدر تھی اور وہ بہت مقبول تھا نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرۂ بیخار میں ناسخ کو آتش پر ترجیح دیتے ہیں اور شیخ صاحب ہی کے کلام کو

ل نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرۂ گلشن بیخار میں آتش کے حال میں جو انکا اور ناسخ کا مقابلہ کیا ہے وہ عجب گول گول الفاظ میں ہے جس سے کسی کی کمتری یا کسی کی برتری صاف طور پر نہیں ثابت ہوتی۔ فرماتے ہیں "مردم آن دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذۂ مسلم آنجاست (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر غالب اپنے ایک خط میں آتش کو فوقیت دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ انکا کلام بہت مؤثر ہے حق یہ ہے کہ بندش کی چستی، الفاظ کی حلاوت اور مضمون کی بلندی میں آتش کو ناسخ پر یقیناً فوقیت حاصل ہے آتش کے یہاں الفاظ نہایت شیریں اور مزیدار ہوتے ہیں۔ بخلاف ناسخ کے کہ ان کو موٹے موٹے الفاظ کا شوق ہے۔ آتش کے اشعار نیچرل ہوتے ہیں ان میں بے تکلفی اور تڑپ ناسخ کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے آتش کے خیالات بہت رفیع ہیں اور انکا کیریکٹر آزادانہ اور فقیرانہ ہے جس کی ناسخ کے یہاں کمی ہے۔ صوفیانہ مضامین بہ نسبت ناسخ کے آتش کے یہاں بہت زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ ناسخ کے کلام میں صرف شکوہ الفاظ اور استعارات اور تشبیہیں ہیں اور جو مزہ اور حلاوت کہ آتش کے یہاں ہے اس میں مطلق نہیں ہے

قریب ہم انگارند دہر دو را ہموزن شمارند و قباحت ایں تحقیق لایخفی علی من لہ حظ من الفہم "اگر ناسخ کو وہ فوقیت دیتے تو یقیناً ان کے کلام کو بھی وہ ضرور پسند کرتے اور اس کے دیکھنے کا اشتیاق ان کو ضرور ہوتا مگر تعجب ہے کہ اسی تذکرہ میں ناسخ کے حال میں لکھتے ہیں "دیوانے دیگر از افکار دکاوش فراہم آمدہ دہم در شہر رسید اما خاطر آسودگی جو از انتخاب آن بایتاد" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرا دیوان دیکھنے کو نواب صاحب کا جی نہیں چاہا پھر کیونکر بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناسخ کو آتش پر فوقیت دیتے تھے

لہ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو چودھری عبدالغفور کے نام ہے یہ قطعہ نقل کیا ہے ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار	زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں	خمارِ چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم	ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اس کے بعد اس "چیزے دگر" کی مثال میں میر تقی میر، سودا، مومن، اور قائم کا ایک ایک شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ ناسخ کے یہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیر نشتر ہیں "

زبان کی صحت اور صفائی دونوں کے یہاں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر ترجیح ہے

شاگرد | آتش کے مشہور شاگرد حسب ذیل تھے۔ رند، صبا، خلیل، نسیم، نواب مرزا شوق اور آغا حجو شرف۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے	میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں	اس بت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا
بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا	جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا
قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری	خط دیا لیکن نہ بتلایا نشانِ کوئے دوست
اُس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر نبھے	دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوی دوست
مشتاق درد عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے	کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ
کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں	در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس
رخسار زرد پر مرے بہتے ہیں اشک خوں	یکجا دکھا رہے ہیں خزاں و بہار رنگ
یہ کیفیت اُسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں	مئے اُلفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں
پر کترتا ہے مرے صیاد تو کاٹ اس طرح	حسرتِ پرواز بھی اُڑ جائے بال و پر کے ساتھ
باغ میں آئے ہو ساتھ انکے بھی پھر لو دو گام	کبک و طاؤس کا جھگڑا ہی چکاتے نہ چلا
ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر	ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے
پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا	زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے	زمیں سے دب گئے دبتے جو آسماں سے نہ تھے
شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ	قناعت بھی بہار بے خزاں ہے
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے	ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
نقش پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آرہی	دو قدم میں راہ طے ہے شوق منزل چاہئے

افسوس ہے فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھی	سر پھوڑ کے مرجایئے اس کو ہلنی سے

رند | نواب سید محمد خاں متخلص بہ رند سراج الدولہ نواب غیاث محمد خاں کے بیٹے تھے ۱۲۱۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ چونکہ نواب وزیر کے خاندان سے قریبی تعلق تھا (انکے والد نواب برہان الملک سعادت خاں کے حقیقی بھانجے تھے) اس واسطے بہو بیگم صاحبہ کے دامن تربیت میں ناز و نعمت سے پرورش پائی جب تک فیض آباد میں رہے اپنا کلام میر مستحسن خلیق کو دکھاتے اور وفا تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۴۱ھ میں لکھنو چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ لکھنؤ آکر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔ اور اب رند تخلص رکھا۔ پہلا دیوان جو گلدستہ عشق" کے نام سے مشہور ہے ۱۲۵۰ھ میں مرتب ہوا۔ دوسرا دیوان ان کی وفات کے بعد شایع ہوا۔ تخلص کی مناسبت سے رندانہ زندگی بسر کرتے تھے اور دربار اودھ کی مشہور عیش و عشرت اور مزہ داریوں کا پورا لطف اٹھاتے تھے۔ اپنے استاد آتش کے مرنے کے بعد شراب چھوڑ دی تھی اور منہیات سے تائب ہوگئے تھے۔ اسی عرصہ میں بارادۂ حج روانہ ہوے مگر راستہ میں بمقام بمبئی عین غدر شروع ہونے سے کچھ دنوں پہلے سفر آخرت اختیار کیا۔ کلام ان کا نہایت صاف اور سادہ ہے جس میں محاورات کی برجستگی اور تاثیر کا رنگ جھلکتا ہے۔ بلند پروازی اور خیال آفرینی ان کے یہاں کم ہے مگر مذاق شعر بہت سلیم ہے اور ان کے اشعار مہذب کانوں پر ناگوار نہیں ہوتے کچھ ایسے بھی اشعار پائے جاتے ہیں جن میں روحانیت اور تصوف کی جھلک ہے غرضکہ آتش کے شاگردوں میں انکا بہت بڑا درجہ ہے نمونہ کلام یہ ہے:-

دید لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور	میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشہ تیرا

ولہ

پھینکدینگے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا	تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

	ولہ	
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں		تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

مقابلہ کرو:۔

بنال بلبل اگر بامنت سر یاریست	کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست (حافظ)
اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم	تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے (سعدی)
او دل ہدف تیر نگہ پھر کیا تو نے	لگے ہی مرے زخم جگر تھے ابھی آلے

	ولہ	
دو چار گام یاں سے ہے دولتسرا اے دوست		ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آکر کہاں تھکے

قطعہ

بس اب آپ تشریف لیجائیے	گزرنی ہے جو کچھ گزر جائے گی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز	ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

خلیل اسیر دوست علی تخلص بہ خلیل سید جمال علی کے صاحبزادہ تھے اور بدولی ملک اودھ کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی آتش کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔ سنہ ۱۲۷۹ھ میں نواب نادر مرزا کی رفاقت میں کلکتہ گئے ان کے کلام میں ناہمواری ہے بعض اشعار نہایت عمدہ اور بلند اور بعض بالکل معمولی ہیں۔ ان کو بھی غیر مانوس الفاظ اور رعایت لفظی کا بہت شوق ہے شعر عاشقانہ ہوتے ہیں مگر وہی عشق مجازی اور بعض جگہ ابتذال پایا جاتا ہے۔

نسیم پنڈت دیا شنکر کول تخلص بہ نسیم خلف پنڈت گنگا پرشاد کول آتش کے شاگرد اور مثنوی گلزار نسیم کے مشہور مصنف ہیں۔ پنڈت جی عموماً اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں۔ ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے سنہ ۱۲۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور عین جوانی کی حالت میں سنہ ۱۲۶۰ھ میں بعمر ۳۲ سال انتقال کیا

فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور بعہد امجد علیشاہ بادشاہ اودھ فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر مامور تھے بچپن ہی سے ان کو شعر وسخن سے شوق تھا چنانچہ اکثر اساتذہ اردو وفارسی کا کلام بخوبی پڑھا تھا بعمر ۲۰ سال آتش کے شاگرد ہوئے۔ ان کی زندۂ جاوید تصنیف مثنوی گلزار نسیم مثنوی میر حسن کے جواب میں ہے مشہور ہے کہ پہلے یہ بہت ضخیم تھی مگر استاد کے کہنے سے انھوں نے اس کو مختصر کر دیا۔ اور اب یہ اختصار کی ایک لاجواب مثال ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ اور سنہ اشاعت ۱۲۶۰ھ ہے اس وقت مصنف زندہ تھے اور اس کی اشاعت سے دفعتاً ان کی شہرت ہو گئی۔ اس کا ایجاز روانی۔ مناسبت الفاظ برجستگی محاورات نادر تشبیہات و استعارات۔ یہ سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ تصنع ضرور ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی حقیقی دلآویزی اور تاثیر میں کمی ہے۔ فن کے لحاظ اور تخیل کے اعتبار سے یہ ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے مثنوی سحر البیان سے اس کا مقابلہ ایک فضول سی بات ہے کیونکہ دونوں کا طرز جدا ہے یہ مثنوی اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ اس سے پنڈت دیا شنکر کا نام ہمیشہ کے لئے روشن ہے اور وہ اردو کے ایک مایۂ ناز شاعر کہلائے جانے کے قرار واقعی مستحق ہیں۔

صبا میر وزیر علی نام۔ میر بندہ علی کے بیٹے تھے لکھنؤ وطن تھا۔ یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا نشو ونما ہوا۔ ان کے چچا میر اشرف علی نے ان کو بیٹا بنایا تھا اور انھوں ہی نے ان کو بقدر ضرورت عربی اور فارسی کی تعلیم دی تھی۔ صبا بہت خلیق اور ملنسار اور بڑے یار باش آدمی تھے ان کے دوست احباب ہر وقت ان کے پاس رہتے تھے اور ان کی خاطر تواضع یہ دل کھول کر کرتے تھے۔ دو سو روپیہ واجد علی شاہ کی سرکار سے اور تیس روپیہ ماہوار نواب محسن الدولہ کے یہاں سے ملتے تھے خود آتش کے مشہور شاگرد تھے اور اپنے بھی بعض مشہور شاگرد چھوڑے۔ ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے

گر کر جان دی - ان کا ایک ضخیم دیوان عاشقانہ رنگ میں شائع ہو گیا ہے جس کا نام غنچۂ آرزو ہے - ایک مثنوی "شکارنامہ واجد علی شاہ" بھی انکی یادگار ہے - ان کے کلام میں تصنع اور آورد اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے کبھی کبھی کوئی تڑپتا ہوا شعر اپنے استاد آتش کے رنگ کا بھی کہہ جاتے ہیں -

آغا حجو شرف	میر سادات حسین خاں نام عرف آغا حجو واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے

سمدھی یعنی مرزا حامد علی کوکب ولیعہد کے خسر تھے غدر کے بعد اودھ کے مصیبت زدہ قافلہ کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے اور مٹیا برج میں ولیعہد کے ہمراہ تھے اتفاق سے ولیعہد کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا جس سے ان کو سخت صدمہ ہوا جو کلام سے ظاہر ہو رہا ہے انکا طرز کلام وہی ہے جو لکھنو اسکول کے شعرا کا ہے یعنی زبان نہایت صاف و سلیس - بندشیں اور ترکیبیں دلچسپ - البتہ مضمون آفرینی کی کمی ہے - فارسی اور عربی الفاظ ان کے کلام میں بہت کم ہیں نمونہ کلام یہ ہے -

جہاں میں حسن پرستوں کی جاں لینے کو ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ زباں جو اُن کی شرف نشہ میں بہکتی ہے		نکھر نکھر کے نکلتے ہیں خوبرو کیا کیا چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا مزے مزے کی وہ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا
پھڑک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا		قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا
شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی		پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا
رما کے دھونی جو بیٹھا ہوں مانگ پر اسکی		اسی لکیر کا مجھ کو فقیر ہونا تھا

اس دور میں زبان میں کیا تغیرات ہوئے	تذکرۂ جلوۂ خضر اور شعر الہند میں ایک مختصر فہرست ان تغیرات کی دی ہے - جو ناسخ اور آتش اور نیز اُن کے شاگردوں کے عہد میں

نظم اُردو میں وقوع میں آئے وہ تغیرات یہ ہیں - غیر مانوس اور موٹے موٹے فارسی اور عربی

الفاظ اور ترکیبوں کی کمی - اکثر ہندی الفاظ جو ترک کر دیئے گئے تھے ان کا پھر داخل شعر کیا جانا صرف ان محاورات کا استعمال جو حسن شعر کو بڑھائیں اور برمحل ہوں، معشوق کا خط و خال گل و بلبل سرو و قمری وغیرہ کے رواج اور دور از کار تشبیہات و استعارات اور فضول مبالغوں کی کمی

باب ۹

دربار لکھنؤ اور اس کے شعرا

واجد علی شاہ اختر کا عہد

جس طرح دلی اردو شاعری کا گہوارہ تھا - اسی طرح اس کے زوال کے بعد لکھنؤ اس کا مسکن و مامن بن گیا اس وجہ سے کہ دلی کے سب پرانے استاد مثل آرزو اور میر و سودا و سوز وغیرہ نے اپنا وطن چھوڑ کر اور فرمانروایان اودھ کی داد و دہش اور جود و سخا کے افسانے سن کر لکھنؤ چلے آئے - شاہانِ اودھ نے بادشاہان دہلی کے تتبع میں نہ صرف بڑے بڑے شاعر اپنے دربار میں جمع کئے تھے بلکہ خود بھی شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے - چنانچہ فرمانروایان ذیل جن کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے سب شاعر تھے -

آصف الدولہ آصف | نواب آصف الدولہ متخلص بہ آصف شعر و سخن کے بڑے قدردان و مربی تھے جن کی سخاوت اب تک ضرب المثل ہے نواب یحییٰ خاں نام مرزا امانی عرف آصف تخلص تھا - نواب شجاع الدولہ بہادر کے فرزند دلبند اور جانشین تھے ۲۷ برس کی عمر میں بمقام فیض آباد ۱۱۸۸ھ میں مسند نشین ہوئے - تاریخ جلوس یہ ہے ؎

واجد علی شاہ اختر

نواب آصف الدولہ بہادر شاہ اودھ

گشت از پائے آصف الدولہ		رونق مسندِ وزارتِ ہند	

(اس میں ۵ کے تعمیہ سے جو لفظ آصف الدولہ کی آخری ہ عدد ہیں ۱۱۸۹ھ نکلتے ہیں) جب لکھنو دارالسلطنت ہوا تو انھوں نے مشہور محل اور عمارتیں یہاں تعمیر کرائیں جو اب تک ان کی یادگار موجود ہیں ان کو فن تعمیر کا بہت شوق تھا۔ ان کے عہد میں انگریزوں کی آمد اودھ میں زیادہ ہوئی اور ان کا رسوخ بڑھتا گیا کئی انگریز اجارہ داری نوکری و تجارت کے سلسلہ میں اودھ میں آئے ریزیڈنسی کے خرچ کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی تھی۔ اس دربار میں ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے ملے تھے۔ راجہ نول رائے صفدر جنگ کے دیوان تھے راجہ بینی بہادر شجاع الدولہ کے مشیر تھے اور آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ٹکیت رائے۔ مہاراجہ جھاؤلال اور خوشحال رائے پسر راجہ نول رائے جلیل القدر عہدوں پر ممتاز ہوئے۔ شعر و شاعری اور جملہ علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور اپنا کلام میر سوز کو برائے اصلاح دکھاتے تھے نواب موصوف کے کلام میں اپنے استاد کی سی سادگی اور صفائی ہے اور تصنع اور تکلف جو ناسخ کے زمانہ میں وبال جان ہوگیا ان کے یہاں نہیں ہے ایک اُردو دیوان ان سے یادگار ہے جس میں تقریباً ۳۰۰ صفحات میں غزلیں ۱۷۰ صفحات میں رباعیاں اور مخمس اور ۱۰۰ صفحات میں ایک مثنوی ہے۔ انھیں کے مبارک عہد میں ملک الشعرا میرزا رفیع سودا اور خدائے سخن میر اور میر سوز وغیرہ دلی سے لکھنو آئے اور انھیں کی سرکار دولتمدار کے مداح اور وظیفہ خوار رہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں	وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں	خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں
گزرتے ہیں سو سو خیال اپنے دل میں	کسی کا جو نقشِ قدم دیکھتے ہیں
بتوں کی گلی میں شب و روز آصف	تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

نواب وزیر علی خان المتخلص بہ وزیر وزیری	آصف الدولہ کے بعد ۱۷۹۷ء میں ان کے بیٹے وزیر علی مسند وزارت پر بیٹھے۔ مگر چار ہی مہینے کے بعد ان کو انگریزوں نے معزول

کر دیا کہا یہ گیا کہ وہ نواب آصف الدولہ کے صلب سے نہیں ہیں ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ وزیر علی کے مزاج میں سرکشی تھی۔ معزولی کے بعد وہ بنارس بھیجے گئے جہاں غصہ میں انھوں نے مسٹر چیری رزیڈنٹ کو مار ڈالا اور سرکشی و بغاوت شروع کر دی آخر کار جے پور میں جہاں کہ انھوں نے پناہ لی تھی گرفتار ہو کر انگریزوں کے حوالے کئے گئے پھر وہ سرکاری حکم سے قلعۂ فورٹ ولیم میں قید کئے گئے۔ وزیر علی شعر کہتے تھے اور وزیر تخلص کرتے تھے ایک غزل کے چند اشعار جو مصیبت کی حالت میں لکھے تھے درج کیے جاتے ہیں

جوں سبزہ رُندے اُگتے ہی پیروں کے تلے ہم	اس گردش افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں	بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے	نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم
زندانِ مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں	رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم

نواب سعادت علی خاں	نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی نواب سعادت علی خاں

مسند وزارت پر متمکن ہوئے۔ اُن کے عہد میں انگریزی گورنمنٹ سے ایک عہدنامہ کیا گیا جس سے انگریزوں کا رسوخ بڑھ گیا۔ ان کا دو تہائی ملک ان کے قبضہ سے نکل کر انگریزی علاقہ میں شامل ہو گیا۔ چونکہ ملک میں ہر طرف امن و امان تھا بادشاہ کو عیش و عشرت کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ یہ بھی مثل اپنے بڑے بھائی آصف الدولہ کے علوم و فنون کے بڑے قدرداں تھے اور خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے گو کہ انکا کوئی کلام نہیں ملتا مصحفی اور انشا کے مشہور معرکے انھیں کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ سید انشا سعادت علی خاں کے دربار کے شاعر تھے اور جان بیلی انگریزوں کی طرف سے رزیڈنٹ۔

غازی الدین حیدر	نواب سعادت علی خاں کے ان کے بیٹے غازی الدین حیدر

سند وزارت پر ۱۸۱۴ء میں جلوہ افروز ہوئے اور پانچ برس بعد بعہد نواب گورنر جنرل بہادر لارڈ ہیسٹنگز نواب وزیر سے بادشاہ کہلائے جانے لگے چنانچہ جب ۱۸۱۹ء میں انکی تخت نشینی ہوئی تو اس قدر ساز و سامان اور تکلف اس تقریب میں کیا گیا کہ زر و جواہر بکثرت لٹائے گئے۔ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

بگو ناسخ کہ ظلِ اللہ گردید

غازی الدین حیدر اردو شعر کہہ لیتے تھے مگر اُن کا کلام جو زیادہ تر منقبت اور مرثیہ کی صورت میں ہے اس قدر روکھا پھیکا اور بےمزہ ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر کا قول انکے متعلق سچ معلوم ہوتا ہے کہ "ان کے اشعار اس درجہ ہیں کہ واقعی بادشاہ کا کلام معلوم ہوتے ہیں"

نصیر الدین حیدر غازی الدین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت سلطنت پر بیٹھے ان کا زمانۂ سلطنت ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک ہے۔ سند نشینی کی تاریخ ہے

جاوداں سلطنت ہند مبارک باشد

جس سے بارہ سو تینتالیس نکلتے ہیں۔ یہ بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے ائمۂ معصومینؑ کی شان میں اکثر کہا کرتے تھے۔ اور بادشاہ تخلص کرتے تھے چنانچہ اُن کی یہ غزل مشہور ہے

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے
کہ ساقی لئے ساغرِ مشک بو ہے

سمایا ہے جب سے تو نظروں میں میری
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

جتاؤں میں کیا اپنا حال پریشاں
عیاں زلفِ دلدار سے مو بمو ہے

چلو قبر فرہاد پر فاتحہ کو
مگر آبِ شیریں سے لازم وضو ہے

شفق بن کے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر
یہ کس کشتۂ بے گنہ کا لہو ہے

گلستاں میں جاکر ہر اک گل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

رہے سایۂ پنجتن بادشہ پر
خداوند عالم نگہبان تو ہے

نصیر الدین حیدر کے بعد ان کے حقیقی چچا محمد علی شاہ ۱۸۳۷ء لغایت ۱۸۴۲ء اور پھر ان کے بیٹے امجد علی شاہ ۱۸۴۲ء لغایت ۱۸۴۷ء تخت نشین ہوئے۔ یہ بھی علوم و فنون کے مربی اور شعر و سخن کے قدر دان تھے اور ان کے زمانہ میں بھی شعراء انعام اکرام اور وظائف اور مناصب سے سرفراز ہوتے تھے ان کے بعد واجد علی شاہ کا زمانہ آیا جو کسی قدر تفصیل طلب ہے لہذا علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

اختر یہ تخلص سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کا ہے بعد وفات امجد علی شاہ ان کے بیٹے سلطان عالم واجد علی شاہ بعمر ۲۰ سال ۱۸۴۷ء میں سریر آرائے سلطنت ہوئے ؎ مبارکباد ہو شاہانہ تاج ۱۲۶۳ھ تاریخ جلوس ہوئی۔ سلطان عالم کو فن تعمیر سے بیحد شوق تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی تعمیر قیصر باغ کا خیال پیدا ہوا اس کو عمارات و ایوان دلکشا۔ بارہ دری۔ نہر و پل سنگ مرمر و تصاویر سنگی سے مزین کیا۔ مشہور ہے کہ دو کروڑ روپیہ اس عمارت میں صرف ہوا یہاں ہر برسات میں ایک خاص میلہ ہوتا تھا جس کے تکلفات اور شان و شوکت بڈھے لوگوں کی زبانی اب تک سنے جاتے ہیں۔ سلطان عالم کو شروع میں چند روز انتظام مملکت کا شوق اور عدالت و رعایا پروری کا ذوق رہا مگر نالائق مصاحبوں اور بدخواہ ہم نشینوں نے رفتہ رفتہ مزاج کو بدل دیا اور عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اب بجز محفل رقص و سرود اور کوئی مشغلہ باقی نہ رہا مثنوی غزالہ و ماہ پیکر کی تصنیف سے جلسہ رہس کی بنیاد پڑی۔ صدہا خوبصورت اور خوش گلو طوائفیں ملازم ہوگئیں جو محفل شاہی کو اپنے پر اثر نغموں سے محظوظ کیا کرتی تھیں غرضکہ اسی عیش و عشرت اور ناچ رنگ کی بدولت ملک میں انتہا درجہ کی بدنظمی پھیل گئی جس کی وجہ سے سلطنت انگریزی کو بار بار فہمائش کرنا پڑی۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر کار ۱۳ جنوری ۱۸۵۶ء کو انتزاع سلطنت کا حکم سنایا گیا اور ایک ہفتہ کے اندر یہ عظیم الشان ملک جس کی آمدنی

دو کروڑ سالانہ سے کم نہ تھی بادشاہ کے قبضہ سے نکل کر حکومت انگریزی میں شامل ہوگیا سلطانِ عالم معزولی کے بعد کلکتہ بھیجد یئے گئے اور یہ شعر کہتے ہوئے کلکتہ چلے گئے ؂

در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہیں	رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

جہاں تقریباً ڈیڑھ دو سال قلعۂ فورٹ ولیم میں نظر بند کئے جانے کے بعد محلہ مٹیا برج میں قیام اختیار کیا۔ چونکہ سلطان عالم کو ہمیشہ سے فن تعمیر سے دلچسپی تھی یہاں بھی انھوں نے عالیشان کوٹھیاں اور پر فضا باغات بنوانا شروع کئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں مٹیا برج لکھنو کا ایک مختصر نمونہ بن گیا۔ سلطان عالم نے جو سفر لکھنؤ سے کلکتہ تک کیا تھا اس کا مختصر حال اپنی ایک مثنوی میں جس کا نام "حزن اختری" ہے قلمبند کیا ہے۔

سلطان عالم کو مختلف چیزوں سے شوق تھا مگر ہر بات میں نفاست اور جدت طرازی ملحوظ رہتی تھی۔ جانوروں اور مختلف اقسام کی چڑیوں سے اتنا شوق تھا کہ انکا کلکتہ کا چڑیا خانہ دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے فن موسیقی اور علی الخصوص ٹلچنے اور بتانے کے لطیف فن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اسی طرح شعر و سخن کے بھی بیحد دلدادہ تھے اور بڑے بڑے کامل استاد اس فن کے اپنے دربار میں جمع کر لئے تھے۔ اگر سچ پوچھیے تو انھیں شوقوں کی زیادتی نے یہ روز بد دکھایا علاوہ اردو کے ٹھیٹ ہندی میں بھی انکا کلام موجود ہے اور ان کی بنائی ہوئی ٹھمریاں دادرے وغیرہ جس میں وہ "جان عالم پیا" تخلص کرتے تھے اب تک لکھنو میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ کلکتہ ہی میں ۱۸۸۷ء میں اس دار فانی سے رحلت کی

تصانیف ان کی متعدد تصانیف اس وقت موجود ہیں۔ اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جس میں قصائد غزلیات، مثنویاں، مرثیہ، وغیرہ سب شامل ہیں تصانیف حسب ذیل ہیں :۔

(۱) چھ دیوان بہ تفصیل ذیل۔ شیوع فیض ۔ قمر مضمون ۔ سخن اشرف ۔ گلدستہ عاشقاں ۔ ماہ ملک ۔ نظم ناموَر ۔

(۲) مثنویاں ۔ حزن اختری (جس کا ذکر اوپر ہوا) خطابات محلات اس میں ان محلات کا ذکر ہے جن کے ساتھ عقد ہوا یا جن کے ساتھ متعہ ہوا ۔ اور کن کن سے اولاد ہوئی اور کن کن کو طلاق دیا گیا ۔ یہ مثنوی اس وقت کی تصنیف ہے جب بادشاہ ایام غدر میں فورٹ ولیم میں قید تھے ۔ بنی ۔ ناجو ۔ دلھن ۔ مثنوی در فن موسیقی ۔ دریائے تعشق

(۳) مراثی ۔ جن کی تین جلدیں ہیں ۔ ایک موسوم بہ جلد مراثی جس میں ۲۵ مرثیہ یا دو ہزار ایک سو گیارہ بند ہیں ۔ دفتر غم و بحر الم ۔ اس میں بائیس مرثیہ ہیں ۔ سرمایہ ایمان اس میں ۳۳ مرثیہ ہیں ۔

(۴) قصائد اردو و فارسی موسوم بہ قصائد المبارک

(۵) مباحثہ بین النفس و العقل

(۶) صحیفہ سلطانی ۔ اس میں کچھ ادعیہ اور آیات قرانی ہیں

(۷) نصائح اختری

(۸) عشق نامہ

(۹) رسالہ ایمان در بیان مصائب اہل بیت ۔

(۱۰) دفتر پریشان

(۱۱) مقتل معتبر

(۱۲) دستور واجدی در سیاست مدن

(۱۳) صوت المبارک

(۱۴) ہیبت حیدری

(۱۵) جوہر عروض (۱۶) ارشاد خاقانی ۔ یہ آخری دو کتابیں علم عروض میں ہیں ۔

مختصر یہ کہ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۴۰ جلد ہوگی۔ اصلاح سخن میر مظفر علی اسیر اور نواب فتح الدولہ برق سے لیتے تھے۔ برق کو مزاج شاہی میں خاص خصوصیت حاصل تھی اور بادشاہ سے بہت محبت کرتے تھے چنانچہ اسی وجہ سے ساتھ ہی ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں چند ماہ بعد ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ یہ شعر انکا ان کے حسب حال ہوا

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے		جان دی آپ کے دروازے پر مر کر اُٹھے

اسیر بر خلاف اس کے شرف رفاقت سے محروم رہے اور لکھنؤ ہی میں رہے یہ بات سلطان عالم کو ناگوار گزری تھی۔ علاوہ اسیر اور برق کے اس عہد کے مشہور شاعر۔ امانت تلق۔ بحر۔ سحر۔ ذکی۔ درخشاں۔ قبول۔ شفق۔ بیخود۔ ہنر۔ عطارد۔ ہلال۔ سرور تھے جن میں سے اکثر دامن دولت سے وابستہ بھی تھے صاحبزادوں میں نواب ولیعہد بہادر کوکب اور نواب برجیس قدر بہادر برجیس تخلص کرتے تھے۔

طرز کلام طرز کلام وہی ہے جو اس زمانہ میں لکھنؤ کے شعرا کا عام رنگ تھا۔ رعایت لفظی کا اکثر خیال رہتا ہے، سوز و گداز کی کمی ہے۔ البتہ ان کی مثنوی "حزن اختری" جس میں مصائب سفر کا بیان ہے نہایت دلکش اور پر تاثیر نظم ہے اس کی سلاست اور فصاحت اور خوبی زبان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ دیوانوں اور مثنویوں کے علاوہ ان کے خطوط بھی بہت دلچسپ ہیں جو انھوں نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں اپنی محبوب بیوی زینت محل کے نام لکھے تھے جن کو نواب اکلیل محل یا ممتاز جہاں کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ یہ خطوط بادشاہ کی اجازت سے مقفیٰ اور مسجع دیباچہ کے ساتھ اکبر علی خاں توقیر نے جو بادشاہی منشی تھے جمع کئے۔ یہ خطوط بترتیب سنہ جمع کئے گئے ہیں اور ۱۲۷۶ھ میں شایع کئے گئے ہیں۔ ان میں اکثر شاعرانہ انداز کے ساتھ نہایت محبت اور اخلاص سے اپنا اشتیاق اور لکھنؤ کی یاد کا درد انگیز صورت میں بیان کیا ہے یہ خط اس لئے جمع کئے گئے تھے کہ بادشاہ کو قید کے مصائب اور اپنی پیاری بیوی کی مفارقت سے کیسقدر

تسکین ہو۔

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

اس عشق نے رسوا کیا۔ میں کیا بتاؤں کیا کیا	آہِ دلِ ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا
کمر دھوکا۔ دہن عقدہ، غزال آنکھیں۔ پری چہرہ	شکم ہیرا۔ بدن خوشبو۔ جبیں دریا۔ زباں عیسیٰ
برائے سیر مجھ سا رند میخانہ میں گر آئے	گرے ساغر۔ لنڈھے شیشا۔ ہلے ساقی بہے دریا

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں	لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

یہ تمنا نہ رہے زیست میں اے یار خدا	پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت
ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دلِ زار مرا	یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت
وسعتِ خلد سے بڑھکر ہے کہیں حُبِ وطن	تنگیٔ گور سے بدتر ہے فضائے غربت
یوں تو شاہاں جہاں پر ہے پڑا وقت مگر	ختم ہے اختر بیکس پہ جفائے غربت

اسیر۔ سید مظفر علی خاں متخلص بہ اسیر خلف سید امداد علی امیٹھی کے رہنے والے تھے کتب درسیہ علمائے فرنگی محل سے پڑھیں مصحفی سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں شاہی ملازمت شروع کی اور امجد علی شاہ کے عہد میں اقتدار پایا اس کے بعد آٹھ نو سال تک واجد علی شاہ کے مصاحب خاص رہے اور تدبیر الدولہ مدبر الملک کے معزز خطاب سے سرفراز ہوئے۔ بادشاہ کبھی کبھی اپنے کلام میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے جب بادشاہ کلکتہ جانے لگے تو انھوں نے رفاقت منظور نہ کی جس سے بادشاہ آزردہ خاطر ہوئے جس کا جابجا اپنی تصانیف میں کیا ہے بعد غدر نواب یوسف علی خاں والی رامپور اور پھر ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں نے ان کی اور انکے کلام کی بڑی قدر دانی کی۔ پھر مدت العمر اسی ریاست کے دعاگو رہے اور اچھے ماہ

رام پور اور چھ ماہ لکھنؤ رہا کرتے تھے۔ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں بعمر ۸۱ برس لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ بہت مشاق اور پرگو شاعر تھے ان کی تصانیف میں چھ دیوان اردو ہیں جس میں سے چار چھپ چکے ہیں ایک دیوان فارسی اور ایک مثنوی "درۃ التاج" اور رسالۂ عروض بھی شایع ہوگئے ہیں۔ ان کے علاوہ مرثیے اور قصائد بھی بہت سے لکھے ہیں، علم عروض اور فن نظم کے استاد کامل تھے زبان پر ان کی حیرت انگیز قدرت سب کو تسلیم ہے مگر کلام کا رنگ وہی ہے جو اس زمانہ کے اہل لکھنؤ کا تھا البتہ کبھی کبھی اس رنگ خاص سے علیحدہ ہوکر اچھے اچھے شعر نکالتے ہیں۔ شاگرد بھی بہت زبردست اور نامی گرامی پائے مثلاً امیر مینائی ان کے علاوہ ان کے دونوں بیٹے متخلص بہ حکیم و افضل اور نیز شوق اور واسطی بھی مشہور شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے نمونہ کلام یہ ہے:-

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

کس سے کہوں تلون ابنائے روزگار
دشمن یہ لاکھ بار ہوئے لاکھ بار دوست

ضد سے جتنا ہے یہاں کافر و دیندار میں فرق
زاہد اتنا تو نہیں سبحہ و زنار میں فرق

زنجیر تعلق مرے پاؤں سے تو نکلے
ہے فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم تک

آیا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضموں چراغ سے
روشن اسی کا نام رہے جو جلائے دل

امانت سید آغا حسن خلف میر آغا رضوی لکھنوی روضۂ مشہد مقدس کے کلید بردار سید علی رضوی کی اولاد سے تھے شروع میں مرثیہ گوئی کا شوق ہوا۔ میاں دلگیر کو جو اس زمانہ کے مرثیہ گویوں میں نامور تھے اپنا کلام دکھاتے تھے چند روز بعد غزل گوئی کی طرف توجہ کی۔ چونکہ میاں دلگیر نے اصلاح دینے سے انکار کیا انھوں نے بھی اصلاح لینا ترک کردی ۱۲۵۱ھ میں بیس برس کی عمر میں کسی عارضہ کی وجہ سے قوت گویائی جاتی رہی اور گونگے ہوگئے مجبوراً بذریعہ تحریر بات کرتے تھے۔ یہی حالت ۱۲۶۰ھ تک رہی

آخر کار خدا کی قدرت سے یہ مرض جاتا رہا بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کربلا جاکر زبان خود بخود کھل گئی اور قوت گویائی عود کر آئی۔ امانت کو معما اور چیستان کہنے کا بہت شوق تھا۔ ان کی تصانیف سے دیوان خزائن الفصاحت۔ گلدستہ امانت اندر سبھا اور اکثر مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک واسوخت بھی لکھا ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ رکھتا ہے ان کی تصانیف میں واسوخت اور اندر سبھا کو خاص شہرت حاصل ہوئی اندر سبھا کو انوکھی اور دلچسپ کتاب ہونے کی وجہ سے اور نیز اسوجہ سے اردو ڈراما کی حیثیت سے یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اپنے جانشین دو لڑکے چھوڑے لطافت اور فصاحت جو اپنے اپنے رنگ میں شعرائے لکھنؤ میں بہت نامور ہوئے انکا انداز کلام خاص ہے یعنی رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا اس قدر شوق تھا کہ بعض شعر محض لفظی گورکھ دھندا معلوم ہوتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے رنگ کے سب سے بڑے برتنے والے یہی ہیں جن کے لفظ لفظ سے تصنع اور بنوٹ ظاہر ہوتی ہے مثال کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

بزم عالم میں یہ ہر شب ہے امانت کی دعا
فی سبیل اللہ پانی اِن کو دو اے آبلو

شمع روئے یار سے روشن مرا کاشانہ ہو
کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبان خار کے

برعکس اس کے کہیں کہیں نہایت صاف اور مزیدار شعر بھی نکل آتے ہیں

آنسو رواں ہیں زلف سیہ کے خیال میں
موتی پرو رہا ہوں ترے بال بال میں

عشق کا خنجر لگا ہے دل پہ کاری اندنوں
زخم کی صورت ہے خوں آنکھوں سے جاری اندنوں

فصل گل میں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو
ساقی مہوش ہو سے ہو شیشہ ہو پیمانہ ہو

کوچۂ قاتل تلک لے دل رسائی کیجئے
کاسۂ سر ہاتھ میں لے کر گدائی کیجئے

آفتاب الدولہ قلق — خواجہ ارشد علیخاں عرف خواجہ اسد اللہ ملقب بہ آفتاب الدولہ خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے۔ وہ اپنے آپ کو واجد علی شاہ کا بھی شاگرد بتاتے

تھے جو خوشامد اور زمانہ سازی پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور واقعیت سے دور ہے
ان کے کلام میں محض لفظی تصنعات اور مثنوی میں تو اکثر جگہ ابتذال اور رکاکت بھی پائی
جاتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بلحاظ زبان کے ان کا کلام بہت مستند اور قابل قدر
ہے مگر شعر کی حقیقی خوبیوں سے معرّا ہے۔ ان کی مشہور مثنوی طلسم اُلفت نہایت دلچسپ اور
قابل قدر کتاب ہے۔ ان کے دیوان موسوم بہ مظہر عشق کے شروع میں چند قصیدے
واجد علی شاہ کی تعریف میں ہیں۔ ایک مخمس بھی ان کی تصنیف سے ہے جس میں
بادشاہ کی نظربندی کا حال نہایت دردناک طریقہ سے لکھا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ
رنج و افسوس محض اپنے عیش و عشرت کے مفقود ہونے کی وجہ سے ہے نہ کہ حب وطن
اور بادشاہ کی محبت کے خیال سے۔

ذکی | مہدی علی خاں متخلص بہ ذکی۔ شیخ کرامت علی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے
تھے مگر آخر عمر میں مراد آباد جا رہے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آئے اور
شیخ ناسخ کے شاگرد ہوئے ایک قصیدہ بادشاہ کی تعریف میں پڑھا جس کے صلہ میں انعام
و اکرام پایا۔ یہاں سے وہ دہلی اور پھر دکن گئے جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی
دکن سے لوٹ کر واجد علی شاہ کے زمانہ میں پھر لکھنؤ آئے جنھوں نے ان کو ملک الشعرائی
کا خطاب عنایت کیا بعد انتزاع سلطنت مراد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی مگر
نواب یوسف علی خاں والی رام پور کی سرکار سے چند روز وابستہ رہے نواب
صاحب کے انتقال کے بعد انبالہ گئے اور وہیں ۱۲۸۱ھ میں انتقال کیا علم عروض
سے خوب واقف تھے اور اس فن میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جو ۱۲۶۵ھ میں شایع
ہوا تھا۔ مشاق اور خوشگو شاعر تھے اور دوسرے درجہ کے شعرائے لکھنؤ میں
بلند پایہ رکھتے تھے۔

درخشاں | سید علی خاں مخاطب بہ مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ کا

تخلص ہے۔ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے اور انھیں کی کوشش سے دربار رس ہوگئے تھے بادشاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں انتقال کیا فن نجوم سے بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے شاید اسی مناسبت سے یہ خطاب دیا گیا ہو۔ معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔

اختر قاضی محمد صادق خاں اختر قاضی محمد لعل کے صاحبزادے ہگلی بنگالہ کے قاضی زادوں میں تھے وطن چھوڑ کر لکھنو آرہے تھے۔ یہ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا جنھوں نے انکو ملک الشعرا کا خطاب دیا آخر مرزا قتیل کے شاگرد ہوگئے اور مصحفی جرأت اور انشا وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کی۔ چند دن فرخ آباد میں بھی قیام کیا تھا مشہور ہے کہ واجد علی شاہ نے ان کا تخلص ان سے مانگ لیا تھا اور اس کے صلے میں بہت کچھ انعام و اکرام دیا تھا۔ تھوڑے عرصہ میں واجد علی شاہ کچھ ناراض ہوگئے جس کی وجہ سے ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور اٹاوہ کے تحصیلدار ہوگئے جہاں ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔[1] اختر بڑے جامع کمالات اور لکھنو کے نامی شاعروں میں سے تھے فارسی بہت کم کہتے تھے چنانچہ ان کی فارسی تصنیفات حسب ذیل ہیں: "محامد حیدریہ" غازی الدین حیدر کی تعریف میں۔ "گلدستۂ محبت" جس میں گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال ہے۔ "مثنوی سراپا سوز"۔ "صبح صادق" جو اپنی سوانحعمری آپ ہی لکھی ہے۔ "تذکرۂ آفتاب عالمتاب" جس میں پانچہزار فارسی شعرا کا حال اور کلام فراہم کیا تھا۔ دیوان فارسی، بہار سخن، بہار اقبال، ہفت اختر، ایک دیوان ریختہ۔ یہ ان کی مشہور غزل قطعہ بند بطور نمونۂ کلام پیش کی جاتی ہے۔

جب پردہ رخ سے دور کرے وہ نقاب کا	جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا
کل بن کے شیخ مجتہد عصر ساقیا	دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا

[1] تذکرۂ گل رعنا اور خمخانۂ جاوید وغیرہ میں ان کے حال میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں وفات پائی۔

کہنے لگا ز راہ تبختر مجھے بطنز
میں نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
تقوی ہمارے آگے ہو جب آپکا درست
مے ہو وے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بیحجاب
کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ منھ سے منھ
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو

معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
کیجیے جو آپ مجکو نہ مورد عتاب کا
اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا
اور واں مخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگ خضاب کا
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

باب ۱۰

مرثیہ اور مرثیہ گو

مرثیہ کی تعریف: مرثیہ وہ صنف نظم ہے جس میں کسی مردہ شخص کی تعریف کی جائے اہل اسلام اس کے بہت شائق رہے ہیں۔ یہ قصیدہ کے برعکس ہے کیونکہ قصیدہ میں کسی زندہ شخص کی تعریف کی جاتی ہے اصطلاح میں مرثیہ انھیں نظموں کو کہتے ہیں جس میں حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر کیا جائے اور جو علی العموم محرم کے زمانہ میں کسی مجلس عزا میں یا کسی تعزیہ کے ساتھ

بہت سوز و گداز اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ابتدا میں اس قسم کی نظمیں صرف بین کے اشعار تک محدود ہوتی تھیں یعنی انمیں ممدوح کی صفات حسنہ کا بیان ہوتا تھا اور اس کی موت پر اظہار افسوس کیا جاتا تھا اس قسم کے مرثیے بہت مختصر ہوتے اور ان کی غرض اصلی صرف گریہ و بکا ہوتی تھی۔ امتداد زمانہ سے مرثیہ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اس میں مختلف قسم کے نئے نئے مضامین داخل ہونے لگے مثلاً چہرہ۔ ممدوح کے مناقب، دشمنوں کے معائب، مناظر جنگ، مناظر قدرت، رجز خوانی گھوڑے اور تلوار کی تعریف۔ سامان حرب و ضرب وغیرہ اس قسم کے مضامین کے اضافہ سے مرثیہ کا مرتبہ بڑھ گیا اور آخر کار وہ اردو نظم کی ایک مستقل صنف بن گیا۔

مرثیہ کی قدامت عرب کی شاعری کی ابتدا مرثیہ ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب شاعری شاعر کے ذاتی مفاد پر مبنی ہوگئی تو مرثیہ کو زوال ہونا شروع ہوا اس لئے کہ اس سے کسی قسم کے نفع کی امید نہ تھی کیونکہ مرنے والا کسی کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ جس قدر قصیدہ گوئی کو جو ذاتی مفاد پر مبنی تھی ترقی ہوئی اتنا ہی مرثیہ گوئی میں تنزل ہوا۔ فارسی شاعری کی بنیاد چونکہ تکلف، آورد، اور مداحی پر قائم ہوئی تھی اس لئے اس کی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی اور وہ انواع سخن جن کو جذبات سے لازمی تعلق تھا جس میں مرثیہ بھی داخل ہے دفعتاً پستی کی حالت میں آگئے۔ ہر چند کہ قدما کے یہاں ایسے بعض شعر ملتے ہیں جن میں فطرتی اثر اور جوش پایا جاتا ہے۔ مثلاً، شاہنامہ میں مادر سہراب کا اظہار رنج و الم اپنے پیارے بیٹے سہراب کی موت پر یا فرخی کا مرثیہ محمود غزنوی کی وفات پر جو دس بارہ بیتوں سے زیادہ نہیں مگر یہ یا اس قسم کے اور اشعار جو بہنیہ ہوں آج کل کے خیال کے مطابق بہ مشکل مرثیہ کہے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد سعدی اور خسرو کا زمانہ آیا انھوں نے بھی مرثیے لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوئے اور نہ لوگوں کو ان کے تتبع کا زیادہ خیال پیدا ہوا۔ ملا محتشم کاشی

گو کہ بمثل مرثیہ نگار تھے۔ مگر انھوں نے بھی طرز قدیم میں کوئی اضافہ نہیں کیا اسی طرح طالب آملی۔ غزالی میلی۔ کلیم وغیرہ نے گو کہ اور اصناف سخن میں خوب خوب کہا ہے مگر ان کے مرثیے مشہور نہیں ہیں۔ اسی طرح ظہوری کے مرثیے جو علی عادل شاہ کے واسطے لکھے گئے تھے بجز تعریفوں کے اور کچھ نہیں۔ البتہ ملا مقبل نے اس صنف میں ایک خاص زور اور جوش پیدا کیا جس سے ایران میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو گیا اور ایرانی شاعر اس کو بہت پسند کرنے لگے۔

اردو مرثیہ کی ابتدا جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی تھی اور اس کی ابتدائی کوششوں میں صنف مرثیہ بھی داخل تھی۔ شاہانِ گولکنڈہ و بیجاپور نہ صرف شاعروں کے قدردان تھے بلکہ خود بھی مذہبی آدمی ہونے کی وجہ سے مرثیہ وغیرہ خوب کہتے تھے مگر مرثیہ اس زمانہ میں بالکل ابتدائی حالت میں تھا، ولی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا البتہ چند بند شاہ وجیہ الدین کی تعریف میں ہیں انکو مرثیہ سمجھئے یا کچھ اور[1]۔ اس کے بعد جب شعرائے دہلی کی ترقی کا زمانہ آیا تو یہ لوگ مرثیہ کے بہت شائق تھے اور اس کو ایک مذہبی فرض سمجھ کر لکھتے تھے۔ مرثیہ کی نظم میں چونکہ مذہبیت کا رنگ غالب ہوتا تھا اسلئے عیوب شاعری پر نکتہ چینی کی نظر نہ ڈالی جاتی تھی۔ میر تقی نے اپنے تذکرۂ نکات الشعرا میں اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اکثر ایسے شعرا کا حال لکھا ہے جو مرثیہ گو تھے۔ مثلاً میر امانی۔ میر عاصی۔ میر آل علی درخشاں، سکندر۔ صبر۔ قادر۔ گمان۔ ندیم وغیرہ اسی طرح میر و سودا نے بھی مرثیے لکھے ہیں مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں ان میں حقیقی جذبات و اثر کی کمی ہے۔ میر ضاحک اور میر حسن کے مرثیے کوئی خاص خصوصیت نہیں رکھتے البتہ اس لئے قابل قدر ضرور ہیں کہ یہ بزرگوار میر انیس کے اجداد میں تھے۔ سودا کے وقت تک عموماً مرثیے جو مصرعے

[1] تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے کہ ولی نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی ہے ۱۲

ہوا کرتے تھے غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا جو اب تک مروّج ہے اسی طرح ضمیر نے مرثیہ کے مضمون میں اضافہ کیا اور اس میں جدید تشبیہات واستعارات معرکۂ کارزار کے مفصل حالات۔ شاعرانہ استدلال اور دلچسپ مبالغے داخل کئے جو انیس و دبیر کے زمانہ میں معراج کمال تک پہونچ گئے۔ ضمیر نے کلام میں زور، بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی اور سوز کی جگہ تحت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔

بزرگان انیس اور انکی خدمات مرثیے کے ساتھ

ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ میر امانی۔ اور میر ضاحک اور میر حسن نے مرثیے کہے تھے مگر اب وہ ملتے نہیں۔ میر حسن کے چار بیٹے تھے جس میں سے تین یعنی خلیق اور خلق اور محسن شاعر تھے۔ خلق اپنے والد ہی کے شاگرد تھے صاحب دیوان ہیں اور مرثیہ بھی کہتے تھے اور سو برس کی عمر میں انھوں نے انتقال کیا۔ خلیق بھی بجائے خود ایک نہایت مشہور شاعر تھے جن کے حالات علیحدہ ذیل میں قلمبند کئے جاتے ہیں:۔

خلیق میر مستحسن خلیق میر حسن کے صاحبزادے عمر میں خلق سے چھوٹے تھے فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشق سخن شروع کی اور چونکہ خود ان کو شعر گوئی کا بہت شوق تھا اور باپ کو بوجہ تصنیف مثنوی سحر البیان فرصت نہ تھی لہذا ان کو مصحفی کا شاگرد کرا دیا۔ تھوڑے دنوں میں یہ مشاق ہو گئے اور کلام اس قدر با مزہ ہونے لگا کہ ایک مرتبہ مرزا محمد تقی ترقی کے یہاں فیض آباد میں مشاعرہ تھا جس میں خواجہ حیدر علی آتش بھی بلائے گئے تھے اور خیال تھا کہ وہ وہیں روک لئے جائینگے جب شروع جلسہ میں خلیق نے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا۔

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو	صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

تو آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو پھر میری کیا ضرورت ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب میر حسن کا انتقال ہو گیا تو عیال کا بوجھ

سر پر پڑا۔ چونکہ آمدنی کچھ نہ تھی لہذا غزلوں کی فروخت سے اپنا کام چلاتے تھے۔ میر خلیق ایک پُرگو شاعر تھے ایک دیوان مرتب کر لیا تھا مگر وہ شائع نہ ہو سکا۔ آخری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور ضمیر اور فصیح اور دلگیر کے معاصر تھے۔ میاں دلگیر ناسخ کے شاگرد تھے مگر چونکہ زبان میں لکنت بھی اس لئے اپنا کلام خود نہ پڑھتے تھے۔ البتہ مرثیہ کو قدیم رنگ سے علٰحدہ کر کے اس میں کچھ جدتیں پیدا کی تھیں۔ مرزا فصیح (شاگرد ناسخ و دلگیر) حج کو گئے اور وہیں رہ گئے اب صرف ضمیر اور خلیق کے واسطے میدان مرثیہ گوئی رہ گیا تھا۔ لہذا یہ دونوں باکمال ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کیلئے کاوشیں کرتے تھے جس کا نتیجہ مرثیے کی تکمیل و ترقی کے واسطے بہت اچھا نکلا۔ مرثیہ کی صورت میں یہ تغیر ہوا کہ بجائے چومصرعہ کے اب مسدس کا رواج ہوا اس کی ابتدا سودا سے ہوئی تھی اور خلیق نے اس کو پھیلایا۔ سلام بھی بطرز غزل کہے جانے لگے مرثیہ پڑھنے کا طریقہ بجائے سوز کے تحت اللفظ مقرر ہوا۔ جو غزل مستزاد کے اسلوب پر کہی جاتی وہ نوحہ کہلاتی اور اس کو سوز ہی کے اسلوب میں پڑھتے تھے پہلے مرثیہ چالیس پچاس بندوں تک محدود تھا میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس کو طول دیا۔ اس طرح کہ پہلے تمہید پھر سراپا پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھایا اور خاتمہ شہادت پر کیا۔ اس جدت کی بڑی قدر ہوئی اور اس نے مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اس وجہ سے کہ قدیم زمانہ میں مرثیے محض حصول ثواب کی غرض سے رونے رلانے کے واسطے ایک مقررہ طریقے پر کہے جاتے تھے اب اُس میں دوسری چیزیں شامل کی جانے لگیں جن کی جانچ پرتال بھی اسی طرح کی جاتی تھی جس طرح اساتذہ شعرائے کلام کی ہوتی ہے۔ ان جدید مطالب کے اضافہ سے مرثیہ گوئی کے قالب میں ایک نئی روح پھونک گئی اور اُس کی بوسیدہ ہڈیوں پر اس اضافہ سے نیا گوشت پوست چڑھایا گیا۔ اور اب وہ شاعری کی ایک موقر صنف قرار پایا جس سے کہ اب اکثر فرزندہائے اسلام یہاں تک کہ اہل ہنود بھی دلچسپی

سیلیتے ہیں اور بہت ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔ میر خلیق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پر بہت توجہ کی اور درد و اثر کو خالی تشبیہوں اور لفظی مناسبت کے مقابلے میں زیادہ ملحوظ رکھا۔ اور یہی فرق انکے اور میر ضمیر کے یہاں ما بہ الامتیاز ہے۔ انیس نے بھی اس معاملہ میں اپنے پدر بزرگوار کی پوری پیروی کی اسیطرح پڑھنے کے طریقے میں بھی میر انیس نے اپنے والد ہی کا تتبع کیا۔ یہ زیادہ تر اعضا کی حرکت سے کام نہ لیتے تھے بلکہ صرف آنکھ کی گردش یا خفیف سی گردن کی جنبش سے سب کام نکالتے تھے۔ میر خلیق کا خاندان زبان اُردو کی صحت اور محاوروں کی صفائی کے لئے مشہور ہے چنانچہ ناسخ اپنے شاگردوں سے برابر کہتے تھے کہ اگر زبان سیکھنا ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔

میر انیس | میر ببر علی انیس ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ میں بمقام فیض آباد محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد رہتے تھے۔ اپنے والد کے سایہ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی لکھنؤ میں اس وقت آئے جب ان کے بڑے صاحبزادے میر نفیس پیدا ہو چکے تھے۔ چھوٹے بھائی اُنس ہمراہ تھے ابتدا میں فیض آباد کے تعلقات بالکل منقطع نہیں ہوئے اس وجہ سے کہ باپ اور بھائی وہیں رہتے تھے مگر جب بعد کو پورا خاندان لکھنؤ چلا آیا تو یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی صاحب سے اور صدرا مفتی میر عباس صاحب سے پڑھی تھی۔ ورزش کے بہت شایق تھے اور فنون سپہ گری میر کاظم علی اور ان کے بیٹے میر امیر علی سے حاصل کئے جو اس فن میں اُس زمانہ کے استاد مانے جاتے تھے۔ فن شہسواری سے بھی واقف تھے۔ فن سپہ گری کی معلومات جنگ کے مناظر وغیرہ دکھانے میں بہت کار آمد ثابت ہوئی حسن تناسب کے ایسے عاشق تھے کہ خواہ وہ انسان میں ہو یا کسی دوسری شے میں اسکی دل سے قدر کرتے تھے۔ انکو اپنی عزت خاندانی پر بڑا فخر تھا اور خود داری اور عزت خاندانی کا ہمیشہ خیال رہتا تھا وضعدار بھی بہت بڑے تھے ملنے جلنے میں رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتے تھے ایک وقت معینہ پر لوگوں سے

ملاقات کرتے تھے کوئی شخص حتیٰ کہ ان کے گھر والے بھی بغیر اطلاع ان کے پاس نہیں آسکتے تھے۔ امراسے بہت کھنچکر ملتے تھے یہانتک کہ بادشاہ وقت کے یہاں بھی اس وقت تک نہیں گئے جب تک کہ ایک معتمد شاہی ان کو لینے نہ آیا۔ وہ اپنی عزت خاندانی اور عزت پیشہ کو سب باتوں پر مقدم سمجھتے تھے۔ آئین وضعداری کے بہت سختی سے پابند تھے جس کو انھوں نے اپنے اور اپنے احباب اور ملنے والوں کے واسطے مقرر کرلیا تھا وضع اور لباس بھی خاص تھا جس کو انھوں عمر بھر نباہا۔ لوگ جس طرح ان کے کلام کی عزت کرتے تھے اسی طرح ان کی پابندی وضع کے بھی قدردان اور مداح تھے ایک مرتبہ نواب تہور جنگ ایک رئیس حیدر آباد نے میر صاحب کی جوتیاں اٹھا کر انکی پالکی میں رکھ دیں اور اس پر ان کو بڑا فخر وناز تھا۔ یہ ان کے مزاج کی خودداری، قناعت اور استغنا کا نتیجہ تھا کہ کبھی کسی کی تعریف میں یا روپیہ کے لالچ میں ایک حرف زبان سے نہیں کہا البتہ امرائے لکھنؤ جو ہدایا و تحائف مداح آل رسولؐ سمجھ کر پیش کرتے تھے اس کو قبول بھی کرلیتے تھے۔

میر انیسؔ لکھنؤ سے تا انتزاع سلطنت کبھی باہر نہیں نکلے۔ جب کبھی باہر جانے کا ذکر ہوتا تو فرماتے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں اور کوئی اس کی قدر کیا کریگا اور ہماری زبان کا لطف کیا اٹھائے گا لیکن تباہی لکھنؤ کے بعد پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء میں اور پھر ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علی خاں کی طلب اور اصرار سے پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے اور واپسی میں بنارس میں بھی ایک مرتبہ ٹھہرے تھے اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں مولوی سید شریف حسین خاں کی تحریک اور نواب تہور جنگ بہادر کے سخت اصرار سے دکن حیدر آباد گئے اور لوٹتے ہوے الہ آباد میں قیام کیا اور سب مقامات پر اپنے معرکۃ الآرا مرثیوں سے لوگوں کو مستفیض اور واخل کیا۔ جس مجلس میں پڑھتے لوگ اس کثرت سے جمع ہوتے تھے کہ باوجود سخت انتظام اور پہروں کے بھی جیبیں بھی

زمین سننے والوں سے خالی نہ رہتی تھی۔ جب دوسرے شہروں کا یہ حال تھا تو پھر خاص لکھنؤ کا کیا پوچھنا ہے جو قدردانی اور کمال کا سرچشمہ تھا۔ میر صاحب کا انتقال بعارضہ بخار ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں ہوا[1]۔ اور اپنے باغ ہی میں دفن ہوئے۔

میر انیس بحیثیت شاعر | میر صاحب خلقی شاعر تھے اور شاعری ورثہ میں پائی تھی۔ کوئی خاندان اتنا زبردست سلسلہ مشہور اور قابل شعراء کا نہیں پیش کر سکتا۔ لہذا جو فخر میر صاحب کو اپنے خاندان پر تھا وہ بجا تھا۔ میر صاحب نے بچپن ہی میں جبکہ فیض آباد میں قیام تھا شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے حزیںؔ تخلص کرتے تھے شائد اس مناسبت سے کہ انکے پردادا میر ضاحک اور مشہور شاعر شیخ علی حزیں میں بہت ربط و ضبط تھا[2]۔ جب لکھنؤ آئے تو ان کے والد ان کو ناسخ کے پاس لے گئے ناسخ نے کہا کہ تخلص کو بدل دو چنانچہ ایسا ہی کیا انیس تخلص اختیار کیا۔ انیس نے کم سنی سے مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا اور تھوڑے ہی دنوں کی مشق میں درجہ کمال کو پہونچ گئے تھے چنانچہ ان کی شہرت ان کے والد کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ جب خلیقؔ اور ضمیرؔ میدان مرثیہ گوئی سے ہٹ گئے تو دبیرؔ و انیسؔ کا زمانہ آیا جنھوں نے اس فن کو معراج کمال تک پہونچا دیا۔

تصانیف | میر صاحب نے ہزارہا مرثیے، سلام، قطعات، رباعیاں لکھی ہیں۔ افسوس ہے کہ انکا پورا کلام اب تک شایع نہیں ہوا مگر جسقدر چھپ چکا ہے پانچ جلدوں میں

---

[1] کسی نے کیا خوب مادہ تاریخ نکالا ہے جس میں مصرعہ کے ایک جزو سے میر انیس اور دوسرے جزو سے مرزا دبیر کی وفات کا سن نکلتا ہے۔ مصرعہ یہ ہے ع

غم انیس ہیں ہے ہے۔ دیا دبیر کا غم
۱۲۹۱ ۱۲۹۲

[2] یہ نسبت قرین عقل نہیں معلوم ہوتی اس وجہ سے کہ میر ضاحک میر اور سودا کے معاصر تھے اور شیخ علی حزین خان آرزو کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور انسے سن میں بڑے تھے لہذا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ضاحک نے اپنی بہت صغر سنی میں شیخ کو کہیں دیکھا ہو ارتباط وغیرہ تفاوت سن کی وجہ سے غیر ممکن ہے ۱۲

ہے۔ باقی ان کے اعزہ کے پاس محفوظ ہے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے ڈھائی لاکھ شعر کہے
تھے جن میں کچھ غزلیں بھی تھیں جس طرح ان کا کلام لاجواب ہے اسی طرح ان کے پڑھنے
کا طریقہ بھی لاجواب تھا ان کی آواز قد و قامت، صورت۔ غرض ہر شے اس کام کے لئے
موزوں واقع ہوئی تھی پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ بڑا آئینہ سامنے رکھکر تنہائی میں بیٹھتے اور
پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ میر انیس کا کلام ہموار ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح رطب و
یابس کا مجموعہ نہیں ہے ادب اردو میں میر انیس ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں بحیثیت شاعر
کے ان کی جگہ صف اولین میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو زبان اردو کے تمام
شعرا سے بہترین اور کامل ترین سمجھتے ہیں اور ان کو ہندوستان کا شیکسپیر اور خدائے سخن اور
نظم اردو کا ہومر اور ورجل اور بالمیک خیال کرتے ہیں۔

انیس کی خدمت زبان کے ساتھ انیس نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی اس کو خوب صاف کیا
اور مانجا اور ان کا کلام اپنی فصاحت اور نازکی کے لئے مشہور عالم ہے
وہ صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے اور اسی پر ان کو بڑا فخر و ناز تھا۔ لغات
کی معلومات ان کی بہت وسیع تھی۔ اور الفاظ کی سجاوٹ میں ان کو کمال حاصل تھا بہت
سے نئے نئے محاورے انکی وجہ سے داخل زبان ہوئے اور قدیم محاورات کا صحیح استعمال
بھی انھوں نے بتایا۔ ابتدائی کلام میں کچھ قدیم محاورات پائے جاتے ہیں مگر جوں جوں مشق بڑھتی
گئی اور تجربہ وسیع ہوتا گیا اسی قدر کلام صاف ہوتا گیا۔ میر صاحب کی زبان دلی اور
لکھنو دونوں جگہ مستند مانی جاتی ہے۔ ان کا خاندان صحت محاورہ کا محافظ سمجھا جاتا ہے
چنانچہ خود فرماتے تھے کہ میں فلاں لفظ یا فلاں ترکیب کو اس طرح استعمال کرتا ہوں
جیسا میرے گھرانے میں مروج ہے نہ کہ اس طرح کہ جیسے آپ اہل لکھنو بولتے ہیں
میر حسن اور میر خلیق کے تعلقات بہو بیگم صاحبہ کے خاندان کے ساتھ وابستہ تھے
مشہور ہے کہ فیض آباد میں ان کے یہاں ایک باقاعدہ دفتر تھا جس میں ایسے محاورے

اور شلیں جو بہو بیگم صاحبہ کے گھر میں بولی جاتی تھیں باقاعدہ درج ہوتی رہتی تھیں اور اس دفتر کے افسر اعلیٰ میر حسن اور میر خلیق تھے۔ ظاہر ہے کہ زبان کی صحت وصفائی کے واسطے ان سے زیادہ کون مستند ہو سکتا تھا میر صاحب کا مرتبہ زبان اردو میں بہت خاص ہے اسوجہ سے جو احسان انھوں نے زبان کے ساتھ کیا وہ بھی خصوصیت رکھتا ہے۔ اُردو باوجود اصناف نظم کی تنوع اور کثرت کے رزمیہ نظم سے ابتک تہیدست تھی اس میں ہومر کی الیاڈ۔ ورجل کی انیاڈ۔ ویاس کی مہا بھارت والمیک کی رامائن۔ یا فردوسی کے شاہنامہ کی طرح کی کوئی تصنیف موجود نہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ زبان اردو ایک نوخیز چیز ہے اور اس قسم کی تصانیف رزمیہ کے لیے ایک مدت مدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ کمی کسی طرح پوری ہو سکتی تھی تو وہ انیسؔ کے مشہور مراثی سے ہوئی۔ ان کے مرثیوں کی تمہیدیں اور مناظر جنگ وغیرہ ایسی استادی اور کمال سے لکھے گئے ہیں کہ نظامی کے سکندر نامہ اور فردوسی کے شاہنامہ کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح مناظر قدرت اور جذبات انسانی جس زور کے ساتھ انھوں نے دکھائے ہیں اس کا بھی جواب زبان اردو میں کہیں نہیں ملتا۔

مرقع نگاری انیسؔ کو مناظر قدرت کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا اس قسم کے بیانات مرثیہ سے غیر متعلق نہیں ہوتے بلکہ اصل مضمون کے تحت میں ہوتے ہیں مگر پھر بھی بالذات ایک مکمل چیز ہیں جو مرثیہ سے بے تکلف علیحدہ کیے جا سکتے ہیں پورا مرثیہ ایک ایسا مرقع معلوم ہوتا ہے جس میں صدہا خوبصورت خوبصورت مکمل تصویریں چسپاں ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے تعلق نہیں رکھتیں مگر پھر بھی مجموعی حیثیت سے اسی کل کے تحت میں سب آتی ہیں مثلاً صبح کا سماں۔ طلوع آفتاب۔ نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے شام کا سہانا وقت۔ چاندنی کا لطف یا تاریکی کا بھیانک منظر۔ باغ میں پھولوں کا کھلنا اور مہکنا۔ سبزہ کی بہار وغیرہ وغیرہ الگ الگ چیزیں ہیں مگر سب مرثیہ کے جزو ضروری ہیں

اظہار جذبات مثل عالم ظاہر کے عالم باطن یعنی جذبات کے اظہار پر بھی میر صاحب کو بہت بڑی قدرت حاصل ہے۔ جذبات۔ خوشی و غم و غصہ۔ محبت۔ رشک و حسد۔ بیم ورجا وغیرہ ایسی استادی سے بیان کرتے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے ایک اور کمال یہ ہے کہ کہنے والے کی عمر۔ جنس۔ حالت وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے مثلاً اگر کسی بچہ کی زبان سے کچھ الفاظ کہے گئے ہیں تو خیالات اور زبان دونوں بچوں ہی کے ادا کیے جاتے ہیں۔ وہ کبھی اس نازک فرق کو نظر انداز نہیں کرتے جس سے اُن کی اصول ڈراما نویسی کی کماحقہ واقفیت کا اندازہ اچھی طرح کیا جاسکتا ہے اسی طرح عورتوں کے مختلف رشتوں کے نازک فرق کو بھی بدرجۂ اتم ملحوظ رکھتے ہیں۔ معرکۂ جنگ میں مبارزوں کی رجز خوانی۔ حریف کا جواب۔ حملہ آوروں کے حملے۔ پہلوانوں کی لڑائیاں سامان حرب و ضرب علیٰ قدر مراتب اس خوبی سے دکھاتے ہیں کہ میدان کارزار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ تلوار اور گھوڑے کی تعریف صدہا بلکہ ہزارہا جگہ کی گئی ہے مگر ہر دفعہ تشبیہ اور تخئیل نئی ہوتی ہے اور نیا لطف دیتی ہے۔

مرثیوں میں تسلسل بیان ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ میر انیس ایک مستند مؤرخ کی حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ جن واقعات کو انھوں نے نظم میں باندھا ہے وہ من وعن ہرگز وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ ان کا وجود اگر ہے تو شاعر کے تخئیل میں ہے مگر یہی تخئیلی وجود ما بعد کے شعرا اپنے ماقبل کے شعراء کے کلام سے اخذ کرتے چلے آتے ہیں۔ میر انیس کا کلام اغلاط سے بھی بالکل پاک نہیں۔ مولوی عبدالغفور صاحب نساخ نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں انھوں نے انیس اور دبیر کی عروضی اور دوسری قسم کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے طرفداروں نے بھی اس کے جواب میں رسالے لکھے اور اپنے اپنے استادوں کی جانبداری کا حق ادا کیا۔ مگر سچ پوچھیے تو واقعیت بین بین ہے۔ کہا جاتا ہے

کہ میر انیس اور مرزا دبیرؔ کے مرثیے اصلی حالت میں اور صحیح طور پر نہیں چھپے۔ ان میں کچھ کتابت کی غلطیاں ہیں اور کچھ ان لوگوں کی حسب موقع تحریفیں ہیں جنھوں نے مرثیے پڑھے۔ کہیں کہیں پرانے محاورات بھی ہیں جو اب متروک ہوگئے مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام مرثیوں میں ہمواری نہیں ہے اور بعض اشعار تو انیس اور دبیر ایسے پختہ کار شاعروں کے درجہ سے گرے ہوئے ضرور ہیں۔ مگر تعجب کی کیا بات ہے اس وجہ سے کہ انھوں نے لاکھوں شعر کہے اگر کہیں کوئی غلطیاں بھی ہوگئیں تو اس سے ان کی استادی پر کیا حرف آتا ہے۔

میر انیس کا طرز | میر انیس۔ تمثیلوں۔ استعاروں، اور صنایع بدائع میں کمال رکھتے ہیں وہ فضول مبالغے اور بیجا اغراق کو ہرگز نہیں پسند کرتے جن کی اس زمانہ میں کثرت تھی صنائع بدائع کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جس سے شعر پر کوئی بار نہیں پڑتا اور حسن بڑھ جاتا ہے اسی طرح انکی تمثیلیں بھی نہایت حسین اور بہت ارفع اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہیں وہ ان سے ایک عجیب دلکش اثر پیدا کرتے ہیں۔ بڑی چیز کی مثال ہمیشہ بڑی چیز سے دیتے ہیں ان کی تشبیہات کبھی معمولی اور ادنی قسم کی نہیں ہوتیں۔ کلام حسب موقع کہیں صاف وسلیس اور کہیں رنگیں ہوتا ہے۔ مگر فصاحت اور زور کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا بیان میں روانی غضب کی ہوتی ہے فصاحت نشست الفاظ اور زور یہ سب ان کے کلام میں ملے ہوئے ہیں۔ اشعار بہت صاف اور سلیس اور جلد سمجھ میں آنے والے ہیں اور یہ آخری صفت بعض وقت دھوکا دیتی ہے اور عمق معنی کو اس گہرے غار کے پانی کی طرح پوشیدہ کردیتی ہے جس کو صفائی اور موجوں کی روانی نے چھپا دیا ہو۔ ان کے قادر الکلام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ایک ہی بات اور ایک ہی مضمون کو اسی سادگی اور دل آویزی کے ساتھ صدہا بار کہتے ہیں اور پھر ہر مرتبہ وہ نئی معلوم ہوتی ہے۔

انیس کا مرتبہ اردو شعرا کی صف اولین میں نہایت اعلیٰ وارفع ہے انکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب تصنع اور تکلف اور مبالغہ اور اغراق کا بازار گرم تھا انکی شاعری جذبات حقیقی کا آئینہ تھی اور جس نیچرل شاعری کا آغاز حالی اور آزاد کے زمانہ سے ہوا اسکی داغ بیل انیس نے ڈالی تھی۔ انیس نے مرثیہ کو ایک کامل حربہ کی صورت میں چھوڑا جس کا استعمال حالی نے نہایت کامیابی سے کیا۔ انکی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی داں طبقہ میں بہت مقبول ہیں جسکا دماغ معمولی شعر و شاعری کی غیر ضروری سے بعض وقت پریشان ہوکر حقیقی شاعری کی نکہت کے لئے بیتاب ہوتا ہے ان کی شہرت برابر ترقی کر رہی ہے اور ہماری رائے میں اسوقت تک ترقی کرتی جائے گی جب تک زبان اردو ترقی کریگی بلکہ اسی وقت انیس کی واقعی قدر کی جائے گی۔

دبیر | مرزا سلامت علی دبیر دہلی میں ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے انکے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ارباب تذکرہ میں خاندان کی نسبت اختلاف ہے اور اور کوشش کی گئی ہے کہ ان کو عالی خاندان اور ان کے بزرگوں کو نہایت معزز ثابت کیا جائے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا دبیر ایک شریف اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور انکے بزرگ قدیم زمانہ میں کچھ اثر ضرور رکھتے تھے۔ ان کے والد تباہی دہلی کے بعد لکھنو آئے اور یہیں شادی کر کے رہ پڑے اسکے بعد جب دہلی میں تسلط ہو گیا تو پھر دہلی واپس گئے مگر دبیر اپنے والد کے ساتھ لکھنو اس وقت آئے جب انکی عمر تقریباً سات برس کی تھی مرزا استعداد علمی معقول رکھتے تھے اور درس و تدریس اور بحث و مباحثہ کے بڑے شایق تھے جس سے ان کی ذہانت اور طباعی کو جولانی کا خوب موقع ملتا تھا شعر و سخن سے قدرتی مناسبت رکھتے اور علی الخصوص مرثیہ گوئی کے بچپن ہی سے دلدادہ تھے۔ میر ضمیر کے شاگرد ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی ذہانت اور طبعی جودت سے اپنے ہم مشقوں پر گوے سبقت لے گئے۔ اب ان کا شمار اچھے مرثیہ

گویوں میں ہونے لگا چنانچہ مرزا رجب علی بیگ سُرورؔ نے فسانہ عجائب میں اس وقت کے مشہور مرثیہ گویان لکھنؤ میں دبیرؔ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مرزا دبیر کی شہرت برابر ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ ان کو بادشاہ وقت کے سامنے پڑھنے کا بھی افتخار حاصل ہوا لکھا ہے کہ اکثر رؤسائے لکھنؤ اور محلات شاہی بھی ان کی شاگرد ہو گئی تھیں اور اب یہ زبان اردو کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ ان کی شہرت سے اور نیز استاد کی عزت و محبت کے برتاؤ سے بعض لوگ آتش رشک و حسد سے جلنے لگے اور استاد و شاگرد میں ایک خاص موقع پر جبکہ مرزا دبیرؔ نے نواب افتخار الدولہ کی مجلس میں اپنا مرثیہ پڑھا تھا، رنجش اور بددلی پیدا کرادی مگر غنیمت ہے کہ اس معاملہ نے طول نہیں کھینچا اور مصحفی و انشا کی طرح تھکا فضیحتی کی نوبت نہیں آئی۔ آخر کار معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ مرزا صاحب ہمیشہ اپنے استاد کا نام ادب و احترام سے لیتے تھے اور لوگوں کو بھی کوئی موقع ان کو بُرا بھلا کہنے کا اپنے سامنے نہیں دیتے تھے مرزا صاحب کا دامن شہرت وسیع ہو چکا تھا کہ میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ پہونچے اب میر ضمیر بوڑھے ہو گئے تھے مقابلہ آئندہ مرزا دبیر اور میر انیس میں شروع ہوا یہ دونوں بزرگوار بھی نہایت تہذیب و متانت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے اور جب کبھی کسی مجلس میں یکجائی کا موقع ہوتا تو ایک دوسرے کا بہت ادب و آداب کرتے تھے ۱۲۹۱ھ ہجری میں مرزا صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت ہوئی چنانچہ بحکم واجد علی شاہ جو اس وقت مٹیا برج میں قیام گزیں تھے کلکتہ تشریف لے گئے جہاں ایک ہوشیار ڈاکٹر نے کامیابی سے ان کا علاج کیا۔ مثل میر انیس کے یہ بھی عذر ۱۸۵۷ء تک گھر سے نہیں نکلے تھے مگر ۱۸۵۵ء میں مرشد آباد اور ۱۸۵۹ء میں پٹنہ عظیم آباد گئے اور ۱۲۹۲ھ ہجری مطابق ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں اس دار ناپائدار سے رحلت کی اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

لے آب حیات میں لکھا ہے کہ یہ مجلس نواب شرف الدولہ کے یہاں ہوئی تھی ۱۲۔

دبیر بحیثیت مرثیہ گو مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے استاد کامل تھے انھوں نے اپنی پوری عمر اسی مشغلہ میں صرف کی۔ ان میں میر انیس کی اکثر خصوصیات موجود ہیں اور شکوہ الفاظ اس پر طرّہ ہے مرزا صاحب سامعہ نواز الفاظ کے ساتھ اعلیٰ تخیل، نئی تشبیہات اور تازگی مضامین کے بھی بہت دلدادہ ہیں اس میں بھی شک نہیں کہ بسا اوقات انکا مقصد پورا نہیں ہوتا اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کی مثل صادق آتی ہے ان کے کلام میں ایک عالم فاضل کی جھلک برابر آتی ہے وہ آیات قرانی اور احادیث کو باندھنے کے بہت شایق ہیں اور بعض وقت اردو کے ساتھ عربی کا جوڑ خوب بٹھاتے ہیں۔ دوسری صفت یہ تھی کہ بہت پر گو اور زود گو تھے ان کی کثرت خیالات حیرت انگیز ہے مختصر یہ کہ اپنی حسین اور نادر تشبیہات سے اپنی شاندار ابیات سے، اپنے اعلیٰ مضامین سے، اپنے پر شکوہ الفاظ سے، اپنی طباعی و ذہانت سے اپنی زود گوئی اور پُر گوئی سے اور اپنی ایجاد پسند طبیعت سے وہ ضرور اس قابل ہیں کہ میر انیس کے پاس شعرا کی صف اولین میں ان کو جگہ دی جائے۔

انیس و دبیر کا مقابلہ ان دونوں کے مقابلہ سے اہل لکھنو دو بڑی جماعتوں پر منقسم ہوگئے ایک طرفداران انیس دوسرے جانبداران دبیر جو باصطلاح اہل لکھنو انیسیے اور دبیرئیے کہلاتے تھے ان دونوں فریقوں کی جنبہ داری بعض اوقات حد اعتدال سے بڑھ کے خفیف اور مضحکہ انگیز درجہ تک پہونچ جاتی تھی مگر ایک مورخ کا یہ فرض نہیں ہے کہ ان جزئی مباحث میں پڑے پھر بھی ان نامور استادوں کے کلام کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں دونوں بزرگ ایک ہی زمانہ میں تھے یہانتک کہ ایک سال کی کمی بیشی میں پیدا ہوئے اور ایک ہی سال کی کمی بیشی میں انتقال کیا دونوں ایک ہی صنف نظم (مرثیہ) میں مشغول و منہمک تھے۔ دونوں کی سوسائٹی اور

ماحول ایک ہی تھا۔ دونوں نے اپنی تصنیفات از قسم مراثی و رباعیات وسلام وغیرہ بکثرت چھوڑے اور دونوں زبان اُردو کے مستند اور مسلم الثبوت استاد تھے اب فرق دیکھنا چاہیئے کہ کیا ہے۔ انیس موروثی شاعر تھے شاعری ان کو ورثے میں ملی تھی چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

مگر مرزا دبیر کو یہ شرف حاصل نہ تھا دونوں کا طرز بھی جدا جدا ہے انیس کی خاص توجہ زبان کی صفائی اور حلاوت، بندش کی چستی اور محاورے کی درستی پر ہے برخلاف اسکے مرزا دبیر کے یہاں جدت خیالات، بلند تخئیل، نئی نئی تمثیلیں اور پر شکوہ الفاظ زیور کلام ہیں۔ مختصر طور پر فصاحت اور سادگی میر انیس کے کلام کا جوہر ہے اور صنعت اور رنگینی مرزا دبیر کا مایۂ ناز ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ میر صاحب کا کلام ایسی بھدی ترکیبوں اور دور از کار تشبیہوں سے پاک وصاف ہے جو مرزا صاحب کے یہاں بکثرت ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کو عربی درسیات بہت مستحضر تھیں اور میر صاحب کو اس قدر نہ تھیں اور یہی کتابی علم کی کمی میر صاحب کی شگفتگی کلام کا باعث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک فضول سی بات ہے اس معاملہ میں آخری فیصلہ کن چیز ادبی ذوق ہے اور ہر شخص کا ذوق الگ الگ ہوتا ہے اس زمانہ میں یہ بات داخل فیشن ہو گئی ہے کہ دبیر کے کلام کو کم کرکے دکھایا جائے اور انکا مرتبہ انیس سے بہت کم رکھا جائے مگر حق یہ ہے کہ دبیر بھی مثل انیس کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ جیسا کہ خود ان کے معاصرین امیر مینائی اور اسیر لکھنوی نے اعتراف کیا ہے۔ ان کی شہرت خود ان کے زمانہ میں بھی بہت تھی جیسا کہ لفظ "استاد" سے ثابت ہے

جو اُن کے واسطے برابر استعمال کیا جاتا ہے۔

مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب

لکھنؤ ہمیشہ سے شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اہل تشیع شہدائے کربلا کا دل سے ادب و احترام کرتے ہیں۔ اس شہر میں عشرۂ محرم بڑے دھوم دھام اور خاص اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے یہاں کے تعمیر پسند بادشاہوں نے بڑے بڑے امام باڑے بنوائے جہاں ایام عزا میں مومنین جمع ہوتے ہیں اور شہدائے کربلا کی مجالس نہایت سیر چشمی اور تکلف سے کرتے ہیں، امیر سے غریب تک اس مہینہ کو متبرک سمجھ کر جملہ مراسم عزاداری اس میں انجام دیتے ہیں۔ اظہار غم کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ مرثیہ خوانی ہے کوئی شخص یا نہایت کہ بڑے سے بڑا اشکک بھی علی الاعلان کسی کے مذہبی رسوم کی مخالفت کی جرأت نہیں کرسکتا مرثیہ لکھنا اور مرثیہ پڑھنا ہمیشہ سے ایک مذہبی کام سمجھا جاتا ہے ہر شیعہ شخص اپنی بڑی خوش نصیبی سمجھتا ہے اگر ایک بند بھی امام مظلوم کی شان میں یا ایک شعر جناب امیرؑ کی تعریف میں حصول ثواب کی نیت سے وہ کہہ دے۔ یہاں کے بادشاہ ایسے لوگوں کی قدردانی اس غرض سے کرتے تھے کہ لوگ اُن کو با مذہب خیال کریں درحالیکہ وہ سال بھر دنیاوی عیش و عشرت میں منہمک رہتے تھے ان کا خیال تھا کہ ایک مہینہ کی عزاداری سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی مگر علما اور شعرا مرثیہ کی قدر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے کرتے تھے اور اس کو ایک ادبی چیز سمجھتے تھے۔ بہرطور جو کچھ وجہ بھی ہو وہ زمانہ مرثیہ کے عروج کا زمانہ تھا۔

مرثیہ سے کیا کیا فائدے پہنچے

میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرثیہ میں نئی نئی ایجادیں کیں رزمیہ۔ سراپا، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی طولانی تعریفیں نئی نئی تشبیہات اور عمدہ تخیل کے ساتھ، مناظر جنگ، مع تفصیل جزئیات، غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں کا ترک، جن کو قدیم مرثیہ نویس مدت دراز سے برتتے چلے آتے تھے غرضکہ یہ اور اسی قسم بہت سی جدتوں کا سہرا میر ضمیر کے سر ہے مگر انیس و دبیر نے انھیں چیزوں

کو ترقی کی معراج تک پہنچایا اور اُن میں چار چاند لگائے حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے اس صنف شاعری کو ترقی کے آسمان تک پہونچا دیا اور اسی زمانے سے مسدّس جس میں عموماً مرثیے لکھے جاتے ہیں پُر جوش نیچرل نظموں کیلئے بھی مناسب خیال کیا جانے لگا "مد و جزر اسلام" حالی کا مشہور مسدس اسی عنوان پر ہے۔ سُرور جہاں آبادی نے بھی اسی صنف کو اپنی قومی اور نیچرل نظموں کا آلۂ کار بنایا۔ اگر غور سے دیکھئے تو آزاد۔ حالی اور سرور وغیرہ کی دلچسپ اور زور دار نظمیں سب مرثیہ ہی کی خوشہ چین اور رہین منت ہیں کیونکہ زمانۂ حال کے طرز میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو مرثیہ میں پائی جاتی ہیں مثلاً تمہید، تسلسل بیان، اعلیٰ جذبات کا اظہار، سلاست زبان، تشبیہات تخیل وغیرہ جو ہماری جدید شاعری کے بڑے عنصر ہیں، سب قریب قریب وہی ہیں جن کو مرثیہ کے استاد اب بہت پیشتر نہایت کامیابی سے برت چکے ہیں۔

قدیم طرز لکھنؤ کی مصنوعی اور مخرب اخلاق فضائے شاعری میں مرثیہ کی نمود اور اسکی سلاست و فصاحت اور ادب آموزی نے وہی کام کیا جو ریگستان میں ایک خوشنما سبزہ زار کرتا ہے۔ مرثیہ میں اس حقیقی شاعری کا پرتو ہے جو اعلیٰ جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے اسکی ادب آموزی ایسے وقت میں، جب دنیائے شاعری عیش پسند درباروں کی خوشامد اور تتبع میں نہایت ادنیٰ اور رکیک جذبات کی دَلدَل میں پھنسی ہوئی تھی، قابل صد ہزار آفریں ہے۔ ہرچند کوئی مرثیہ بلحاظ فن گرا ہوا ہو مگر پھر بھی وہ ایک اخلاقی نظم ضرور ہے اور اس معنی میں اس کے مفید ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اس کا مضمون ضرور عالی اور مقدس ہوگا۔ لہٰذا شاعر گو غزل میں وہ کیسا ہی پست اور لاابالی خیال ظاہر کرے مگر مرثیہ میں مناسبت مضمون کے خیال سے وہ ضرور سنجیدہ اور اخلاق آموز شعر کہنے پر مجبور ہوگا۔ شجاعت عالی ہمتی، عفت، انصاف وغیرہ کی تعریفیں، جو ہم اس افسانہ مصائب و غم میں برابر سُنتے رہتے ہیں، ہماری درستی اخلاق کے لئے اور ہم میں شریف اور اعلیٰ جذبات پیدا کرنے

کے لئے ازبس مفید اور ضروری ہیں۔ لڑائیوں کے ہوبہو نقشے، اسلامی نبرد آزماؤں کے تنہا مقابلوں کی جیتی جاگتی تصویریں، مبارزوں کی پُرجوش رجز خوانیاں، مخالفین کے جوابات، کفار کا قتل و قمع، کمزوروں کی اعانت و مدد، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو مرثیہ کی بدولت ہماری نظم اردو میں صنف ایک۔ (رزمیہ) کا بیش بہا اضافہ کرتی ہیں جس کی اس میں اب تک کمی تھی۔ ہمارے اُردو مراثی اکثر ایسے مکمل مرقعے پیش کرتے ہیں جو بلا تکلف دنیا کی بہترین رزمیات سے مقابلے کے لئے تیار ہیں۔ زبان کے ساتھ بھی مرثیہ کی خدمات نہایت بیش بہا اور عظیم الشان ہیں۔ چار پانچ لاکھ بیت جو انیسؔ اور دبیرؔ کہہ کے چھوڑ گئے ان سے ہماری زبان میں کیا کچھ کم قابل قدر اضافہ ہوا۔ پھر اس زمانہ سے اس وقت تک کے استعمال نے ان کو اور صاف کیا اور ما نحن فیہ الحق مرثیہ نے محدود میدان اُردو کو وسیع کیا اور زبان اُردو کے سلاح خانے میں ایک نہایت قیمتی اور ضروری حربہ اضافہ کیا۔

دیگر مرثیہ نویس اس زمانہ کے دیگر مرثیہ نویس میاں دلگیر اور فصیح تھے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس سے پیشتر میاں مسکین (جن کے مفصل حالات نہیں معلوم ہو سکے سوا اس کے کہ ان کا نام میر عبداللہ تھا) افسردہ۔ سکندر۔ گداؔ وغیرہ ہیں جن کے مرثیہ اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتے ہیں۔

خاندان انیسؔ یہ عجیب بات ہے کہ علم و فضل اور شاعری اس مشہور خاندان میں پشتہا پشت سے چلی آتی ہے اور اب تک ماشاء اللہ وہ سلسلہ جاری ہے۔ شغل شاعری باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی آئی ہے اور اب تک وہ روشن ہے۔ میر امامی (جو میر امامی موسوی ہردی کہلاتے ہیں) اس خاندان کے مورث اعلیٰ تھے اس کے بعد سلسلہ خاندان بصورت شجرہ حسب ذیل ہے:۔

میر امامی
|
میر عزیز اللہ
|
میر ضاحک
|
میر حسن

خلق — خلیق — محسن

(خلیق): میر انیس — میر مونس — میر اُنس

(میر انیس): نفیس — سلیس — میر عسکری رئیس

(میر اُنس): میر وحید

(نفیس): دختر زوجہ دولھا صاحب عروج
|
عارف

(سلیس): جلیس
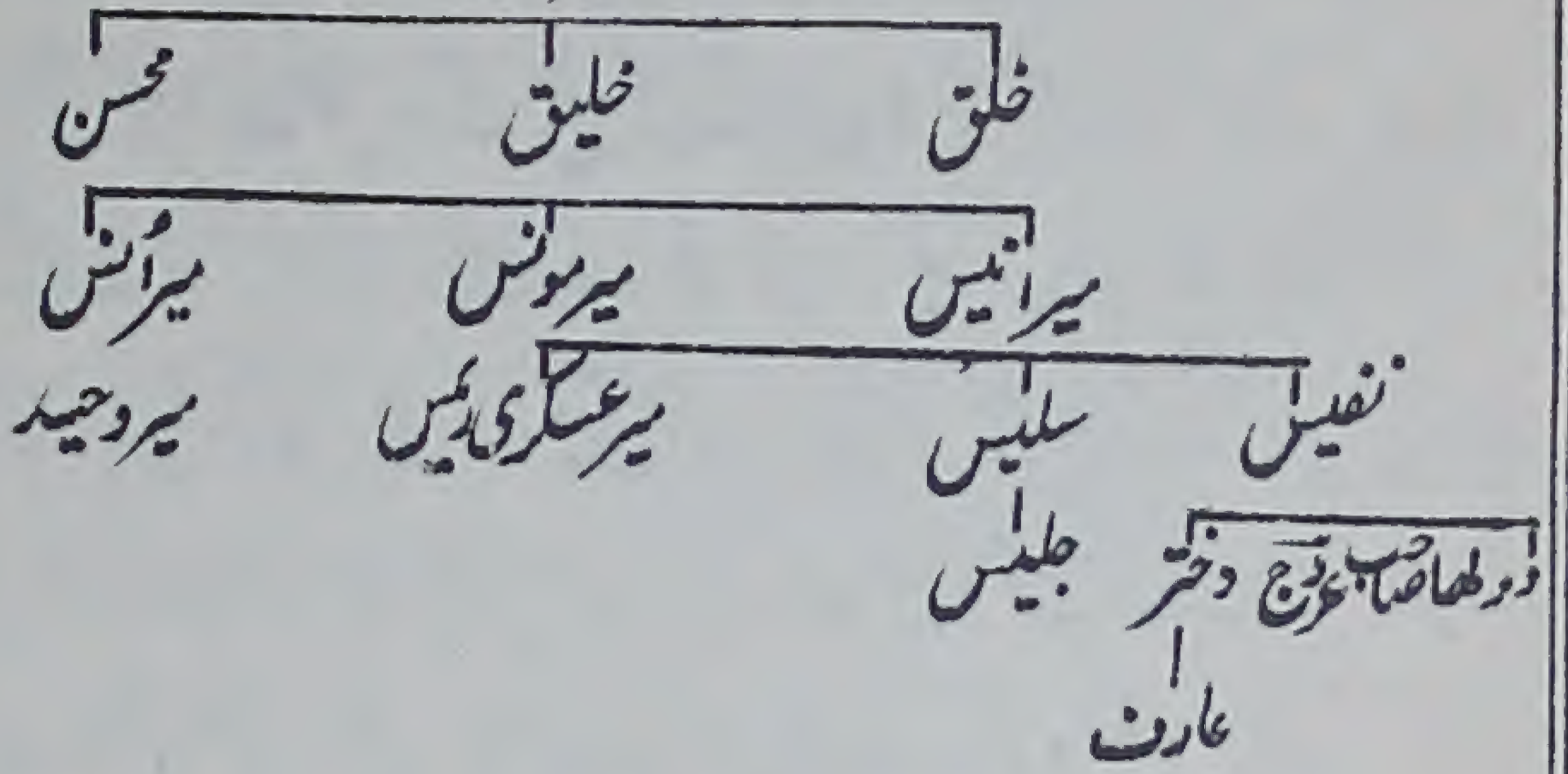
اس خاندان میں اصحاب ذیل کے کچھ مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں :۔

میر مونس | میر محمد نواب مونسؔ میر انیسؔ کے چھوٹے بھائی تھے اور بہت اچھا مرثیہ کہتے تھے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر میر انیسؔ کی طرح مشہور نہ تھے۔ مرثیہ نہایت مؤثر اور دلکش طرح سے پڑھتے تھے۔ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والی ریاست محمود آباد مرثیے میں ان کے شاگرد تھے اور ایک معقول شاہرہ دیتے تھے۔ میر مونسؔ کا انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی

میر نفیس | میر خورشید علی نفیسؔ میر انیسؔ کے بڑے صاحبزادے، اپنے بھائیوں میر سلیس اور میر رئیس سے زیادہ ممتاز اور زیادہ مشہور تھے۔ لائق باپ کے لائق فرزند تھے اور انھیں سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ ان سے میر انیسؔ بلکہ پورے خاندان کا نام روشن ہوا بہت خوش گو اور قابل تھے اور اپنے بعد ایک بڑا ذخیرہ مراثی وسلام ورباعیات وغیرہ کا چھوڑ گئے ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں بعمر پچاسی سال انتقال کیا۔

عارف | سید علی محمد عارفؔ سید محمد حیدر کے صاحبزادے میر نفیس کے نواسے تھے۔

میر علی محمد عارف

حیدرآباد میں میر نفیس لکھنوی کی ایک مجلس
میر نفیس وسط میں ھیں اور عارف انکے داھنی جانب ھیں

۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے اور اپنے نانا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی اور انھیں سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں والی ریاست محمود آباد اُن کے شاگرد ہیں اور مبلغ ایک سو پچیس روپیہ ماہوار سے ان کی خدمت کرتے تھے۔ عارف صاحب بہت بڑے زباندان تھے اور لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں ایک خاص درجۂ امتیاز ان کو حاصل تھا۔ ان کے مرثیے نہایت فصیح و بلیغ اور زوردار ہوتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں مثل پیارے صاحب رشیدؔ کے بہار و ساقی نامہ وغیرہ نہیں ہوتا وہ مرثیت کا زیادہ خیال رکھتے تھے ۱۳۳۴ھ میں بعمر ۷۵ سال انتقال کیا۔

جلیس | سید ابو محمد عرف ابو صاحب جلیسؔ میر سلیسؔ کے صاحبزادے پیارے صاحب رشیدؔ کے شاگرد تھے۔ ہونہار شخص تھے مگر افسوس ہے کہ جوانی میں ۱۳۲۵ھ میں انتقال کیا۔ مرثیہ اور غزل کہتے تھے۔ بالفعل اس خاندان میں دولھا صاحب عروجؔ (میر نفیسؔ کے صاحبزادے) اور فائقؔ (عارفؔ کے صاحبزادے) اور قدیمؔ (سلیسؔ کے صاحبزادے) موجود ہیں اور اپنے کلام سے اہل لکھنؤ اور دیگر شائقین کلام کو مستفیض اور محظوظ کرتے ہیں۔

سید مرزا اُنس کا خاندان | یہ خاندان بھی لکھنؤ کے مرثیہ گویوں کا ایک مشہور خاندان ہے اس کے بھی مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

سید مرزا اُنس | سید میرزا انسؔ سید علی میرزا کے صاحبزادے اور سید ذوالفقار علی میرزا کے پوتے تھے صاحب دیوان ہیں مگر اب تک ان کا کلام چھپا نہیں اور ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ہر اتوار کو اس زمانے کے بڑے بڑے شاعر مثل قلقؔ، بحرؔ، اسیرؔ، میر کلو عرشؔ وغیرہ کے بلاناغہ ان کے مکان پر جمع ہوتے تھے اور شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے نوابی میں سو روپیہ ماہوار ان کو خزانۂ شاہی سے ملتا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اُنس نے نواب منورالدولہ کی سفارش سے نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں بحیثیت داروغہ ملازمت کر لی تھی اور بہت عزت سے زندگی بسر کرتے تھے ۱۲۷۵ھ میں نواب کلب علیخاں

والی رامپور نے اُنس کو طلب کیا اور اپنے اُستاد منشی امیر احمد صاحب مینائی کو ان کے لینے لے واسطے لکھنؤ بھیجا۔ انس رامپور گئے مگر تھوڑے عرصہ کے قیام کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے جہاں ۱۳۰۲ھ میں بعمر ۹۵ سال قضا کی۔ چونکہ ان کا کلام چھپا نہیں لہٰذا اس کے متعلق کوئی رائے نہیں ظاہر کی جاسکتی۔ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ناسخ کے شاگرد اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے۔ عشق۔ تعشق۔ صبر۔ صابر اور عاشق۔

عشق | حسین مرزا عشق، معروف بہ میر عشق، اپنے زمانے کے نامی مرثیہ گو اور انیس و دبیر کے ہم عصر تھے یہ بھی مثل انھیں استادوں کے مرثیہ کے استاد مانے جاتے ہیں اور انکا کلام بہت اعلیٰ درجہ کا اور بے عیب ہے۔ سچ پوچھیے تو کلام کی عمدگی کے اعتبار سے ان کی شہرت کم ہے۔ ان کے پوتے عسکری مرزا مؤدّب جو اپنے چچا رشید کے شاگرد ہیں اب بھی موجود ہیں اور مرثیہ اچھا کہتے ہیں۔

تعشق | سید مرزا تعشق مرثیہ اور غزل دونوں کے استاد تھے۔ لکھنو میں سید صاحب کے لقب سے مشہور ہیں۔ ایک عرصہ دراز تک کربلا میں قیام کیا اور بعد اپنے بڑے بھائی میر عشق کے انتقال کے وہاں سے واپس آئے۔ مرثیہ اور غزل دونوں خوب کہتے تھے ناسخ کے شاگرد تھے اور ان کا کلام جذبات، حسن بندش، نزاکت خیال اور تاثیر کیلئے مشہور ہے۔ بعض لوگ تو ان کی نسبت بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ ایک فطری شاعر تھے اور ان کے کلام میں بہت سوز وگداز اور تاثیر ہے اور انکا مرتبہ اپنے زمانہ کے شعرا میں بہت بلند ہے میر انیس ان کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور انھیں کی صحبت سے یہ برابر فیضیاب رہے ۱۳۰۹ھ میں بعمر ۷۰ سال انتقال کیا۔

احمد میرزا صابر | یہ اپنے مشہور بیٹے پیارے صاحب رشید کی وجہ سے قابل ذکر ہیں ان کی شادی میر انیس مرحوم کی دختر سے ہوئی تھی جس سے دو مشہور خاندانوں کا اتحاد ہوگیا یہ واجد علی شاہ کے وظیفہ خوار اور نواب ملکہ جہاں کے داروغہ تھے۔ واجد علی شاہ

سید مرزا تعشق لکھنوی
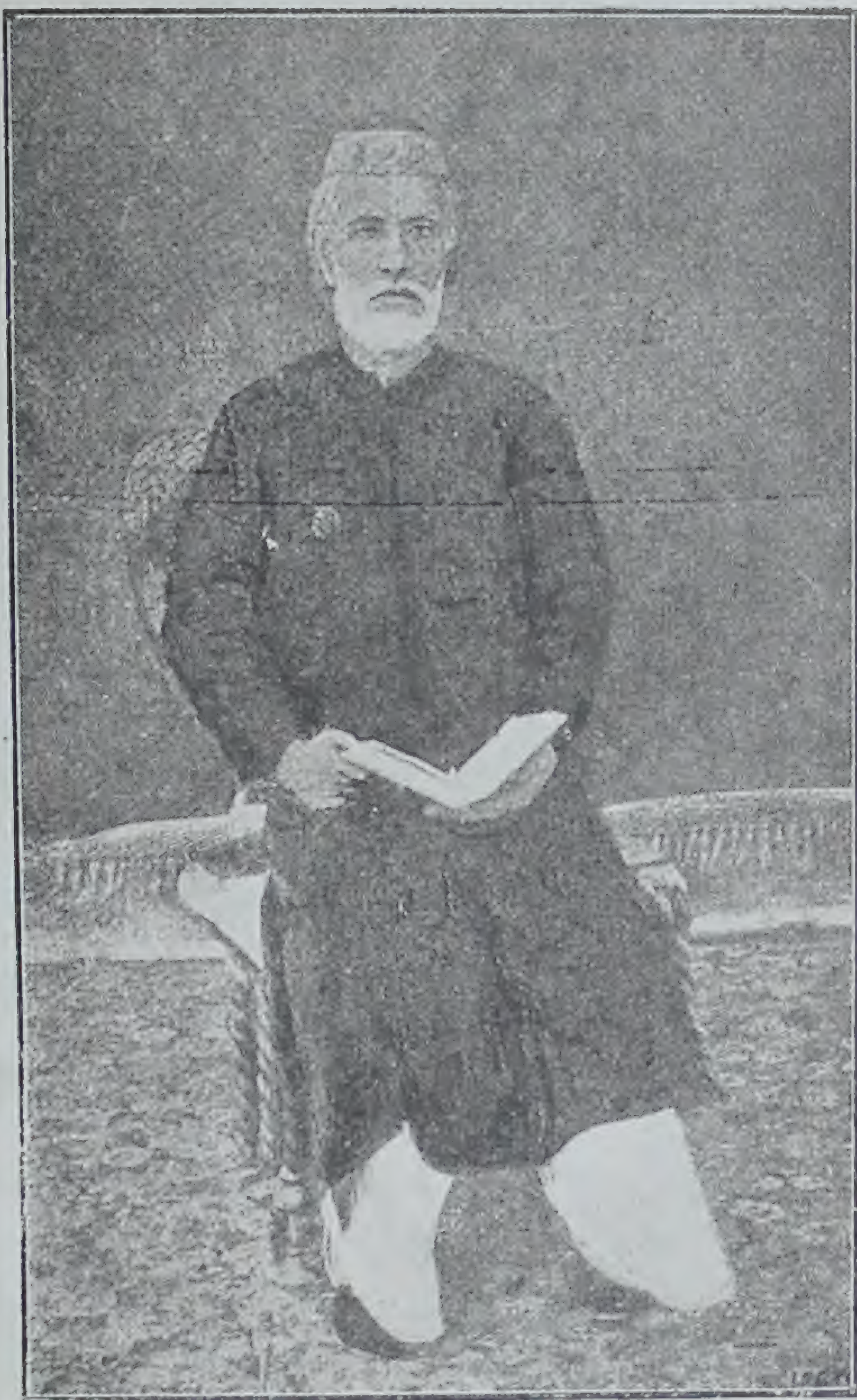
پیارے صاحب رشید

ان کو بہت مانتے تھے اور ان کو محل شاہی نواب زہرہ محل کی ڈیوڑھی کا دارغہ کردیا تھا جو منظوم خطوط بادشاہ اپنی محبوب بیوی کے نام بھیجتے تھے ان کے جوابات اسی طریقہ کی نظم میں ان کی طرف سے یہ قلم بند کرتے تھے ۷۰ سال کی عمر میں ۱۳۱۱ھ میں انتقال کیا۔

پیارے صاحب رشید | سید مصطفےٰ میرزا معروف بہ پیارے صاحب المتخلص بہ رشید ۱۲۶۳ھ میں پیدا ہوئے اور ضروریات زمانہ کے مطابق تعلیم پائی ان کی شادی میر عسکری رئیس خلف میر انیس کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اپنا کلام اپنے چچا میر عشق کو دکھاتے اور کبھی کبھی میر انیس سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ عشق کے بعد اپنے دوسرے چچا تعشق سے مشورۂ سخن کیا اور سچ پوچھیے تو انھیں کا رنگ ان کی غزلوں اور مرثیوں پر زیادہ غالب ہے رشید کی توجہ زیادہ تر زبان پر تھی اور اس میں وہ اپنے استاد انیس کے قدم بقدم چلتے تھے مرثیے، غزلیں، سلام، رُباعیاں، بکثرت لکھیں۔ کبھی کبھی قصیدے بھی کہے۔ ان کی غزلوں میں سلاست زبان، حلاوت اور پابندی محاورہ کا بہت خیال ہے مگر جدت خیال اور تاثیر کم ہے۔ ان کو فارسی ترکیبیں زیادہ پسند نہ تھیں، سلاموں میں غزلیت کا رنگ زیادہ ہے مگر رباعیاں کثرت سے ہیں اور واقعی بہت عمدہ ہیں علی الخصوص وہ رباعیاں جو بڑھاپے پر لکھی ہیں بہت موثر اور دلچسپ ہیں۔ رشید بحیثیت مرثیہ گو کے زیادہ مشہور ہیں مرثیہ میں انھوں نے دو نئی چیزیں یعنی ساقی نامہ اور بہار اضافہ کیں جس سے مرثیہ کی ادبی شان اور بڑھ گئی اور نفس مرثیہ میں کوئی خلل بھی نہیں آیا کیونکہ ایسے اشعار حسب موقع وہ رکھتے ہیں۔ ان سے پیشتر بھی اکثر استادان فن اس قسم کے اشعار مرثیوں میں کہہ گئے ہیں مگر رشید نے ان کو ایک ممتاز جگہ دی اور طول دے کر لکھا ۱۸۹۴ء میں نواب رامپور نے رشید کو سنا تھا۔ رشید پٹنہ عظیم آباد بھی گئے تھے جہاں ان کی بڑی قدر اور خاطر مدارات ہوئی۔ نواب بہرام الدولہ کے اصرار سے حیدرآباد دکن کا سفر کیا جہاں حضور نظام نے ان کا مرثیہ سنا اور بہت پسند کیا۔ اسی طرح کلکتہ اور دیگر مقامات میں بھی سفر کا اتفاق ہوا تھا

رشید کا انتقال بعمر ۸۰ سال ۱۳۳۶ ہجری میں ہوا۔ اپنے بعد بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں سے مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔ سید باقر صاحب حمید یہ ان کے بھائی تھے اور ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا، مودب، پروفیسر ناصری، جلیس مرحوم، اشہر مولف حیات رشید، شدید، ناظم، فرہاد وغیرہ۔

پیارے صاحب رشید لکھنؤ کی ادبی دنیا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور زبان کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کی خصوصیت یہ ہے کہ غزل اور مرثیہ دونوں خوب کہتے تھے۔

خدان دبیر مرزا اوج | مرزا دبیر کے صاحبزادے مرزا محمد جعفر اوج اپنے والد کے تتبع اور انھیں کے رنگ میں کہتے تھے۔ ان کی بھی پٹنہ، حیدرآباد اور رامپور وغیرہ میں بڑی شہرت تھی اور ان سب مقامات سے ان کی حسب لیاقت ان کی خدمت کی جاتی تھی۔ مرزا اوج بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے بہت بڑے زباندان اور عروض کے استاد سمجھے جاتے تھے چنانچہ ایک رسالہ بھی انھوں نے اس فن میں لکھا ہے خسرو دکن نے ان کو بھی سنا ہے۔

نعت | اس نظم کو کہتے ہیں جس میں پیغمبر اسلام کی مدح میں اشعار کہے جائیں بہت سے شاعر گذرے ہیں جنھوں نے اس صنف نظم میں بہت کچھ کہا ہے مگر ان سب میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی بہت مشہور ہیں۔

باب ۱۱

نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی

نظیر اکبر آبادی | ان کا تعلق کسی خاص دور سے نہیں ہے اور ان کا کلام بھی ایک

خاص رنگ رکھتا ہے لہذا اُن کا ذکر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی بعہد محمد شاہ ثانی تقریباً اس زمانے میں پیدا ہوئے جب نادرشاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ میرؔ و سوداؔ اور دیگر قدیم شعرائے دہلی کے معاصر کہے جا سکتے ہیں مگر چونکہ عمر زیادہ پائی تھی اس وجہ سے انشاؔ جرأتؔ اور ناسخؔ کا زمانہ دیکھا۔ یہ ان کی خصوصیت ہے کہ بسبب اپنی طویل عمر کے مختلف عہد کے شعرا ان کی نظر سے گذرے۔ ان کا طرز کلام بھی ایک عجیب رنگ رکھتا ہے۔ قدما میں ان کا شمار اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ ان کا اکثر کلام زمانہ حال کا معلوم ہوتا ہے۔ متوسطین شعرائے دہلی میں بھی یہ نہیں لئے جا سکتے۔ اس وجہ سے کہ ان کے کلام میں بہت آزادہ روی ہے اور انکے اور اُن کے مضامین اور انداز میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لکھنو کا قدیم طرز تو اُن میں کچھ نہیں گیا ہے کیونکہ ان میں ہنوٹ اور رنگینی جو طرز لکھنو کی خاص پہچان ہے مطلق نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح دور جدید کے شعرائے دہلی مثلاً غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ وغیرہ سے بھی یہ بالکل علیحدہ ہیں اس وجہ سے کہ ان کے یہاں سادگی ہے اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا ان کو مثل ان کے مطلق شوق نہیں ہے۔

نظیر کا نام ولی محمد اور ان کے باپ کا نام محمد فاروق تھا۔ نظیر کی ولادت شہر دہلی میں ہوئی چونکہ اپنے باپ کی بارہ۱۲ اولادوں میں صرف یہی بچے تھے لہذا باپ ان سے بہت محبت کرتے تھے احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیر اپنی ماں اور نانی کو لیکر آگرہ چلے گئے جہاں محلہ تاج گنج میں جو تاج محل کے قریب واقع ہے سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی شادی ایک عورت مسماۃ تہور بیگم دختر محمد رحمٰن سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکا خلیفہ گلزار علی اور ایک لڑکی امامی بیگم تھیں۔ نظیر فارسی کی معمولی قابلیت کے علاوہ تھوڑی بہت عربی بھی جانتے تھے اور فن خوشنویسی سے بھی واقف تھے جس کا اس زمانے میں بہت چرچا تھا نظیر کی طبیعت میں آسودگی اور قناعت اس درجہ تھی کہ انھوں نے

حسب الطلب نواب سعادت علی خاں لکھنؤ آنے سے اور اسی طرح بھرت پور کے جانے سے بھی انکار کردیا۔ اوائل عمر میں متھرا گئے تھے جہاں کسی جگہ معلمی کی نوکری کرلی تھی مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد آگرہ واپس آ گئے اور یہاں لالہ بلاس رام کے لڑکے کو بمشاہرہ سترہ روپیہ ماہوار پڑھایا کرتے تھے۔

آخر عمر میں مرض فالج میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی مرض میں بہت کبر سنی کی حالت میں ۱۶۔ اگست سنہ ۱۸۳۰ء کو انتقال کیا۔ جیسا کہ ان کے ایک شاگرد کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے[1]۔ لائل صاحب سنہ ۱۸۳۲ء اُن کا سنہ وفات بتاتے ہیں مگر کوئی سند نہیں دیتے ہیں۔

نظیر بہت صحبت پسند آدمی تھے اور مختلف قسم کے لوگوں کی سوسائٹی میں ملتے جلتے تھے اسی وجہ سے ان کا تجربہ بہت وسیع تھا جس سے انھوں نے اپنے اشعار میں بہت بڑا فائدہ اٹھایا ہے اُن کو گانے سے، کسرت سے اور سیر تماشے سے بہت شوق تھا۔ نہایت حلیم الطبع، منکسر المزاج، اور اسی کے ساتھ نہایت ظریف اور بامذاق واقع ہوئے تھے۔ کسی طرح کا تعصب اور خودبینی ان کے مزاج میں نہ تھی ہندو مسلمان سب ان کو مانتے اور سب ان سے محبت رکھتے تھے۔

جوانی میں البتہ بہت رنگین مزاج تھے اور عشق و عاشقی کا بھی ذوق رکھتے تھے کہا جاسکتا ہے کہ جس قدر کلام میں کلام اُن کے فواحش ہیں وہ اسی دور کی یادگار ہے مشہور ہے کہ ایک رنڈی سے جس کا نام موتی تھا، اُن سے تعلق تھا اور آزادانہ زندگی شاید اسی زمانہ میں بسر کرتے ہوں گے۔ اس زندگی کی جو جیتی جاگتی تصویریں اُن کے کلام میں موجود ہیں وہ یقیناً اسی عہد کی یادگار ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو فواحش کو

[1] وہ مصرع تاریخ یہ ہے ع مخمس بے سروپا۔ بیت بے دل۔ فرد بے سر شد۔

[1] خ + م + ب + ت + ر + د
۶۰۰ ۴۰ ۲ ۴۰۰ ۲۰۰ ۴
۱۲۴۶ھ

متتبع اکر کے ان میں بمثل مرقعے اس سوسائٹی کے ہیں جس میں وہ اس وقت ملتے جلتے تھے مگر بڑھاپے میں یہ باتیں سب بدل گئی تھیں، گذشتہ گناہوں سے توبہ کرکے وہ ایک صوفی صافی ہوگئے تھے۔ اس زمانے کا ان کا کلام نہایت قابل قدر اور پر اثر ہے بہت بہت پُرگو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے تھے مگر وہ سب کلام تلف ہوگیا بالفعل جس قدر موجود ہے اس کی تعداد تقریباً چھ ہزار شعر سے زیادہ نہ ہوگی اور یہ لالہ بلاس رام کی کاپیوں سے نقل کرکے لیا گیا ہے کیونکہ خود اُن کو اپنے کلام کے محفوظ رکھنے کی مطلق پروا نہ تھی۔

نظیر بحیثیت واعظ و ناصح اگر نظیر کے کلام میں سے ان کے معمولی اشعار نکال ڈالے جائیں تو ان کا شمار بڑے بڑے فلسفیوں اور ناصح شعرا میں ہوسکتا ہے۔ ان کے اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کامل دنیا و مافیہا کی بے ثباتی اور بے حقیقتی پر پُرزور لکچر دے رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کی تعلیم ہم کو دیتا ہے۔ جو رذائل اور معائب سے بالکل پاک ہے۔ انکی دس گیارہ ایسی دلچسپ اور موثر نظمیں ہیں جن کے اکثر اشعار فقیر اور سادھو لوگ خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کے ہمارے دلوں کو بیتاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں وہ "دنیا ہیچ ست و کار دنیا ہمہ ہیچ" کے پوری طرح سے قائل ہیں۔ وہ خیر و خیرات کے بہت معترف ہیں اور دنیا کو مزرع آخرت سمجھتے ہیں۔ اُن کی تمثیلیں بہت اعلیٰ اور دلکش ہوتی ہیں۔ ان کی نظم "موت پر" اور "بنجارہ نامہ" مغرور اور سرکش لوگوں کے لئے ایک تازیانہ عبرت ہے[1] اور ان کو آگاہ کرتا ہے کہ دنیا دارِ فانی ہے اس کو چھوڑو اور عاقبت کی فکر کرو۔ نظیر کا مقابلہ اس معنی میں شیخ سعدی سے خوب ہوسکتا ہے۔ کیونکہ دونوں کا کلام صاف اور سلیس اور دونوں میں تصوف کا رنگ ہے، دونوں عاشقانہ رنگ کے استاد اور دونوں

---

[1] مثلاً ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں ... "ٹک حرص" کی جو محبت تجھے تڑپاوے گی بابا "یا"، بٹ مارا اجل کا آ پہونچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا وغیرہ ۱۲۔

اپنی اپنی جگہ پر اور اپنے اپنے رنگ میں نصیحت گو بھی ہیں۔ نظیر چونکہ صوفی مشرب آدمی تھے لہذا اُن کو تمام مذہبی جھگڑوں اور مناقشوں اور نیز مذہبی پابندیوں سے بالکل بے تعلقی تھی، ان کی صوفیانہ نظمیں بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہیں اور اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کسی ان کا مقابلہ کسی دوسری زبان کے بہتر سے بہتر اخلاقی شاعر سے ہو سکتا ہے۔ وہ "مدالو حدۃ فی الکثرۃ" کے دل سے قائل اور ع۔ "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کے پورے عامل تھے اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں اُن سے دلی محبت رکھتے اور ان کو اپنا مرشد اور گرو سمجھتے تھے چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جنازے کے ساتھ ہزارہا ہندو شریک تھے اور اپنی رسم و رواج کے مطابق نہایت ادب اور احترام سے اس کو لے گئے۔ نظیر مثل گرو نانک کے ایسے تارک الدنیا فقیروں اور سادھوؤں کے خاص شاعر تھے جو لوگوں کو ترک ماسوا اللہ کا سبق دیتے ہیں۔ انگریزی شعرا میں یہی حال ورڈس ورتھ کا ہے جس کی سانٹ (غزل) "دنیا ہمارے ساتھ بہت ہے" بہت مشہور ہے نظیر کی وسیع النظری، آزاد خیالی، ہمہ گیری اور بے تعصبی، ایسی خصوصیات ہیں جو ان کے کلام کو تمام دوسرے شعرا کے کلام سے ممیز اور ممتاز کرتی ہیں

نظیر بحیثیت حقیقی ہندوستانی شاعر کے

نظیر کی ہمدردی و محبت بنی نوع انسان کے ساتھ محدود نہیں ہے بلکہ وہ حیوانات اور بیجان اشیاء سے بھی ایک خاص انس و محبت رکھتے ہیں ان کی نظمیں جانوروں کے متعلق مثلاً ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ، جنگ جانوراں، ہرن کا بچہ، بلبلوں کی لڑائی وغیرہ اسی قدر دلچسپ ہیں اور اس قدر جزئیات سے مملو ہیں کہ پڑھنے والے کو ان کی عام واقفیت اور ہمہ دانی پر تعجب ہوتا ہے اسی طرح چھوٹے بچے ان کی نظمیں مثلاً کبوتر بازی، پتنگ بازی، تربوز ع کیا وقت تھا وہ جب تھے ہم دودھ کے چٹورے" ع "کیا دن تھے تم بھی یارو جب ہم تھے بھولے بھالے" ہولی، دیوالی، بسنت، عید وغیرہ کو پڑھ کر باغ باغ

ہوتے ہیں۔ نظیر زندگی کے تمام لطفوں اور حظوں سے خوب بہرہ اندوز ہوتے
تھے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے تہواروں میں شریک ہوتے اور ان کے میلے ٹھیلوں
کی خوب سیریں کرتے تھے انھیں سیر تماشوں میں ان کا پائے تہذیب کبھی پھسل
جاتا ہے اور بے تکان وہ اُڑانے لگتے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ انھیں چیزوں
سے وہ مفید مطلب اور اخلاقی نتائج بھی نکالتے ہیں اور بقول شیکسپیر
"پتھر سے وعظ سنتے ہیں اور ہر چیز میں اچھائی دیکھتے ہیں" یہ انکی خصوصیت
ہے کہ انھوں نے دنیا کے مختلف اشغال اور کھیل تماشوں کا حال اس
مزے سے اور ایسے جوش مسرّت کے ساتھ لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے
بچوں کی طرح وہ خود اُن سب میں شریک ہیں پھر معمولی چیزوں کو ایسی دلچسپ
تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ بغیر تعریف کئے رہا نہیں جاتا۔ ان کی معلومات
غیر محدود۔ اُن کا خزانۂ لغات غیر مختتم، اور ان کی صفائی بیان دلکش ہے ان کے
مزاج میں چونکہ مذہبی تعصب اور ناروا داری نہ تھی بلکہ کٹّرپن کو وہ نہایت نفرت
اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اسی وجہ سے وہ ہندوؤں سے بہت خلط ملط
رکھتے تھے اور ان کے رسم و رواج ان کی زبان، ان کے خیالات، انکے تہوار اور انکے
معتقدات تک کو ایسے دلچسپ طریقہ سے اور اس قدر صحت کے ساتھ بیان کرگئے ہیں
کہ ہم کو اُن کی ہمہ دانی پر تعجب معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مذہب کی چیزوں کے ساتھ
کبھی تمسخر نہیں کرتے اور نہ انکو حقارت کے ساتھ دیکھتے ہیں، اسی سے انکے کلام میں ایک
مقامی رنگ ہے جو اکثر ہمارے شعرائے اردو میں کمیاب بلکہ نایاب ہے البتہ کہیں کہیں
سوداؔ، اور انشاؔ کے کلام میں اس کا پتہ چلتا ہے۔ نظیرؔ ایک خالص ہندوستانی شاعر تھے
کیونکہ اُن کے خیالات، ان کی زبان، اُن کے مضامین سب مقامی رنگ میں
ڈوبے ہوئے تھے۔

ان کی خدمت زبان کے ساتھ

اُن کی خدمت زبان کے ساتھ بہت قابل قدر ہے۔ انھوں نے ایسے الفاظ سے بہت فائدہ اٹھایا جن کو شعرا ادنیٰ اور بازاری سمجھ کے چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ ایسے الفاظ مروّجہ مضامین شعر سے میل نہیں کھاتے اس وجہ سے عام شعرا ان کو سوقی اور سوقیانہ سمجھ کے ترک کرتے ہیں اور شعر میں ان کو داخل کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ نظیر نے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جن کو ظاہر میں نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ البتہ اس میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے سب الفاظ اُس عزت کے مستحق نہیں تھے جو ان کو حاصل ہوئی مگر بہت سی چیزیں باوجود مخالفت اور احتیاط کے بھی ادبی دنیا میں داخل ہو گئیں۔ نظیر کی مستعملہ لغات تین قسموں پر تقسیم کی جا سکتی ہیں :-

(۱) ایسے الفاظ جو ان کے ابتدائی رنگ کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور اب بالکل خلاف تہذیب سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) ایسے الفاظ جو معمولاً اُردو شاعری کے مایۂ انبساط ہیں۔

(۳) وہ جواہر ریزے جن سے حُسنِ شعر بڑھ جاتا ہے اور خزانۂ زبان مالا مال ہو جاتا ہے

نظیر پر بحیثیت شاعر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے بلکہ ایک معمولی غلط گو شاعر تھے اور اپنے اشعار سے بازاری لوگوں کا دِل خوش کیا کرتے تھے اُن کا کلام غیر مہذّب بلکہ فحش درجہ تک پہونچ جاتا ہے اور انھوں نے اپنے عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ کی آمیزش سے ہماری زبان کو غارت کر دیا۔ ان الزامات کے متعلق ہم آگے لکھیں گے مگر بالفعل مختصر طور پر اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو نظیر کی خامی اور کمزوری سمجھی جاتی ہے وہی ہماری رائے میں

فی الحقیقت انکی بڑی خصوصیت اور صفت ہے۔ مثلاً وہ ایسی معمولی چیزیں اور مناظر (میلے ٹھیلے وغیرہ) جن کو عام لوگ پسند کرتے ہیں دیکھنے کے بہت شائق تھے اور ان کے بیان کے لئے اُن کو عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ کی ضرورت تھی لہذا ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات اور جذبات اور ان کی بول چال کو خود انھیں کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو فلسفیانہ نظر سے یا دُور سے کھڑے ہو کر بطور تماشہ کے دیکھنا نہیں چاہتے نہ ان میں کوئی نقص یا اعتراض نکالنا چاہتے ہیں بلکہ وہ ان کا سچا فوٹو من وعن کھینچ دیتے ہیں وہ ایسے منظروں اور مجمعوں کو حکیمانہ یا جارحانہ نظر سے نہیں دیکھتے اسی وجہ سے ان کا بیان ان چیزوں کا نہایت دلچسپ اور نیچرل ہوتا ہے۔ تصنع اور بناوٹ ان کے کلام میں مطلق نہیں ہوتی۔ حالی نے شائد اسی کثرتِ الفاظ کے خیال سے نظیر کو میر انیس پر ترجیح دی ہے نظیر ایسے موقعوں پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتے بلکہ خود اُن میں شریک ہو کر ان سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جس طرح کسی کی ہجو نہیں کہی اسی طرح کسی کی تعریف میں کوئی قصیدہ بھی نہیں لکھا۔ یہ دونوں باتیں ہمارے نزدیک ان کے کلام کا بہت بڑا جوہر ہیں اور ان لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہیں جو ابتدائے عمر میں ان سے سرزد ہوئی ہوں گی۔

نظیر جدید رنگ کے پیشرو تھے — یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ زمانۂ موجودہ کی نیچرل اور قومی شاعری، جس کی ابتدا مولانا آزاد اور حالی وغیرہ سے کہی جاتی ہے اس کے پیشرو بلکہ موجد نظیر اکبرآبادی کہے جا سکتے ہیں۔ جس طرح انیس اور دبیر نے فاضلانہ قابلیت کے ساتھ مناظر جنگ اور مناظر قدرت کے بہتریں مرقعے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں۔ اسی طرح نظیر نے بھی معمولی معمولی چیزوں کی ہو بہو تصویریں، جن کی گنجائش شعر میں مطلق نہ تھی، سیدھے سادے مؤثر الفاظ میں کھینچ دی ہیں جس سے ان کا کلام عوام الناس

ہیں بہت مقبول ہے۔ اس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فارسی کے دقیق لفظ اور ترکیبیں اور پیچیدہ تشبیہیں اور استعارے ان کے کلام میں کہیں نہیں۔ ان کی تحریر سادہ اور بے تکلف، اور ان کا بیان صاف اور اصلیت کے مطابق ہوتا ہے۔ مگر مجرد نیچر کی پرستش سے وہ ناواقف ہیں، جنگلوں اور پہاڑی چوٹیوں کا حال اُن کے یہاں نہیں ہے۔ قدرتی مناظر کا فوٹو وہ صرف اسی حالت میں کھینچتے ہیں جب ان مناظر کا تعلق انسان سے ہوتا ہے، مثلاً باغوں میں روضۂ تاج گنج کو انھوں نے منتخب کیا۔ ان کی نظمیں برخلاف معمولی اُردو نظموں کے مسلسل ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے کلام میں وہ وسیع النظری اور گہرائی نہیں ہے جو متاخرّین شعرائے دہلی کے کلام میں ہے۔ غرضکہ اپنے سادہ بیان سے اپنے بے تکلف مگر پُر زور الفاظ سے، اپنے عام دلچسپی کے مضامین سے اپنے دلکش اشعار سے جن میں تصنع اور یکرنگی کا نام نہیں، نظیر اکبر آبادی ایک ایسے طرز کی بنا ڈال گئے جو آگے چل کر ہماری زبان اور ادب کی ترقی بلکہ ہمارے قومی احساس کے از سر نو زندگی کا بہت بڑا باعث ہوا۔

نظیر کا ظریفانہ رنگ، انکا مقابلہ انشا کے ساتھ

نظیر کا ظریفانہ رنگ خاص ہے اور عجیب قسم کا ہے اس رنگ کی ترقی کا باعث ان کا عام لوگوں کے ساتھ میل جول اور ربط ضبط ہے۔ چونکہ وہ عام لوگوں سے بے تکلفانہ اور مساویانہ ملتے تھے اور ان کے شادی وغم میں برابر شریک رہتے تھے لہذا ان کو فطرت انسانی کے مطالعہ کا خوب موقع ملتا تھا اور معلومات کے ساتھ ان کی خوش طبعی اور ظرافت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ افلاس اور مصیبت کی تکلیفوں کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور بطھارے حوادث کو اپنے مذاق میں اڑا دیتے تھے۔ ان کی ظرافت نہ تکلیف دہ ہے نہ اُس میں شہدپن ہوتا ہے۔ نظیر اور انشا دونوں اپنے اپنے رنگ میں ظرافت کے استاد تھے مگر ان دونوں کی ظرافتوں میں فرق ہے انشا کی ظرافت ایک

ایسے درباری کی ظرافت ہے جو پُر مذاق باتوں سے اپنے مالک کو خوش کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں وہ بھانڈوں کی طرح اپنی اور دوسروں کی بے عزتی کی بھی مطلق پروا نہیں کرتا ہر چیز کو اپنے آقا کی خوشنودی مزاج پر وہ قربان کر دیتا ہے۔ نظیر ایک آزاد ظریف ہے جو اپنی بامذاق باتوں سے کسی کو رنج دینا نہیں چاہتا نہ کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے اور سب کو خوش رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ انشا کی ظرافت میں خوشامد اور بھبتی کی بو آتی ہے اور نظیر ان عیوب سے پاک ہے۔ باوجود اس کے انشا اور نظیر میں کئی باتوں میں مماثلت بھی ہے دونوں شاعروں نے مشکل مشکل ردیف اور قافیوں میں طبع آزمائی کی ہے اور بعض غزلیں ہمطرح بھی کہی ہیں دونوں عربی مصرعے اشعار میں کامیابی کے ساتھ موزوں کرتے ہیں دونوں کے کلام میں مقامی رنگ یعنی ہندی الفاظ اور ہندی رسم و رواج وغیرہ کثرت سے ہیں، دونوں نے مختلف زبانوں میں شعر کہے، دونوں کے کلام میں تصوف کا سنہرا رنگ جلوہ گر ہے۔ زبان کے بارہ میں دونوں آزاد ہیں مگر فارسی اور عربی الفاظ صحت کے ساتھ استعمال کرنے میں انشا مشاق ہیں اور مقابلہ نظیر کے ان کے یہاں متروکات کم ہیں اور ان کی ظرافت کا رنگ بہت زیادہ گہرا ہے۔

نظیر بحیثیت مصوّر کے چونکہ نظیر کو فن موسیقی سے بہت شوق تھا اس لئے ان کو انتخاب الفاظ میں اس فن سے بہت مدد ملی۔ وہ ایک آرٹسٹ اور بہت بڑے مرقع نگار ہیں ان کو اپنے اشعار کے واسطے انتخاب الفاظ میں وہی انہماک تھا جو انگریزی شاعر ٹینیسن کو تھا۔ وہ صنعت تجنیس کے بہت شایق ہیں اور اکثر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کی آواز سے اظہار مطلب ہو جاتا ہے۔ مثلاً لڑائی بھڑائی کے موقع پر وہ ثقیل حروف لاتے ہیں۔ شادی و مسرت کی محفلوں اور تہواروں کے بیان میں انھیں کے مناسب سریلے اور دلکش الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دوراز کار تشبیہات انکے کلام میں کم ہیں، اور دیگر صنائع بدائع بھی نہایت اعتدال سے ہیں۔ اور آورد

وغیرہ سے ان کا کلام پاک ہے۔

اردو کا شیکسپیر ہمارا کون شاعر ہو سکتا ہے

یہ سوال بہت دلچسپ ہے کہ اردو کا شیکسپیر ہمارا کون شاعر ہے اصل یہ ہے کہ ڈراما کا وجود اہل عجم میں تھا ہی نہیں اور نہ ہمارے اردو شعرا نے اسکو سنسکرت سے اخذ کیا۔ سودا اپنی اعلیٰ درجہ کی طباعی، اپنی زبردست شخصیت اپنی عام واقفیت اور قدرت زبان کی وجہ سے ضرور قابل لحاظ ہیں۔ انھوں نے بے مثل ہجویں لکھی ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک زبردست کمیڈی نگار ہو سکتے تھے مگر ان میں ٹریجڈی لکھنے کا مادہ، یعنی فطرت انسانی کے ساتھ ہمدردی اور اس کا وسیع علم بہت محدود ہے۔ میرؔ کی حالت یہ ہے کہ سوز و گداز تو ان کے یہاں بدرجۂ اتم ہے مگر کیرکٹر نویسی سے وہ ناواقف ہیں۔ سوائے غزل اور مثنوی کے دیگر اصناف سخن اور نیز دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ان کی واقفیت بہت محدود ہے۔ انشاؔ کے یہاں تمسخر اور ظرافت کی بہتات ہے اور وہ اپنی قوت نقالی اور قدرت زبان کی وجہ سے خود ایکٹر بننے کے لئے زیادہ موزوں تھے مگر ان کے درباری تعلق نے ان کو ایک دوسری راہ پہ لگا دیا اور تعمق خیال بھی ان میں بہت کم ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ گو فطری شاعر تھے زبان پوری طرح قدرت حاصل تھی کیرکٹر نویسی کے بھی مشاق تھے۔ مگر ان کا دائرہ عمل محدود ہے۔ یعنی وہ محض مرثیہ نگار تھے۔ اور یہ تخصیص ان کے واسطے قوت اور کمزوری دونوں کا باعث تھی۔ ایرانی پیشن پلے (یعنی تعزیہ داری وغیرہ) جس کا مقابلہ مریکل (معجزات) کے ڈراما اور مسٹری (مذہبی اسرار) کے ڈراما سے کیا جا سکتا ہے۔ باقاعدہ ڈراما سے قریب ترین اور یہی انیسؔ و دبیرؔ کے موضوع ہیں لیکن اس مذہبی جوش سے جو اُن کی نظموں میں سرایت کئے ہوئے ہے معمولی معمولی کیفیات و جذبات انسانی نظرانداز ہوتے رہے۔ نظیرؔ کو بھی مثل سوداؔ۔ انشاؔ اور انیسؔ کے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی، اُس کی خصائل انسانی کی معلومات اکثر شاہیر شعرا سے بڑھی تھی وہ ہندو اور مسلمان، بچے اور بوڑھے، امیر و غریب، خواص و عوام

دُنیا دار تارک الدُنیا سب سے ملتا جلتا تھا اور سب کا دوست اور بہی خواہ تھا عورتوں کا علم بھی اس کو کافی تھا۔ گو اسکے یہاں ایسے مرقعے جیسے شکسپیر کے یہاں ایموجن، ڈسڈیمونا پورشیا، اور افیلیا، کے ہیں موجود نہیں ہیں جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہماری ہندوستانی سوسائٹی میں پردہ کا رواج ہے اور عورتیں آزادی کے ساتھ مردوں سے نہیں مل سکتیں. اور اسی وجہ سے نظیر کو مُعزز عورتوں سے ملنے اور ان کے خیالات اور جذبات دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اس کو صرف شاہدانِ بازاری کا تجربہ ہوا لہٰذا اس کے اشعار میں اسی مخصوص جماعت کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں. اس کو کیرکٹر نگاری کا بڑا ملکہ تھا اور قوت بیانیہ بھی بڑے غضب کی پائی تھی مگر شکسپیر کی طرح اس کے خیالات میں عمق نہیں ہے اور نہ شیکسپیر کی ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اس میں ہے اسکی دو نظمیں ایسی ہیں جن مین ڈراما کی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں گو وہ پوری طرح ڈراما نہیں کہی جاسکتیں۔ ایک "لیلےٰ مجنوں" جو ٹریجڈی ہے اور دوسری "مہادیو کا بیاہ،، جو اپنے انبساطی رنگ کی وجہ سے کمیڈی کہے جانے کی مستحق ہے اسی طرح اسکی نظمیں "ریچھ کا بچہ،، اور "بلبلوں کی لڑائی،، نہایت مزے کی اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ نظیر میں سوداؔ کا زور، میرؔ کی بلند پروازی انشاؔ کی ظرافت، انیسؔ و دبیرؔ کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ سب صفات اس میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔

نظیرؔ کی سب سے بڑی صفت یہ ہے۔ کہ وہ معمولی معمولی چیزوں کے بیان میں ایسی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جو دوسروں کے یہاں اعلیٰ مضامین میں بھی نہیں پائی جاتی۔ جب غزل کی یکرنگی اور قصیدہ کی لفاظی سے جی اُکتا جاتا ہے تو نظیرؔ کے اس قسم کے مضامین بہت پسند آتے ہیں۔ اس نے شعر میں نئے نئے مضامیں اختیار کئے اور ادب اُردو کو بہت وسعت دی۔ یہ سچ ہے کہ وہ کوئی فاضل شاعر نہیں اور نہ وہ کیفیت اشیاء کو فلسفیانہ طریقہ سے یا بہت گہرائی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ

فحش بھی کہہ جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر اس کی صاف بیانی سے تہذیب کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ وہ بڑے پایہ کا شاعر بھی نہ سہی۔ اور اس کے کلام میں بعض جگہ متروکات و اغلاط بھی ضرور ہیں۔ زبان اور خیالات بھی بہت شستہ و رفتہ نہیں۔ مگر باایں ہمہ وہ ایک خالص ہندوستانی شاعر ہے اور ہندوستانی مضامین پر لکھتا ہے۔ ہندوستانی جذبات اس کے دل میں جوش زن ہیں اور وہ مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بالکل پاک و صاف ہے۔ اپنے تنوع مضامین، اپنی ناصحانہ روش، اپنی وسیع النظری، اپنی ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی، اپنی خالص ہندوستانیت اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیر پوری طرح اس کا مستحق ہے کہ اس کو شعرائے اُردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے۔

شاہ نصیر دہلوی متوفی ۱۸۴۰ء

شاہ نصیر کا شمار مثل نظیر اکبرآبادی کے زبان اور زمانہ دونوں اعتبار سے طبقہ متقدمین میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر اِن کو شہرت شعرائے متوسطین کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اس لئے ان کو دَور متقدمین و متوسطین کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیئے۔ نصیر الدین نام نصیر تخلص اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے میاں کلّو کے عرف سے مشہور تھے۔ شاہ غریب کے بیٹے دِلّی کے رہنے والے تھے، باپ ایک گوشہ نشین فقیر تھے اور جو آمدنی چند مواضعات جاگیر سے ہوتی تھی اس پر بسر اوقات تھی۔ ہر چند کہ غریب باپ نے تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی مگر نصیر کو سوائے شاعری کے اور کچھ نہ آیا۔ شاعری کی طرف ان کا رجحان بچپن سے تھا۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہو گئے جو شیخ قیام الدین قائم سے اصلاح لیتے تھے اور اس نسبت سے شاہ نصیر کو سودا اور خواجہ میر درد سے بھی ایک تعلق شاگردی پیدا ہو گیا تھا۔ خاندانی وجاہت اور نیز شاعری کی وجہ سے شاہ عالم کے دربار میں نصیر کی رسائی ہو گئی۔ جہاں ان کی خوب ہوتی تھی اور انعام و اکرام سے بھی سرفراز ہوتے تھے شاہ نصیر نے سفر بہت کئے

نظیر اکبر آبادی

مومن دہلوی

اور اکثر شہروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ علی الخصوص لکھنؤ اور حیدرآباد متعدد مرتبہ گئے تھے۔ اپنے وطن دہلی میں اپنے مکان پر اکثر مشاعرے کرتے تھے جن میں اس زمانہ کے مشہور شعرا جمع ہوتے تھے۔ ایسے ہی مجمعوں میں ان کے شاگرد ذوقؔ کو اپنی ابتدائی بلند پروازیوں کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملتا تھا۔

جب دلی میں تباہی آئی اور شعرا اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے تو شاہ نصیر بھی ہر اول ڈھونڈھنے باہر نکلے دو مرتبہ لکھنؤ آئے اور چار مرتبہ حیدرآباد گئے۔ لکھنؤ میں جب یہ پہلی مرتبہ پہونچے تو مصحفیؔ انشاؔ اور جرأتؔ کا زمانہ تھا جن سے خوب خوب مقابلے رہے[1]۔ دوسری مرتبہ ناسخؔ اور آتشؔ کا آوازۂ سخن بلند ہو رہا تھا۔ ناسخؔ سے بھی ان سے مقابلے ہوئے اور یہ کامیاب ہوئے[2]۔ حیدرآباد جانے کی یہ تقریب ہوئی کہ دیوان چندو لال جو شاداںؔ تخلص کرتے تھے اور اہل کمال خصوصاً شعرائے دہلی کے بڑے قدرداں تھے ان کی داد و دہش کا شہرہ سن کر یہ وہاں پہونچے۔ مشہور ہے کہ دیوان موصوف نے ذوقؔ اور ناسخؔ کو بھی حیدرآباد بُلا بھیجا تھا مگر انھوں نے انکار کیا۔ شاہ نصیر نے اپنے حیدرآباد کے قیام میں بہت سے شاگرد جمع کر لئے اور ان کے سبب سے وہاں بازار شاعری بہت گرم ہو گیا تھا۔ بالآخر چوتھی مرتبہ جب وہ حیدرآباد گئے تو چند روز قیام کر کے سنہ ۱۲۵۴ھ مطابق سنہ ۱۸۳۸ع میں وہیں انتقال کیا[3]۔

تصانیف شاہ نصیر ایک پُرگو شاعر تھے ساٹھ برس تک مشغلۂ شعر میں منہمک رہے اس طویل مدت میں ایسے ذہین و ذکی شخص نے جو اسقدر شاعری کا دلدادہ ہو گیا کچھ نہ کہا

---

[1] دیکھو "بدن سُرخ ترا"، "چمن سرخ ترا"، والی غزل مصحفی کے حالات میں اور اسی طرح میں شاہ نصیر کی غزل ان کے حالات میں آبحیات میں ۱۲
[2] تذکرۂ گل رعنا میں لکھا ہے کہ ایکی مرتبہ جیسی ان کی قدر ہونا چاہیئے تھی نہیں ہوئی ۱۲
[3] قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ ایک شاگرد نے "چراغ گل" کے الفاظ سے تاریخ نکالی (آبحیات ذکر شاہ نصیر) ۱۲

ہو گا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا اکثر کلام تلف ہو گیا۔ اس لئے کہ ان کو کلام کے جمع کرنے اور حفاظت سے رکھنے کی عادت نہ تھی۔ ان کے ایک شاگرد مہاراج سنگھ نے ان کا کچھ کلام بصورت دیوان کے جمع کیا جس میں تقریباً ایک لاکھ شعر کہے جاتے ہیں۔ مگر بعض اصحاب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کے دیوان کی ترتیب میر عبدالرحمٰن خلف میر حسین تسکین شاگرد مومن نے کی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ نواب صاحب رام پور نے اپنے کتب خانہ کے لئے خرید کیا تھا۔

شاہ نصیر نہایت متین و مہذب مگر اس کے ساتھ ہی بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ سیکڑوں شاگرد دہلی لکھنو اور حیدرآباد میں چھوڑے حنفی المذہب تھے مگر تعصب مطلق نہیں رکھتے تھے۔ آخر آخر میں اپنے مایۂ ناز شاگرد ذوق سے چشمک ہو گئی تھی۔ کیونکہ کثرت مشق نے ذوق کے دل میں ایک قسم کی انانیت پیدا کر دی تھی اور وہ سودا و میر ایسے باکمالوں کی برابری کا دعویٰ کرنے لگے تھے۔

ان کا مرتبہ شاعری میں	شاہ نصیر کی خصوصیت یہ ہے کہ سنگلاخ زمینوں اور مشکل

ردیف و قافیہ میں غزلیں کہتے تھے جن میں اچھے شعر نکالنا ہر کسی کا کام نہیں۔ مثلاً

شب کو کیونکر تجھ کو ہے پھبتا سر پہ طرّہ ہار گلے میں	
	جوں بر دین دہالۂ مہ تھا سر پہ طرّہ ہار گلے میں
بادہ کشی کے سکھلاتے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں	
	کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مہینے ساون بھادوں
وقت نماز ہرا انکا قامت گاہ خدنگ و گاہ کماں	بنجاتے ہیں اہل عبادت گاہ خدنگ و گاہ کماں

ولہ

خالِ پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی	روح فرہاد ہے پٹ بن کے جبل کی مکھی

شکوہ الفاظ کے بھی عاشق تھے۔ ان کے بعض استعارات اور تشبیہیں بہت نادر اور دلچسپ ہوتے ہیں[1] مثل صائب کے مثالیہ اور اخلاقی مضامین بھی خوب باندھتے ہیں۔ فی البدیہہ کہنے میں بھی مشاق تھے۔ علمی استعداد کم رکھتے تھے اور کہیں کہیں متروک الفاظ بھی نظم کر گئے ہیں۔ گو کہ کلام میں زور و اثر ہے مگر بلند پروازی اور اعلیٰ خیالات کم ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا مین ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں البتہ اپنے زمانہ کے استاد تھے اور صدہا لائق شاگرد چھوڑ گئے۔

---

[1] مثلاً۔ دیہات جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے اور کچھ رنگترے دلی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! رنگتروں کی تکلیف کیا ضرور تھی آپ کی طرف سے بڑا تحفہ آپ کا کلام ہے ان رنگتروں کی حسنِ تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمائیے۔ اسی وقت رباعی کہی اور سنائی ؎

اے نیر برج آسمان اقبال ان رنگتروں پر غور سے کیجئے گا خیال
یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر پردہ میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

(آبحیات ذکر شاہ نصیر)

باب ۱۲

طبقہ متوسطین شعرائے دہلی

ذوق و غالب کا زمانہ

دلی کی شاعری کا دوبارہ عروج

دلی کا از سر نو پھر عروج ہوا۔ صفحات گذشتہ میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اُردو شاعری کا مرکز ترقی دلی سے لکھنؤ منتقل ہو کر آگیا تھا۔ لیکن قدما کی تخم ریزی بیکار نہیں گئی ان کی کوششیں سرسبز ہوئیں اور وہ درخت جس کو دلی کے قدیم شاعروں نے بڑی کدوکاوش سے سینچا تھا اب وہ نئے سرے سے پھیلنا شروع ہوا۔ دنیا میں مد و جزر، ترقی و تنزل اور تنزل و ترقی کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے یہی دلّی کا بھی حال ہوا۔ تھوڑے عرصہ کی خاموشی کے بعد شاعری دہلی کی بلبل ہزار داستان نے پھر نغمہ سرائی شروع کی۔ اور تمام اُردو داں پبلک کو اپنی خوشنوائیوں کا گرویدہ بنا لیا، غالبؔ، ظفرؔ، ذوقؔ۔ مومنؔ وغیرہ اس دور کے نامی گرامی شعراء ہیں۔ غالبؔ کی خداداد ذہانت اور طباعی کا مقابلہ تو دنیا کے بہترین شعراء سے کیا جاسکتا ہے ذوقؔ و مومنؔ گو کہ غالبؔ کے مقابلہ میں نہیں چمک سکتے تھے مگر پھر بھی اپنے معاصرین میں بہت نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ ظفرؔ بھی کوئی معمولی درجہ کے شاعر نہ تھے اور چونکہ مشاغل حکمرانی کی زیادہ فکر نہیں رکھتے تھے اس لئے شعر کے شغلہ سے دل بہلاتے رہتے تھے، وہ ذوقؔ و غالبؔ کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ کے شعرائے دہلی جدید طرز لکھنؤ کے بالکل تبع نہ تھے جہاں تصنع تکلف اور رعایت لفظی وغیرہ شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی انکا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے مملو ہے غالبؔ اور مومنؔ کے یہاں فارسی الفاظ و محاورات کثرت سے ہیں اس وجہ سے کہ وہ فارسی کے بڑے زباں داں اور شاعر تھے۔ ان حضرات کے ابتدائی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدما کی

سیدھی سادی ہندی ترکیبیں نکال کر اُن کی جگہ فارسی الفاظ رکھ دیئے ہیں۔ اس زمانہ کا
ان کا کلام محض فارسی الفاظ کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے ہندی لفظ اور محاورے یہ اسی
وقت استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کسی فارسی لفظ یا ترکیب کے ساتھ میل کھاتے تھے اور
کلام کا حسن بڑھاتے تھے۔ مومن اور غالب کے بعد غلبۂ فارسی میں ایک معتد بہ کمی واقع ہوئی۔
جملوں کی ترکیبیں سہل ہوگئیں۔ شعروں میں صفائی اور روانی پیدا ہوئی اسی وجہ سے غالب و
مومن کے شاگردوں کا کلام بہت صاف ہے۔ مثال کے لئے حالی، سالک۔ ظہیر، انور، اور
مجروح کے کلام کو دیکھنا چاہیئے

مومن ۱۲۱۵ھ لغایت ۱۲۶۸ھ
مطابق ۱۸۰۰ء لغایت ۱۸۵۱ء

حکیم مومن خان حکیم غلام نبی خان کے بیٹے تھے۔ ان کے دادا حکیم
نامدار خاں جن کی اصل نجبائے کشمیر سے تھی سلطنت مغلیہ کے
آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے اور شاہ عالم کے زمانہ میں چند مواضعات
جاگیر میں پائے جب سرکار انگریزی کی حکومت ہوئی تو اُن کی پنشن مقرر ہوگئی جس کا کچھ
حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا۔ مومن خاں کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے
ذہانت اور طباعی اور شعر کہنے کی استعداد ان میں موجود تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا
جو بات سُنتے تھے فوراً یاد ہو جاتی تھی۔ عربی و فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فن طب جو
انکا موروثی پیشہ تھا اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا۔ شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی انھوں
نے کمال حاصل کیا تھا اور ایسا ملکہ بہم پہونچایا تھا کہ ان کے احکام (پیشین گوئیاں) سن کر بڑے
بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے اکثر احکام کے صحیح ہونے کے سبب سے لوگ ان کے بہت معتقد تھے
اور اکثر آیندہ کی باتیں ان سے دریافت کیا کرتے تھے۔ شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت
تھی اور دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے مگر ان تمام مشاغل
اور فنون کو انھوں نے ذریعہ معاش نہین بنایا تھا آدمی بہت خوبصورت، خوش وضع اور
عاشق مزاج تھے عشقبازی کے لئے دلّی ایسا وسیع شہر پایا تھا۔ جہاں ان کے عشق و

محبت کے افسانے لوگوں کے زباں زد تھے۔ جب جوانی کی ہوسناکی ختم ہوگئی تو انھوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کرلی تھی اور نماز روزہ کے سختی سے پابند ہو گئے تھے۔ جو کلام ان کی جوانی اور آزادہ روی کے زمانہ کا ہے وہ عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر آخر عمر میں کلام میں بہت پختگی اور متانت آگئی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور اپنی ہی ذہانت اور طباعی پر بھروسہ رکھتے تھے۔ دلی سے پانچ مرتبہ باہر نکلے اور رام پور۔ سہسوان۔ جہانگیر آباد اور سہارن پور کی سیر کی چنانچہ کہتے ہیں ؎

دلی سے رام پور میں لایا جنوں کا شوق	ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم
چھوڑ دلی کو سہسواں آیا	ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

مگر وطن کی محبت نے پھر اپنی طرف جلد بلا لیا۔ جب مرزا غالب نے ۱۸۴۲ء میں دلی کالج کی پرشین پروفیسری قبول کرنے سے انکار کیا تھا تو ٹامسن صاحب نے یہی جگہ بمشاہرہ اسّی روپیہ ماہوار اس شرط پر کہ باہر جائیں مومن خاں کو دینا چاہی مگر انھوں نے باہر جانے سے انکار کیا۔ اسی طرح کپورتھلہ بھی بمشاہرہ تین سو پچاس پر نہ گئے۔ کیونکہ سُن لیا تھا کہ وہاں ایک گویّے کی یہی تنخواہ ہے۔ نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک نے ایک مرتبہ اُن کو بلا بھیجا اور اپنے پاس رکھنا چاہا مگر انھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ٹونک میں دلی کی پُرلطف صحبتیں کہاں میسر ہوں گی۔ مومن خاں نہایت آزاد مزاج قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی درباری داری اور خوشامد سے ان کو سخت نفرت اور عار تھا یہی ان کے کیرکٹر کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ ان کا دیوان اُمراء کے مدحیہ قصائد سے خالی ہے سوائے اس قصیدہ کے جس کا مطلع ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری	کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

یہ قصیدہ بطور اظہار شکریہ کے راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ کی شان میں لکھا تھا

جنھوں نے ان کو ایک ہتھنی بطور تحفہ کے دی تھی۔

اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا حکیم مومن خاں صاحب کو اس درجہ خیال تھا کہ اُسکے مقابلہ میں لوگوں کی فصاحت و بلاغت کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مشہور ہے کہ گلستان سعدی کو بھی ایک معمولی کتاب کہتے تھے جب سعدی کی نسبت اُن کا ایسا خیال تھا تو اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خطرہ میں لاتے انکے کلام کو نگاہ حقارت سے دیکھتے اور ان کا مضحکہ اُڑاتے تھے تاریخ گوئی میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ تاریخ میں تخرجہ اور تعمیہ بُرا سمجھا جاتا ہے مگر ان کی طبع رسا نے اس کو محسنات میں داخل کر دیا تھا۔ تاریخیں نئے نئے طریقہ سے نکالتے تھے مثلاً اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخ وفات کہی ؎ خاک بر فرق دولتِ دنیا، من فشاندم خزانہ بر سرِ خاک اس میں "خزانہ"، کے اعداد سر خاک یعنی (خ) کے اعداد کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۳ نکلتے ہیں۔ ایک بیٹی کی ولادت کی تاریخ اس طرح کہی ؎

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے		کہی تاریخ دختر مومن

"دختر مومن"، کے اعداد سے "نال"، کے اعداد خارج کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے اسی طرح شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی کی وفات کی تاریخ عجیب طریقہ سے نکالی ہے ؎

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے		فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

اس میں دوسرے مصرعہ کے الفاظ کے صرف بیچ کے حروف سے مادہ تاریخ ۱۲۳۹ھ نکالا ہے۔

تصانیف تصانیف میں ایک دیوان جس میں چھ مثنویاں شامل ہیں یادگار چھوڑا دیوان میں جمیع اصناف سخن جو شعرائے اردو کو مطبوع ہیں بکثرت موجود ہیں۔ دیوان کی ترتیب ان کے مشہور شاگرد نواب مصطفٰے خان شیفتہ نے کی تھی اور ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم الدین صاحب مؤلف تذکرہ شعرائے ہند نے اس کو شائع کیا۔

رنگ کلام | مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند داری کے لئے شہرۂ آفاق ہے ان کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کردیتے ہیں اس میں بلند پروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر بھی ہے اور یہی چیز اُن کو طرزِ لکھنؤ سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے وہ استاد کامل ہیں۔ ان کی علمی لیاقت اور طباعی ان کو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے۔ مثل غالب کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے بہت دلدادہ ہیں کیونکہ فارسی میں ان کو بھی وہی تبحّر حاصل تھا۔ بعض دقت یہ فارسیت کی کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی اور کلام کو سخت اور گنجلک کر دیتی ہے۔ ان کی تمنویاں سرتیز نشتر ہیں۔ جن میں حرماں نصیب عاشق کے سوزِ محبّت کا اظہار ہے۔ وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ البتّہ یہ اُن میں کمی ہے کہ عشق بازاری ہے اور طرزِ ادا بلند نہیں ہے اس معنی میں وہ طلسم اُلفت اور زہرِ عشق وغیرہ کے رنگ کی کہی جاسکتی ہیں۔ مومن کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے اور اسی لفظی ہیر پھیر سے تخئیل کے نئے راستے کھُل جاتے ہیں۔ مثالاً چند شعر درج ہیں :۔

روزِ جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا
میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

پس شکستن خم زجر محتسب معقول
گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے

نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف
خون فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

کیوں غش ہوے دیکھ آئینہ کو
کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم

آئینۂ رنگ غم نے توڑا
کیونکر اُسے مُنھ دکھائیں گے ہم

مومن کا مرتبہ بحیثیت شاعر | مومن شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ نہ صرف اپنی ذہانت اور طباعی اور دلفریب شاعری کی وجہ سے۔ یا اس لئے کہ اُن کے معاصرین اُن کی بڑی قدر کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک صاحب طرز ہیں جن کے پیرو نسیم دہلوی

منشی امیر اللہ تسلیم۔ حسرت موہانی وغیرہ ایسے نام بر آوردہ لوگ ہیں موتمن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ صاحب دیوان و تذکرۂ گلشن بیخار میر حسین تسکین۔ میر غلام علی وحشت۔ اصغر علی خاں نسیم وغیرہ۔ مومن کا انتقال ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر کر ہوا۔ انھوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ دن یا پانچ مہینے یا پانچ برس میں مرجاوں گا۔ چنانچہ پانچ مہینے کے بعد مر گئے۔ گرنے کی تاریخ خود کہی تھی۔ دست و بازو بشکست۔ چونکہ اسی سال انتقال ہو گیا تھا لہذا یہی تاریخ ان کے مرنے کی سمجھنا چاہیئے۔

شیفتہ ۱۲۲۱ھ لغایت ۱۲۶۸ھ

نواب مصطفےٰ خان شیفتہ خلف الصدق نواب مرتضیٰ خاں جنھوں نے لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کئے تھے اور اس کے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا۔ علاقہ جہانگیر آباد واقع ضلع بلند شہر خود نواب مصطفےٰ خان صاحب نے خرید کیا جو اب تک ان کی اولاد کے قبضہ میں ہے نواب صاحب موصوف کی ولادت ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء میں دہلی میں ہوئی اور غدر ۱۸۵۷ء تک وہیں قیام رہا اسکے بعد اپنے علاقے جہانگیر آباد میں قیام گزیں ہوئے نواب صاحب کو شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی۔ پُر گو شاعر تھے۔ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ فارسی میں غالب سے اور اردو میں مومن سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ شائد واقعہ یہ ہو کہ پہلے اپنا کلام مومن کو دکھاتے ہوں اور ان کے بعد غالب سے جو اُن کے بہت بڑے دوست تھے، رجوع کی ہو۔ شیفتہ کی قابلیت کا نشو و نما علم و فن اور شعر و سخن کے ایسے جمگھٹے میں ہوا۔ جس میں مولوی امام بخش صہبائی عبد اللہ خاں علوی۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ غالب۔ ذوق، شاہ نصیر، احسان۔ تسکین، حکیم آغا جان عیش وغیرہ شریک تھے مفتی صدر الدین خاں اور خود نواب صاحب کے یہاں ہفتہ ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ اہل کمال اس میں جمع ہو کر

لطفِ سخن اٹھاتے تھے نواب صاحب کی سخن فہمی کی اتنی شہرت تھی کہ غالب ایسا صاحب کمال اپنے اشعار کی اچھائی اور برائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے۔

غالب بفن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او ۔۔۔ ننوشت در دیواں غزل تا مصطفٰے خاں خوش نکرد

ایک دوسری جگہ ان کی طباعی اور ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں

غالب ز حسرتی چہ سرایم کہ در غزل ۔۔۔ چوں او تلاشِ معنی و مضموں نکردہ کس

نواب صاحب کو سفرِ حج کے بعد سے شعر گوئی سے ایک بے توجہی سی ہو گئی تھی کبھی احباب کے اصرار سے کچھ لیتے تو کہہ لیتے زیادہ وقت اپنا طاعت و عبادت اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے اور تمام منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ تصانیف میں ایک فارسی دیوان ایک اردو دیوان۔ ایک مجموعہ انشائے فارسی جو فارسی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے ایک سفرنامہ موسوم بہ ترغیبُ السالک الیٰ احسنِ المسالک جس کا فارسی نام رہِ آورد ہے اور ایک مبسوط تذکرہ شعرائے اردو کا زبان فارسی میں مشہور بہ گلشن بیخار ان کی یادگار ہیں۔ شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی ان کو یہی شہرت حاصل تھی اور اردو اور فارسی شاعری کے اعلیٰ درجہ کے نقاد اور سخن سنج سمجھے جاتے تھے۔ ان کا تذکرہ گلشن بے خار ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے اردو میں شیفتہ اپنے استاد مومن کے پیرو ہیں۔ ان کا کلام اخلاق و تصوف کے مضامین سے لبریز ہے ان کے کلام میں وارفتگی مطلق نہیں ہے۔ ان کے اردو اشعار گو بہت اعلیٰ درجہ کے نہ سہی۔ مگر بلند مضامین۔ صاف اور بامحاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں انکا درجہ ممتاز ہے۔ ان کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں نے اردو فارسی کلام مع ایک مفید دیباچہ اور حالات کے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایون

سے چھپوا کر شائع کیا۔

تسکین ۱۲۱۸ھ تا ۱۲۶۸ھ | میر حسین تسکین میر احسن عرف میرن صاحب کے بیٹے تھے دلی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ شعر و سخن میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر ان کے انتقال کے بعد مومن کے شاگرد ہوئے اور شہرت حاصل کی۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ گئے مگر جب وہاں کچھ مقصد برآری نہ ہوئی تو رامپور آ رہے جہاں نواب یوسف علی خاں نے ان کی بڑی قدر دانی کی چند روز رامپور میں آرام سے بسر کر کے پچاس برس کے سن میں ۱۲۶۸ھ میں رام پور ہی میں انتقال کیا۔ اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ مومن کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے اپنے استاد کے قدم بقدم چلتے ہیں بلکہ کلام میں اس قدر ہم رنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر دونوں کا کلام مخلوط کر دیا جائے تو تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔ تسکین کے بیٹے میر عبد الرحمٰن آسی رامپور میں نواب کلب علیخاں کے زمانہ تک تھے۔ یہ بھی ایک نام برآوردہ شاعر تھے۔

نسیم دہلوی ۱۷۹۴ء لغایت ۱۸۶۴ء | مرزا اصغر علی خاں متخلص بہ نسیم نواب آقا علی خاں کے بیٹے تھے دلی میں ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پایا۔ ضروریات زمانہ کے موافق تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے ناموافقت ہو گئی اور وہ اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علی خاں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور یہیں رہ پڑے۔ بعد کو بھائیوں نے عفو تقصیر کرا کے ملنا چاہا مگر انھوں نے ایک نہ مانا۔ اور پھر دلی نہیں گئے تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ کی حالت میں رہے مگر کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا۔ بڑے پابند مذہب اور احکام قرآنی کے سختی سے عامل تھے۔ غدر کے بعد منشی نول کشور کے مطبع میں الف لیلہ کے منظوم ترجمہ کی خدمت پر مقرر ہوئے ایک جلد ختم کی تھی کہ مطبع کی طرف سے تکمیل کتاب کی جلدی ہوئی

جو اُن کو ناگوار خاطر ہوئی اور وہ علیحدہ ہو گئے۔ ان کے بعد منشی طوطا رام شایاں نے بقیہ کتاب کو پورا کیا۔ تعجب ہے کہ جس وقت لکھنو کا طرز زوروں پر تھا اسی وقت نسیم دہلوی کو خود اپنے طرز میں لکھنو میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی یہ بڑے زودگو تھے مگر اسی کے ساتھ مزاج میں وارستگی اس قدر تھی کہ جو کچھ لکھتے اس کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے جس کی وجہ سے بہت کچھ کلام تلف ہو گیا۔ ان کا دیوان ان کے شاگرد حافظ عبدالواحد خاں مالک مطبع مصطفائی نے چھپوا دیا تھا۔ مگر اس کو وہ اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے۔ ان کی غزلوں کو مرزا غالب بھی پسند کرتے تھے۔ باوجود دہلوی ہونے اور اپنے شہر کی زبان پر فخر کرنے اور اس کی سختی کے ساتھ پابندی کے اکثر اہل لکھنؤ نسیم کے شاگرد ہوے جن میں عبداللہ خاں مہر۔ منشی اشرف علی اشرف۔ منشی امیراللہ تسلیم مشہور ہیں

طرز کلام | نسیم میں مومن کا رنگ بہت پایا جاتا ہے ان کا نہایت ہی لطیف طرز بیان اور نازک خیالی کے ساتھ ملا ہوا ہے جو مومن کا فیض تھا۔ نسیم کو تازگی کلام اور صحت محاورات کا بہت خیال تھا۔ لکھنو کی تصنعات اور لفاظی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی بہت نمایاں ہے اپنے استاد کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے تھے اور نزاکت خیال اور طرز بندش اور روانی کلام میں بھی انھیں کے پیرو ہیں۔ نسیم کا مرتبہ شعرائے درجہ دوم میں بہت برتر ہے۔

ذوق سنہ ۱۲۰۴ھ لغایت سنہ ۱۲۷۱ھ مطابق سنہ ۱۷۸۹ء لغایت سنہ ۱۸۵۴ء | شیخ ابراہیم ذوق ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے جن کو نواب لطف علی خاں رئیس دہلی کی حرم سرا کے کاروبار کی خدمت سپرد تھی۔ گو وہ کسی بڑے گھرانے سے نسبت نہ رکھتے تھے مگر اپنے جوہر ذاتی اور فنی قابلیت سے ہزاروں شریفوں اور عالی خاندانوں سے بڑھ کر مشہور ہوئے ان کی ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جو معمولی درجہ کے شاعر بھی تھے اور جن کے پاس محلے کے اکثر لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ حافظ صاحب کو شعر سے بہت

شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ انھیں کے ساتھ ہمارے نوعمر ذوقؔ بھی
مشاعروں میں جایا کرتے تھے جہاں لوگوں کے اشعار سُن کر ان کو ایک روحانی لذت
حاصل ہوتی اور شعر کہنے کا شوق دل میں پیدا ہوتا۔ اس زمانہ میں اکثر اچھے اچھے
اشعار یاد کر لیتے اور ان کو بار بار پڑھا کرتے تھے اس زمانہ کا کلام حافظ جی ہی کو دکھاتے
اور ان ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ذوقؔ کے ہم محلہ اور ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیرؔ کے شاگرد
ہو گئے جن کا اسوقت دلی میں بڑا شہرہ تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی ذوقؔ کو بھی خیال پیدا ہوا کہ
شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور ایک دن میر کاظم حسین کے ساتھ جا کر شاہ صاحب
کے شاگرد ہو گئے نوجوان شاگرد کی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے تجربہ کار استاد کو خیال
پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاگرد استاد سے بڑھ جائے اسی خیال سے وہ کبھی انکی غزلوں
کو بغیر اصلاح پھیر دیتے کبھی مُنھ بنا کر کہتے یہ کچھ نہیں۔ طبیعت پر زور ڈال کر کہو
ادھر ذوقؔ کو ان کے دوستوں نے استاد کے خلاف اُبھار دیا غرض کہ انھیں وجوہ سے
رشتہ استادی و شاگردی منقطع ہو گیا ذوقؔ اپنے کلام کو بہ نظر اصلاح خود دیکھنے
لگے اور اسکی درستی و چستی میں بڑی کدو کاوش کرنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام
نے جلد شہرت حاصل کر لی اور ان کی غزلیں محفلوں اور مجلسوں حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں
گائی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں مرزا ابوالمظفر ولیعہد سلطنت کے یہاں اکثر مشاعرے
ہوا کرتے تھے اور بسا اوقات غزلیں فی البدیہہ کہی جاتی تھیں جس سے شاعرانہ جودت
اور تیز ہوتی تھی اور نوآموز شعرا کا شوق اور زیادہ ہوتا تھا اور مشاعروں میں اکثر پرانے
اور کہنہ مشق شاعر مثلاً فراقؔ۔ احسانؔ، شکیباؔ، قاسمؔ، اعظمؔ، منتؔ وغیرہ برابر شریک ہوتے
تھے انھیں میں بتوسط میر کاظم حسین بیقرارؔ ذوقؔ کی بھی رسائی ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانہ
میں شاہ نصیرؔ دلی چھوڑ کر کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ولیعہد سلطنت ظفرؔ کی غزلوں کی
اصلاح میر کاظم حسین کے سپرد تھی اتفاقاً ان کو بحیثیت میر منشی جان الفنسٹن صاحب

کہیں جانا پڑا اور اب اصلاح کا کام ذوق کے سپرد ہو گیا جس کا صلہ چار روپیہ ماہوار بطور مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہ تنخواہ گو بہت کم تھی مگر اس کمی کی تلافی ان کی قدر و منزلت اور شہرت کی زیادتی سے بخوبی ہو گئی اس وجہ سے کہ اب شہر کے تمام امیر و رئیس اور نیز کہنہ مشق شاعر ان کو استاد ماننے لگے۔ دلّی میں نواب الٰہی بخش خاں متخلص بمعروف (مرزا غالبؔ کے خسر) ایک عالی خاندان امیر تھے اور علوم ضروری سے باخبر ہونے کے علاوہ کہنہ مشق شاعر بھی تھے پہلے شاہ نصیرؔ سے اصلاح لیتے تھے جب ذوقؔ کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا اور (بقول مولانا آزادؔ) ذوقؔ کے شاگرد ہو گئے۔ اس وقت ذوقؔ کی عمر تقریباً بیس[1] سال تھی ان دو مشہور آدمیوں کی شاگردی سے نہ صرف ذوقؔ کی شہرت میں اضافہ ہوا بلکہ ان کو اپنے کلام کی پختگی و صفائی کا انتہائی خیال ہوا اور اسی وجہ سے وہ نہایت عمدہ شعر کہنے لگے اور یہی مشق آئندہ اُن کے کام آئی۔ کیونکہ ان کو نواب صاحب کے کلام کی اصلاح میں بڑی کاوش کرنا پڑتی تھی اور اُن کی غزلوں کو جو کبھی سوداؔ کبھی جراَتؔ کبھی دردؔ کے طرز میں ہوتی تھیں بڑی دقت نظر سے بنانا پڑتا تھا۔

شاہ نصیر سے معرکہ | جب شاہ نصیرؔ دکن سے واپس آئے تو اپنا علم استادی پھر بلند کیا ادھر ہونہار اور طباع شاگرد کے دل کو بھی اتنے دنوں کی مشق اور کد و کاوش نے اور بڑھا دیا تھا مشکل مشکل بحروں اور ردیف قافیوں میں کہتے کہتے بڑی مشاقی اور روانی پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ نصیرؔ نے دکن میں کسی کی فرمائش سے نو شعر کی ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف تھی

---

[1] مصنف تذکرۂ گل رعنا اس معاملہ میں آزاد سے بالکل مختلف رائے رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "آزاد نے آبحیات میں جس طرح سے ظفرِ مرحوم کی کاوش فکر پر پانی پھیرا ہے۔ ان کے (معروف کے) بھی نتائج فکر کو اپنے استاد ذوق کے دامن کمال سے وابستہ کیا ہے باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھیاسٹھ برس کی تھی اور ذوق اٹھارہ برس کے رہے ہونگے۔ مگر جوش عقیدت میں اس کا خیال نہیں رہا (تذکرۂ گل رعنا فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۴) اور نیز نواب سعید الدین احمد خاں طالبؔ مرحوم نے بھی ایک مضمون میں نہایت مدلل طریقہ سے آزاد کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ ۱۲

"آتش و آب و خاک باد" وہ غزل دلّی کے مشاعرہ میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اس کو میں استاد مانتا ہوں۔ شاہ صاحب کی مبارزطلبی پر ذوقؔ نے مقابلہ کا بیڑا اٹھالیا اور ایک غزل اور تین قصیدے لکھ کر تیار کئے۔ شاہ صاحب کو شاگرد کی جرأت وگستاخی بہت ناگوار ہوئی ایک شاگرد سے اعتراض کرایا جس کے جواب میں ذوقؔ نے اکثر اسناد پیش کئے اور اس مقابلہ میں ذوقؔ ہی کو کامیابی ہوئی اس کے بعد سے ان کی استادی مسلّم ہو گئی۔ ان کے اعلیٰ قصائد[1] کے صلہ میں اکبر شاہ ثانی نے ان کو "خاقانی ہند" کا معزز خطاب عطا کیا تھا۔ جب مرزا ابوالمظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے تو انھوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا ؎

روکش ترے رُخ سے ہو کیا نور سحر رنگ شفق	ہے ذرہ تیرا پرتو انور سحر رنگ شفق

اس کے صلہ میں ان کی تنخواہ چار روپیہ سے پانچ روپیہ ہو گئی اور پانچ سے سات رفتہ رفتہ سَو تک اضافہ ہوا تھا اور عید بقرعید کے موقع پر خلعت و انعام سے سرفراز ہوتے تھے آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی تو انھوں نے قصیدہ کہہ کر گزرانا[2]

واہ کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا	مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

اس کے صلہ میں خلعت کے سوا خطاب خان بہادری اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی عنایت ہوا پھر ایک دوسرے قصیدے کے صلے میں۔

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت	نشۂ علم میں سرمست غرور نخوت

[1] مثلاً وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن — آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

[2] غالباً مرزا غالبؔ نے اسی موقع پر یہ غزل کہی ہوگی جس کا یہ مطلع و مقطع ہے ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ — شاہ دیندار نے شفا پائی

ایک گانوں جاگیر میں عنایت ہوا۔ ذوقؔ نے بعمر ارسٹھ سال ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا۔ ذوقؔ اپنی تیزی ذہن، براقی طبع اور قوت حافظہ کے لئے مشہور تھے۔ بڑے خدا ترس اور ہمدردی انسانی سے لبریز تھے۔ خوف خدا کا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی جانور بلکہ ایک چڑیا تک ہلاک نہیں کی۔ مختلف اذواق سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مثلاً موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ شعر گوئی ان سب پر حاوی تھی اس میں ان کو فنائیت کا مرتبہ حاصل تھا جوں جوں عمر گذرتی گئی ان کی قابلیت اور کمال میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کو فقہ تصوف، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ میں دستگاہ کامل تھی دنیاوی ترقی کے حوصلے اُن کو مطلق نہ تھے دلی سے اُن کو اس قدر محبت تھی کہ جب راجہ چندو لال نے جو شاداں تخلص کرتے تھے اور شعروشاعری کے بڑے دلدادہ اور شعرا کے مربی تھے ان کو حیدرآباد بلوا بھیجا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور یہ شعر لکھ کر بھیج دیا ؎

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑکر

ایک تنگ گلی کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے جس میں کوئی زیب و زینت بلکہ آرام و آسائش تک کا سامان مہیا نہ تھا۔ اسی مکان میں ہر وقت بند اپنی فکر شعروسخن میں محو و مستغرق دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہتے تھے۔ احکام قرانی کے پورے عامل اور نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ دن رات میں اکثر اوقات اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے۔

تصانیف | ایک ایسے شخص سے جس نے اپنی عمر کے پچاس برس سے زیادہ شعروسخن کی مشق میں صرف کئے ہوں اور سوائے شعروسخن کے اُس کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ رہا ہو۔ امید

---

[۱] ظفرؔ نے تاریخ کہی

شب چار شنبہ بہ ماہ صفر — بحکم خدا وند جاں داد ذوقؔ
ظفرؔ روئے اُردو بہ ناخن زغم — خراشید و فرمود اُستاد ذوقؔ

کی جا سکتی تھی کہ متعدد دیوان لاکھوں ابیات کے اس نے یادگار چھوڑے ہوں گے اس میں کوئی کلام نہیں کہ انھوں نے بہت کچھ لکھا تھا اگر ان کا سب کلام اس وقت جمع کیا جاتا تو کئی جلدیں تیار ہوتیں۔ مگر افسوس ہے کہ سارا کلام زمانۂ غدر کی لوٹ مار میں ضائع ہو گیا مولوی محمد حسین آزاد ان کے شاگرد رشید نے اس واقعہ کو نہایت دردناک طریقہ سے اپنی کتاب "آب حیات" میں لکھا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ ان کا جس قدر کلام ہمارے سامنے ہے وہ خود ان کی اور حافظ غلام رسول ویران کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے[1]۔

ذوق غزل اور قصیدہ دونوں کے استاد کامل تھے جن کی تعداد کافی مقدار میں وہ چھوڑ گئے ہیں۔ آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عشقیہ خط بطور مثنوی جس کا نام نامہ جہاں سوز رکھا تھا اور پانچ سو ابیات کے بعد ہنوز ناتمام تھا ایام غدر کی دستبرد میں ضائع ہو گیا۔ انھوں نے اکثر مخمس رباعیات اور تاریخیں بھی لکھی تھیں جن میں سے اکثر ضائع ہو گئیں مگر چند دیوان موجودہ میں شامل ہیں۔ اپنے شاگرد رشید ظفر کے واسطے کچھ گیت وغیرہ بھی کہے تھے البتہ سلام اور مرثیہ اور ہجو وغیرہ ان کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔

ذوق کی خدمت زبان کے ساتھ ذوق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو خوب صاف کیا اور اس پر جلا دی۔ وہ ایک بہت بڑے صناع تھے اور الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کماحقہٗ واقف تھے۔ محاورات اور امثال کے استعمال میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے الفاظ کا برمحل استعمال۔ فن عروض سے واقفیت۔ موسیقیت کلام۔ زور تخئیل اور بلندی مضامین، یہ سب چیزیں مل کر ان کے کلام کا جوہر اعلیٰ بن گئی ہیں۔ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں لطف الفاظ کے ساتھ خوبی معنی اس قدر نہیں پائی جاتی۔

انداز کلام ذوق کی شاعری میں تکلف اور تصنع مطلق نہیں ہے ان کے یہاں تشبیہات اور استعارات اور دیگر صنائع بدائع نہایت مناسبت سے کالملح فی الطعام استعمال ہوئے ہیں جسکی وجہ

[1] مصنف خمخانۂ جاوید اس سعی میں انور اور ظہیر کو بھی شریک بتاتے ہیں۔ دیکھو حال انور دہلوی ۱۲

سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ان کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا زبردستی اظہار کرنا چاہتا ہے۔ کلام میں روانی اور ترنم بہت ہے اعلیٰ تخیل اور بلندی مضامین کبھی الفاظ کی خوبصورتی اور صرف برمحل کے مزاحم نہیں ہوتے ہر شعر برمحل اور حشو و زوائد سے پاک ہوتا ہے سست اشعار ان کے دیوان میں نہیں ہیں قوت کلام اور تنوع مضامین کے اعتبار سے انکا مقابلہ سودا سے کیا جاسکتا ہے اور انھیں کے وہ تتبع تھے بھی۔ مگر ان کے یہاں اور استادوں کا بھی رنگ موجود ہے۔ مثلاً خواجہ میر درد اور جرأت و مصحفی۔ قصیدہ میں وہ کامل استاد مانے گئے اور اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اکثر قصائد ضایع ہو گئے مگر جو کچھ ہمارے سامنے ہیں وہ ان کی قادر الکلامی، اعلیٰ تخیل اور بلند پروازی اور روانی کلام کے بے مثل نمونے ہیں اس صنف میں وہ آپ اپنی نظیر تھے۔ ان کی غزلیں، تازگی مضامین، خوبی محاورہ۔ سادگی اور صفائی کے لئے مشہور ہیں ان کے کلام شاہ نصیر۔ سودا۔ درد، مصحفی، اور جرأت سب کا رنگ پایا جاتا ہے اسی وجہ سے ان کے کلام کو گلدستۂ گلہائے رنگارنگ کہنا بے جا نہیں۔ ان کی وہ غزلیں جو جرأت کے رنگ میں ہیں مگر جرأت کے عیوب سے پاک ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ ان کے کلام پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ معائب سے پاک نہیں ہے اور عام لوگوں کے لئے ہے۔ ایسی صورت میں جب اُن کے اکثر معاصرین بڑے بڑے فارسی و عربی داں شاعر تھے جن کا کلام معمولی آدمیوں کی سمجھ سے باہر تھا یہ اعتراض بیجا بھی نہیں ہے۔ نازک خیالی اور معانی آفرینی میں اگرچہ وہ غالب سے کم ہوں مگر سادگی اور صفائی اور ترنم الفاظ کے لحاظ سے وہ ان سے بڑھے ہوئے ہیں اور قصیدہ میں تو ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ آسمان شاعری پر ذوق ایک درخشاں تارہ بن کر چمکے اور زبان اُردو کے بہترین شعراء میں ان کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

شاگرد اُن کے سیکڑوں شاگرد تھے جن میں نواب مرزا خاں داغ۔ ظفر۔ آزاد۔ ظہیر اور

الور بہت نامور ہوئے ہیں۔ ان کے ایک ہی بیٹے تھے خلیفہ محمد اسماعیل، جو ان کے فرزند
روحانی کی طرف زمانۂ غدر میں دنیا سے اُٹھ گئے۔

ظہیر متوفی ۱۹۱۱ء | سید ظہیر الدین نام ظہیر تخلص سید جلال الدین حیدر کے بیٹے دلّی کے
باشندے تھے ان کے والد ابو المظفر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں استاد مرصع رقم خان بہادر
کے خطاب سے سرفراز تھے۔ خود ظہیر بھی کم سنی ہی میں شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے اور
راقم الدولہ خطاب اور ایک مرصع دوات انعام میں پائی تھی شعر و سخن سے بچپنے ہی سے
شوق تھا۔ چودہ ۱۴ برس کے سن میں استاد ذوق کے شاگرد ہو گئے غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں
ناچار دلی سے نکلنا پڑا۔ جھجر۔ سونی پت۔ نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے اور یہاں سے
لکھنو کا ارادہ کیا مگر وہاں کے ابتر حالات سن کے کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رام پور چلے گئے
وہاں چار برس رہے۔ اس کے بعد دلی آئے اور محکمہ چنگی میں ملازمت مل گئی اس کے
تھوڑے عرصہ کے بعد اخبار جلوۂ طور کے ایڈیٹر ہو گئے جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ ان کے
مضامین کو مہاراجہ شیو دھان سنگھ والی الور نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ ان کو الور بلوا
بھیجا جہاں یہ چار برس رہے۔ وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو گئے مجبور ہو کر پھر
دلّی آئے اور نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور کے محکمہ پولیس میں ان کو
ایک معقول جگہ مل گئی۔ جے پور میں کم و بیش اُنیس ۱۹ سال رہے والی ریاست کے مرنے پر
ان کا تعلق ریاست سے منقطع ہو گیا۔ چند روز پریشانی میں بسر ہوئے تھے کہ نواب
محمد علی خاں خلف نواب امیر خاں والی ٹونک نے بلا بھیجا اور جب تک نواب زندہ
رہے یہ بہت عزت و آبرو سے ان کے ساتھ رہے نواب کے مرنے کے بعد
ان کے صاحبزادے نواب ابراہیم علی خان نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اس
طریقہ سے تقریباً پندرہ ۱۵ سولہ ۱۶ برس ٹونک میں رہے۔ آخر عمر میں حیدر آباد جانے کا
شوق پیدا ہوا تھا چنانچہ ٹونک سے رخصت لے کر حیدر آباد گئے جہاں آٹھ مہینے کے

قیام کے بعد باریابی ہوئی مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری امیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا بیکاری کے زمانہ میں جب پریشان حال ہو گئے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے ان کی بہت مدد کی تھی

ظہیرؔ ایک پرگو شاعر تھے۔ تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ایک دیوان مسمّٰی گلستان سخن، آگرہ میں چھپ گیا ہے۔ دیوان دوم و سوم کا حق تصنیف قاضی عبد الکریم مالک مطبع کریمی بمبئی نے خرید لیا تھا اور یہ بھی چھپ گئے ہیں، چوتھا دیوان جس میں بقول حسرتؔ موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد اور مسدّس شامل ہیں ان کے نواسے کے پاس ہے۔

ظہیرؔ اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ گو کہ ذوقؔ کے شاگرد تھے مگر کلام میں مومنؔ خاں کا رنگ زیادہ پایا جاتا ہے جس کا اعتراف بعض غزلوں کے مقطعوں میں خود انھوں نے کیا ہے ؎

طرز مومنؔ سے نہ آگاہ تھا جبتک کہ ظہیرؔ	سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا
کیا نباہی طرز مومنؔ اے ظہیرؔ	طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

آخری دور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اپنے زمانہ میں زبان اور شاعری دونوں کے استاد مانے جاتے تھے ان کے مشہور شاگرد نجم الدین احمد ثاقبؔ بدایونی ہیں جو پہلوان سخن کے لقب سے مشہور ہیں

انورؔ | سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا متخلص بہ انورؔ ظہیرؔ مذکورۂ بالا کے چھوٹے بھائی تھے اور یہ بھی ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ ذوقؔ کے بعد اپنا کلام مرزا غالبؔ کو دکھلاتے تھے نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے مگر افسوس ہے کہ جے پور میں عین جوانی میں بعمر ۳۸ سال انتقال کیا۔ ان کے تمام معاصرین ان کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے اور یہ اُن سب مشاعروں میں شریک رہ چکے ہیں، جو غدر کے دس سال بعد دلی میں ہوا کرتے

تھے جن میں داغ، حالی، ظہیر، مجروح، سالک، ارشد، مشتاق وغیرہ اپنی لاجواب غزلیں سناتے تھے ان کے دو دیوان ضائع ہوگئے مگر محترمی لالہ سری رام صاحب قابل مصنف خمخانۂ جاوید نے بڑی محنت اور مشقت سے متفرق اور پریشان مسودوں سے ایک دیوان جمع کرکے چھپوایا ہے۔ انور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ذوق، غالب اور مومن تینوں کا رنگ کچھ کچھ ملتا ہے۔

غالب سنہ ۱۲۱۱ھ لغایت سنہ ۱۲۸۵ھ
سنہ ۱۷۹۶ء لغایت سنہ ۱۸۶۹ عیسوی

زبان اُردو کے بہت بڑے ماہر، آسمان شاعری کے سب سے درخشندہ تارے، اپنے زمانہ کے استاد کامل، فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ اسد و غالب سنہ ۱۲۱۲ھ مطابق سنہ ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے لقب مرزا نوشہ تھا اور نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ، بادشاہ دہلی سے عطا ہوا تھا۔ مرزا کو جس طرح اپنی ذاتی قابلیت پر اسی طرح اپنی اصل و نسل اور عالی خاندان ہونے پر بھی بڑا فخر و ناز تھا جیسا کہ ان کے اکثر اردو فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے مثال کے لئے یہ چند شعر کافی ہیں۔ ؎

غالب از خاک پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بسترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعت اتراک — در تمامی زماہ وہ چندیم
فیض حق را بھینہ شاگردیم — عقل کل را ہمینہ فرزندیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم — بہ معاشے کہ نیست خورسندیم
ہمہ بر خویشتن ہے گرییم — ہمہ بر روزگار سے خندیم

اشعار مذکورۂ بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی سلسلہ ایبک ترکمانوں سے جو وسط ایشیا کے رہنے والے تھے، ملتا ہے جو اپنے آپ کو سلاطین سلجوقیہ کی وساطت سے فریدوں کی نسل میں سمجھتے تھے۔ مرزا کے دادا سب سے پہلے ہندوستان آئے اور شاہ عالم

کے دربار میں عزت پائی مرزا کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں نے ایک متلون زندگی بسر کی۔ کچھ دنوں دربار اودھ میں رہے پھر حیدرآباد گئے جہاں نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو۳۰۰ سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس بعد گھر آئے اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی سرکش گڑھی کی لڑائی کے موقع پر ۱۲۱۷ھ میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کا سن پانچ برس کا تھا مرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو فوج کے کمیدان اور آگرہ کے مشہور رئیس تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے اور حسن خدمات اور وفاداری کے صلہ میں سرکار انگریزی سے جاگیر پائی تھی ان کا انتقال بھی ۱۲۲۱ھ میں ہو گیا اس وقت غالب کی عمر نو برس کی تھی اس کے بعد ان کی خبرگیری ان کی ننھیال میں ہوتی رہی اور ان کے چچا کی جاگیر کے عوض سرکار انگریزی سے پنشن بھی ملتی رہی مرزا کا بچپن آگرہ میں گزرا جہاں وہ ایک کہنہ مشق اُستاد شیخ معظم سے تعلیم پاتے رہے اور کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں مشہور نظیر اکبرآبادی سے بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں جب ان کی عمر چودہ۱۴ برس کی ہوئی تو ہرمز نام ایک پارسی سے جو ژند و پاژند کا عالم اور بڑا سیاح تھا، ان کی ملاقات ہو گئی۔ ہرمز نے آخر میں مذہب اسلام قبول کر لیا تھا اور عبدالصمد نام رکھا تھا یہ ان کے ساتھ تقریباً دو۲ برس رہا اور چونکہ فارسی کی طرف ان کو قدرتی مناسبت تھی لہٰذا اس سے انھوں نے پوری طرح اکتساب کمال کیا اس کے فیضان صحبت کا مرزا کو فخر تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس کی تعلیم و تربیت کے اثر سے مرزا میں وہ صحیح اور بامحاورہ فارسی قدیم لکھنے کا مادہ بخوبی پیدا ہو گیا جو صرف ایک اہل زبان ہی کی مدد سے ہو سکتا ہے غالب دہلی میں پہلی مرتبہ ۱۲۱۶ھ میں آئے جب ان کے چچا کی شادی نواب فخرالدولہ کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اور خود ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی کے

ساتھ، جو نواب فخر الدولہ والی لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے ۱۲۲۵ھ میں ہوئی جبکہ انکا سن تیرہ[۱۳] برس کا تھا۔ دہلی کی فضا میں اس وقت شاعری گونج رہی تھی مشاعرے جگہ بجگہ ہوا کرتے تھے شادی بھی ایک مشہور و معروف شاعر کی بیٹی کے ساتھ ہوئی، ان سب اسباب سے نوعمر غالب کی نوخیز طبیعت پر شاعری کا گہرا اثر پڑا شروع میں وہ فارسی کہتے تھے اور اس میں بہت کچھ کہا۔ مگر رفتہ رفتہ اردو شاعری کی روزافزوں ترقی اور ماحول کے اثر سے اردو کی طرف توجہ کی۔ پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ جب کسی شخص کا یہ شعر سنا ہے

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب   ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

یہ سنتے ہی اس تخلص سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ ان کا یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ شریک حال ہونے کو بہت برا جانتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ میں "اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب" کی رعایت سے غالبؔ تخلص اختیار کیا لیکن جن غزلوں میں اسدؔ تخلص تھا انھیں اسی طرح رہنے دیا۔ مرزا ۱۸۳۰ء میں کلکتہ بھی گئے تھے بہ سلسلہ اپنی پنشن کے جو ان کے چچا کو جاگیر ضبط ہو جانے کے عوض ملتی تھی اور آخر میں بند ہو گئی تھی مگر باوجود متعدد کوششوں کے اور ولایت میں اپیل دائر کرنے کے بھی مرزا اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ کلکتہ کے راستے میں مرزا نے لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی تھی، اور ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے واسطے اور ایک نثر وزیر سلطنت کی مدح میں پیش کی تھی آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے بھی پانچ سو روپیہ سال ان کے واسطے مقرر ہوئے تھے مگر دوؔ برس کے بعد جب انتزاع سلطنت ہوا تو وہ موقوف ہو گئے ۱۲۶۲ھ میں غالب تین ماہ کے واسطے کوتوال شہر کی عداوت کی وجہ سے قید ہو گئے تھے۔ مگر قید میں ان کے مرتبہ کے موافق ان کا احترام کیا گیا۔ ۱۸۴۲ء میں غالب ایک فارسی پروفیسری کے لئے جو دلی کالج میں خالی ہوئی تھی امیدوار تھے مگر چونکہ ٹامسن صاحب سکریٹری گورنمنٹ نے بروقت ملاقات مرزا کا استقبال نہیں کیا اس لئے انھوں نے اپنی کسر شان سمجھ کر ملازمت

قبول نہ کی۔ ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۴۹ء) میں خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بادشاہ نے دربار میں عطا کیا۔ اور ایک تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے کا حکم دیا اور پچاس روپیہ مہینہ اسکے صلہ میں مقرر کیا۔ ۱۲۷۱ھ میں ذوق کی وفات کے بعد مرزا استاد شہ مقرر ہوئے اور اصلاح کا کام ان کے سپرد ہوا۔ غدر کے ایام میں بوجہ سلسلۂ ملازمت اور تقرب شاہی کے مرزا بھی مصائب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پنشن بند ہو گئی اور ان کے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی جانے لگی آخر میں جب پوری صفائی ہو گئی اور یہ بے گناہ ثابت ہوئے تو ان کی پنشن بحال ہوئی اور عزت سابق واپس دی گئی۔ غالب نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے استاد بھی تھے جو ان کو سو روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر دیتے رہے۔ غالب کا انتقال ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء بعمر ۷۳ سال چار ماہ بمقام دہلی ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

عام حالات اور طبعی عادات غالب نہایت خلیق اور ملنسار واقع ہوئے تھے اور ایک بڑی جماعت احباب اور قدر دانوں کی رکھتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا جس کو وہ نہایت باقاعدہ طور پر وقت کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے اور دور دراز شاگردوں کے کلام کی اصلاح بھی مراسلت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور وہ جواب دینے میں بہت مستعد تھے۔ ان کی یہ عادت مرتے دم تک جاری رہی محبت و ہمدردی ان کے خمیر میں پڑی تھی جیسا کہ ان کے خطوط اور اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔ مذہبی تعصبات اور غلو سے کوسوں دور تھے۔ سچ پوچھو تو ان کا مذہب بنی نوع کے ساتھ ہمدردی اور محبت تھی جس میں کسی فرقہ اور جماعت کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے ان کی مذہبی آزادی اور غیر متعصبی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے دوستوں اور شاگردوں میں متعدد ہندو تھے جن میں سب سے زیادہ نامی وگرامی منشی ہرگوپال تفتہ تھے جو فارسی شعر کہنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ گو کہ مرزا کبھی آسودہ حال اور دنیاوی جاہ و ثروت کے اعتبار سے

فارغ البال نہیں ہوے مگر پھر بھی جس قدر اُن کی آمدنی تھی۔ وہ اپنی ضروریات کے ساتھ اپنے احباب اور ارباب احتیاج کے واسطے بلا تکلف وقف تھی۔ سخاوت کے ساتھ وہ صاف گوئی اور صاف باطنی کے لئے بھی مشہور تھے۔ چنانچہ خود اپنے عیوب اور کمیوں کو بھی کبھی نہیں چھپاتے بلکہ علی الاعلان ان کو ظاہر کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ وہ شراب پیتے تھے مگر اس واقعہ کو انھوں نے کبھی نہیں چھپایا بلکہ اپنے اشعار میں اور نیز احباب کے خطوط میں کسی معقول توجیہ کے ساتھ لکھتے تھے اور اس طرح گویا کہ وہ اپنی ندامت کا اظہار کر رہے ہیں۔ خلق و تواضع کے ساتھ ان کو اپنی خودداری اور عزت اور اپنے مرتبہ کا بھی بہت بڑا خیال رہتا تھا بڑے بڑے امراء سے وہ برابری سے ملتے اور علوشان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے۔ جیسا کہ اس واقعہ سے پایا جاتا ہے جب انھوں نے دلی کالج کی پروفیسری کو نامنظور کیا۔ کبھی کبھی ان کا یہ خیال حد اعتدال سے متجاوز بھی ہو جاتا تھا مگر اپنے وسیع حلقۂ احباب کے ساتھ وہ ہمیشہ رفق مدارا اور انکسار و تواضع ہی سے پیش آتے تھے۔ ان کے خانگی تعلقات خاص کر اپنی بیوی کے ساتھ شگفتہ نہ تھے مرزا کی شادی تیرہ[۱۳] برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی بیوی سے زیادہ محبت نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی کوئی ظاہری رنجش نہ تھی اور نہ میل ملاپ میں کوئی فرق تھا مرزا کے کئی اولادیں ہوئی تھیں مگر وہ سب بچپنے میں مر گئیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو فاتر العقل تھے اور انھیں کے ساتھ رہتے تھے غدر کے زمانہ میں مرے۔ مرزا اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ بہت ہونہار شاعر تھے اور مرزا کے سامنے انکا انتقال ہو گیا تھا ان کے دو بچوں سے مرزا صاحب کو کمال محبت تھی۔ آخر عمر میں مختلف امراض و آلام نے مرزا صاحب کو بہت پریشان کر دیا تھا پھر اس زمانہ میں ان کی مالی حالت بھی درست نہ تھی ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کر دیتے تھے۔

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے		مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

میر کی طرح غالب بھی مصائب و آلام کا مزہ چکھے ہوئے تھے اسی وجہ سے ان کے کلام میں بھی مثل میر کے ایک خاص درد و اثر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں تفاخر بے جا نہیں ہے بلکہ اس سے حسن شعر میں اضافہ ہوتا ہے اور کلام کی قیمت بڑھ جاتی ہے اسلئے کہ وہ نہایت مدلل اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا جاتا ہے جیسے فرماتے ہیں ؎

میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں		ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب

سب سے زیادہ قیمتی اور نمایاں جوہر مرزا صاحب کے کلام میں ان کی نہایت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے جس کی بدولت بڑی سے بڑی تکلیفوں کو بھی ہنس کھیل کر کاٹ دیتے تھے اسی خیال کو نہایت فلسفیانہ طریقہ پر ظاہر کرتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تاریک سے تاریک موقعوں پر بھی ان کی ظرافت اور لطافت کی بجلی چمک جاتی ہے جس سے مصائب کی تیرگی کافور ہو جاتی ہے۔ اُن کی ظرافت میں کسی قسم کی تیزی اور بدمزگی نہیں ہوتی بلکہ اس میں مناسبت اور جدت اسلوب کے ساتھ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے کہیں کہیں ان کے کلام میں بیزاری کا پرتو ہے مگر یہ کیفیت تنفر سے پیدا نہیں ہوتی ان کی ظرافت و مذاق سے کوئی نہیں چھوٹا حتیٰ کہ اپنی بیوی کی نسبت بھی ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے"۔ اگر مرزا صاحب کے اس قسم کے لطائف و ظرایف بالاستیعاب دیکھنا ہوں تو مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہیئے جس میں ایسی باتیں بکثرت مذکور ہیں۔

غالب بحیثیت شاعر کے	مرزا کا پایہ شاعری میں بہت بلند ہے اور اس کو سب نے تسلیم کیا ہے

وہ نہایت وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے اور ان کے معاصرین بھی اس بارے میں ان کی بڑی قدر کرتے تھے ان کو فارسی سے اس قدر شغف تھا کہ وہ ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے کہ میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے کیا جائے اور اس بات پر نہایت افسوس کرتے کہ لوگ اس قدر فارسی سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں کہ ان کے کلام کا قدر دان اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔

بیاوریدگر اینجا بود زباں دانے		غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد	

یہ عجیب بات اور نیرنگی قسمت ہے کہ ان کی شہرت کا باعث اُن کی فارسی شاعری نہیں بلکہ اردو شاعری ہوئی جس کی خود وہ کوئی قدر نہیں کرتے تھے ے

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال		مانی وارژنگم و آن نسخہ از ننگ من است

اُردو وہ کبھی کبھی تبدیل ذائقہ کے لئے اور اپنے احباب کے اصرار سے کہہ لیا کرتے تھے۔ مختلف کتابیں ان کی نظر سے گزری تھیں اور نہایت تعمق کی نظر سے ان کو پڑھا تھا قوت حافظہ کا یہ حال تھا اور اس پر اتنا اعتبار تھا کہ کتابیں عاریتاً لے کر پڑھتے اور خود کبھی نہ مول لیتے تھے۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی بھی عادت تھی جیسا کہ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے جبکہ کلکتہ میں ایک دوست مولوی کرم حسین کی فرمائش سے چکنی ڈلی کی تعریف میں فوراً چند اشعار کہہ دیئے تھے عربی میں گو انھوں نے درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی تھی مگر مہارت کافی حاصل تھی۔ فن عروض کے استاد کامل تھے اور اس کے علاوہ نجوم میں بھی کچھ دخل تھا۔ تصوف سے کماحقہٗ واقف تھے اور اس کے مسائل اپنے اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ تاریخ، ریاضی اور ہندسہ سے اُن کو مطلق دلچسپی نہ تھی گو کہ تعجب یہ ہے کہ دو تین کتابیں تاریخ کی خود تصنیف کر گئے ہیں اسی طرح مرثیہ اور تاریخ گوئی سے بھی اُن کو کوئی لگاؤ نہ تھا[1] البتہ فارسی میں بہت سے نوحے موجود ہیں

[1] یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا کو تاریخ گوئی سے کوئی لگاؤ نہ تھا یوں تو ان کے اردو دیوان میں بھی

(بقیہ صفحہ ۳۲۸ پر)

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے اور ان کی ذہانت کے مختلف پہلو تھے۔ جس کی وجہ سے ایک شاعر کا تجر ایک مصور کی چابکدستی کے ساتھ مل گیا تھا۔

تصانیف | حسب ذیل تصانیف ان کی یادگار ہیں :۔

(۱) عود ہندی (۲) اُردوئے معلےٰ (۳) کلیات نظم فارسی
(۴) کلیات نثر فارسی (۵) دیوان اُردو (۶) لطائف غیبی
(۷) تیغ تیز (۸) قاطع برہان (۹) پنج آہنگ
(۱۰) نامۂ غالب (۱۱) مہر نیمروز (۱۲) دستنبو
(۱۳) سبد چین۔ "عود ہندی" اور "اردوئے معلّی" اردو خطوط کا مجموعہ ہیں جو انھوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ اور اول مرتبہ بصورت کتاب ۱۸۶۹ء میں شایع ہوئے تھے۔ عود ہندی میں علاوہ خطوط کے چند دیباچے اور تقریظیں بھی شامل ہیں "لطائف غیبی" مباحثے میں ہے اور سیف الحق کے فرضی نام سے لکھی ہے۔ "تیغ تیز" اور "نامہ غالب" بھی اسی مناظرے سے تعلق رکھتی ہیں جو قاطع برہان کی وجہ سے ہوا تھا

(بقیہ صفحہ ۳۲۷)

دو تین تاریخیں موجود ہیں مگر فارسی میں تو متعدد عمدہ تاریخیں ان کے قطعات میں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو تاریخی مادے لکھتے ہیں جو بالکل ایک نئے ڈھنگ سے نکالے گئے ہیں۔ تاریخ وفات مرزا سیتا بیگ۔

زسال واقعۂ میرزا سیتا بیگ — مآت راست شمار ائمۂ امجاد
صحیفہائے سماوی شمیں از عشرات — حدیقہائے بہشتی شخص از آحاد
بحرمت دہ و دو ہادی و چہار کتاب — کہ در نشیمنے از ہشت خلد جایش باد

اس سے بارہ سیکڑے چار دہائیاں اور آٹھ اکائیاں یعنی ۱۲۴۸ھ نکلتے ہیں اسی طرح ایک دوسری تاریخ میں فرماتے ہیں

جستم از سال رحلتش اثرے — گفت غالب کہ خود ز روے شمار
از بروج سپہر جوے مآت — عشرات از کواکب سیّار
گفتم آحاد گفت شرمت باد — از خدا وند واحد القہار

اس میں بارہ سیکڑے سات دہائیاں اور ایک اکائی یعنی کل ۱۲۷۱ نکلتے ہیں۔ ۱۲

"پنج آہنگ" میں فارسی انشا پردازی کے مختلف نمونے ہیں "کلیات نظم غالب" ان کے فارسی قصائد اور غزلیات، قطعات، مثنویات، رباعیات، وغیرہ کا بیش بہا مجموعہ ہے "مہر نیمروز" تاریخ ہے۔ مرزا نے اس کو احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے ایما سے لکھا تھا۔ اس کی پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال قلمبند کیا اور مہر نیمروز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا بھی حال دوسری جلد میں لکھیں اور "ماہ نیم ماہ" نام رکھیں کہ اس اثنا میں غدر ہو گیا اور وہ کتاب رہ گئی۔ "دستنبو" میں گیارہ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حال بغاوت تباہی شہر اور اس کے ساتھ اپنے حالات بھی بیان کئے ہیں۔ "سبد چین" میں چند قصائد اور قطعات فارسی میں اور کچھ خطوط ہیں۔

مرزا صاحب سے مباحثے | پہلا مباحثہ اس طرح ہوا کہ جب مرزا کلکتہ میں تھے تو بعض لوگوں نے ان کے کلام پر کچھ اعتراض کئے اور سند میں قتیل کے اقوال پیش کئے مرزا صاحب جن کا قول تھا ؎

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را   چہ شناسد قتیل و واقف را

لہ مرزا کے فارسی قصائد کل چونسٹھ ہیں جن میں سترہ قصیدے حسب تفصیل ذیل انگریز حکام کی شان میں ہیں

نام ممدوح	تعداد قصائد	نام ممدوح	تعداد قصائد
کوئن وکٹوریا	۳	مسٹر اسٹرلنگ	۱
لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل	۱	ولیم فریزر	۱
لارڈ النبرا ایضاً	۲	مسٹر کالون	۱
سر چارلس مٹکاف ایضاً	۱	لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل	۱
جیمس ٹامسن	۱	مسٹر ایڈمنسٹن	۱
مسٹر پرنسپ	۱	لارڈ کیننگ گورنر جنرل	۱
ٹامس میڈک	۱	مسٹر منٹگمری لفٹننٹ گورنر	۱

ان کے علاوہ تین چار قطعات بھی انگریزوں کی شان میں ہیں ۱۲

وہ بھلا قتیل کو کب ماننے والے تھے انھوں نے اپنے کلام کی تائید میں اساتذہ اہل زبان پیش کئے اور کہا سے

دامن از کف کنم چگونہ رہا خاصہ روح و روان معنی را		طالب و عرفی و نظیری را آن ظہوری جہان معنی را

مخالفین جو قتیل کے شاگرد تھے اس پر اور برافروختہ ہوگئے اور مرزا صاحب کے کلام پر اور اعتراض وارد کئے۔ یہ سب واقعات ان کی مثنوی "باد مخالف" میں مذکور ہیں۔

دوسرا مباحثہ اس وجہ سے ہوا کہ مرزا نے فارسی کی مشہور لغت "برہان قاطع" پر اعتراض کئے اور ان کو کتابی صورت میں شایع کیا اور "قاطع برہان" نام رکھا اس کے سال بعد اس کتاب کو ترمیم کرکے اس کا نام "درفش کاویانی" رکھا اس کتاب سے مرزا کی انتہائی قابلیت اور تبحر کا پتہ چلتا ہے اس کے اکثر جواب لکھے گئے کلکتہ سے ایک شخص مرزا احمد بیگ نے "مؤید البرہان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے اس کا جواب "تیغ تیز" سے دیا اور ایک دوسری کتاب "ساطع برہان" کا جواب "نامۂ غالب" سے دیا گیا مرزا کے فارسی کلام پر اس کتاب میں کوئی رائے دینا بے موقع ہے مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ وہ نظم و نثر فارسی دونوں کے استاد کامل تھے اور ان کا مقابلہ ہندوستان اور ایران کے بڑے بڑے شعرا خسرو، نظیری، فیضی، بیدل و حزیں وغیرہ سے بے تکلف کیا جا سکتا ہے۔

غالب کی شاعری کے تین دور غالب کی شاعری تین مراتب یا ادوار پر تقسیم کی جاسکتی ہے جس سے ان کی شاعری کی ترقی اور نیز ہر دور کی خصوصیات کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے۔ یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ غالب اپنی قابلیت اور کلام کو اپنے اردو دیوان کی معیار سے کبھی نہیں جانچنا چاہتے تھے انکا قول تھا سے

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ	بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من ست

اور وہ ہمیشہ اپنے فارسی کلام ہی کو اپنا مایۂ ناز سمجھتے تھے انھوں نے اپنا مقابلہ کبھی کسی اردو شاعر سے نہیں کیا البتہ اہل زبان کے کلام سے اپنے کلام کو تولنے پر ہمیشہ مستعد تھے مگر بایںہمہ ان کی ذہانت وطباعی اور ان کی نظری شاعری کا پورا اثر ان کے اردو کلام میں بھی اسی طرح جلوہ گر ہے جس طرح ان کے فارسی کلام میں ہے مرزا کا اُردو دیوان تقریباً اٹھارہ سو ابیات سے زیادہ نہ ہوگا مگر ان کو زبان اردو کا بہترین خزانہ اور اردو شاعری کا نہایت گراں قدر سرمایہ سمجھنا چاہیئے مرزا کی شاعری کا پہلا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا تا عمر پچیس سال جبکہ انھوں نے اپنے اردو دیوان کو چھانٹا اور اس میں سے فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اور بندشیں نکال ڈالیں۔ اب وہ قدیم کلام جو مروجہ دیوان سے خارج کیا گیا تھا ایک عرصہ دراز کے بعد بڑی کوشش اور کاوش سے بہم پہونچا کر چھاپا گیا ہے اور اس کے مطالعہ سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی افکار مرزا کی کس قسم کی ہوتی تھیں نیز یہ کہ کن کن ترکیبوں اور بندشوں کو انھوں نے ترک کیا جو ابتدا میں ان کو پسند تھیں اس نئے دریافت شدہ کلام کی نازک خیالیاں اور نئی نئی ترکیبیں قرون وسطیٰ کے ان یوروپی شعرا سے ملتی جلتی ہیں جن کو انگریزی اصطلاح میں "اسکولمن" کہتے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں فارسی ترکیبوں اور نازک خیالیوں کی بہت کثرت ہے علی الخصوص مرزا عبد القادر بیدل کا بہت تتبع معلوم ہوتا ہے چنانچہ خود کہتے ہیں سے

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

"طرز نازک خیالی کے متبعین کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقائق شعری کو سیدھے سیدھے الفاظ میں کہنے کے بجائے وہ مضمون کو تخیل کی پیچیدہ گھاٹیوں سے گزارتے ہیں

اور اسی اشکال میں وہ اپنی خصوصیت اور ناموری سمجھتے ہیں بعض اوقات ان کی
یہ بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں اس قدر بلند ہو جاتی ہیں کہ نظروں سے
اوجھل ہو کر شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا ہے ایسے ہی اشعار پر "کوہ کندن
و کاہ برآوردن" کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ مرزا کو یہ
رنگ بہت پسند آیا اس وجہ سے ان کے مزاج کی افتاد یہ واقع ہوئی تھی کہ وہ ہر چیز میں
اپنے آپ کو عام لوگوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے شاعری میں بھی انھوں نے
یہ رنگ اپنے واسطے منتخب کیا اس وجہ سے کہ اس میں فارسیت کا غلبہ تھا اور فارسی کا ذوق
ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ طرز ان کے اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ایک
بڑا آلہ کار تھا۔ مرزا بیدل کے وہ صرف متبع ہی نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ ان کے معترف بھی ہیں
جیسا کہ مذکورہ بالا شعروں سے معلوم ہوا یہ رنگ اگرچہ کچھ اچھا نہ تھا مگر تھوڑی مدت تک
مرزا کی طبیعت پر غالب رہا بعد کو وہ خود سنبھل گئے اور اپنے واسطے ایک نیا راستہ
نکالا جس میں نہ صرف بیدل کی پیروی ترک کی بلکہ اس طرز کا کلام بھی اپنے دیوان سے
خارج کر دیا ان کے ابتدائی کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں، عجیب و غریب تشبیہیں۔
ایسی بلند پروازیاں جن سے شعر کے معنی مبہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فارسی کی ایسی بندشیں
اور ایسے غیر مانوس الفاظ جو شعر کی روانی اور فصاحت کلام کے منافی ہیں۔ ابتدائی کلام
میں وہ پختہ کاری۔ وہ اثر اور وہ عمیق جذبات جو ان کے بعد کے کلام میں ہیں نہیں
پائے جاتے ان کے ایسے اشعار محض فارسی الفاظ کی لڑیاں معلوم ہوتے ہیں جن میں اردو
کی آمیزش محض اس وجہ سے ہے کہ شعر اردو کہا جا سکے اور ادنیٰ تغیر سے وہ فارسی ہو جاتا ہے
گو ان کے ابتدائی کلام کا مضحکہ بھی اڑایا جاتا تھا جیسے کہ حکیم آغا عیش نے جل کر کہا کہ قطعہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے بھی ان کے اعلیٰ درجہ کی دماغی قوت اور آیندہ کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی اس دور کی شاعری بھی نہایت ممتاز اور مخصوص ہے اور ان کی افتاد طبع سے معلوم ہوجاتا ہے کہ آیندہ وہ کتنی ترقی کرنے والے ہیں اُن کی ابتدائی فکر میں بھی ایسی ایسی نازک خیالیاں نئی نئی تخیلیں اور پُر لطف تشبیہیں ملتی ہیں کہ اُردو شعرا میں اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتیں اپنے مخالفین کے اعتراضات اور مضحکہ انگیز نقالی اور اپنے مخلص احباب مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ وغیرہ کی دوستانہ صلاح اور خود اپنی انصاف پسند طبیعت کے تقاضا سے مرزا نے آخرکار یہ رنگ ترک کرکے ایک دوسری روش اختیار کی

دوسرے دَور میں فارسیت کا وہ غلبہ اور نازک خیالیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے مرزا کو مرغوب تھا۔ اس میں زبان صاف ہوگئی ہے الفاظ پر پوری قدرت ہے اور فارسی بندشوں اور محاورات میں ایک معتد بہ کمی ہے مگر فارسی کے اعلیٰ خیالات ویسے ہی ہیں جو مذاق سلیم پر گراں نہیں گزرتے بلکہ سامع کے دل و دماغ میں ایک پُرلطف ہیجان پیدا کردیتے ہیں اسی قسم کے اشعار تھوڑی سی کاوش کے بعد جب سمجھ میں آجاتے ہیں تو مسرت کاوش غضب کی ہوتی ہے۔

مرزا کی شاعری کا تیسرا دَور اُن کے کمال فن کا لُب لباب اور ارتقائے کمال کی آخری منزل ہے اس دَور کے بعض اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتے اس عہد کی غزلوں میں ندرت خیال کے ساتھ لطافت زبان اور شستگی کلام عجیب لطف دیتی ہے ان میں ایجاز کے ساتھ سادگی۔ سلاست و روانی نازک خیالی اور جدت تخیل سب کچھ بدرجۂ احسن موجود ہے۔ اور انھیں سے غالب کو شعرائے اُردو کی صف اولین میں نہایت ممتاز جگہ ملی ہے

غالب کے خصوصیات پہلی خصوصیت جدت پسندی	ہماری رائے میں مرزا کے قصر شاعری کی مستحکم بنیاد۔ ان کی جدت طرازی

پر قائم ہے۔ جس میں جدت تخیل، جدت طرز ادا، جدت تشبیہات، جدت استعارات جدت محاکات، جدت الفاظ، غرض ہر قسم کی جدتیں شامل ہیں۔ پامال مضامین مرزا صاحب کی خاص طرز ادا سے بالکل نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور معمولی سے معمولی واقعات ایک ایسے اسلوب سے بیان کر جاتے ہیں کہ گویا اس سے پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے نئے خیالات کے ادا کرنے کا طریقہ بھی نیا ہوتا ہے۔ اس جدت اسلوب سے معمولی سے معمولی خیال اور پامال سے پامال مضمون بہت مرتفع ہو جاتا ہے۔ اس جدت طرازی اور اریجنلٹی کی وجہ سے شعر میں کبھی کبھی معما کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا حل ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے غالب اور اکثر شعرائے اردو اور نیز بعض شعرائے فارسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور اور لوگوں کے یہاں معاملہ برعکس ہے جس سے اُن کے اشعار میں تصنع اور بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی قسم کے کلام سے اُن کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں بخلاف ان کے تک بندی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے

غالب نبود شیوۂ من قافیہ بندی ظلمیست کہ بر کلک و ورق میکنم امشب

دوسری خصوصیت، نظر فریب طرز تحریر — اسی سے متعلق اور ملتی جلتی اُن کے کلام میں نظر فریبی اور بات سے بات پیدا ہونا ہے۔ وہ ایک سُر چھیڑتے ہیں اور سامع کا ذہن پورا راگ منضبط کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجہول الکیف سامع مرزا غالب کے شاعرانہ ترانوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مرزا کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ پڑھنے والے کا خیال خود اس کے لوازم جمع کر لیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ مرزا صاحب کی شاعری خاص طغرائے امتیاز جادۂ عام سے علیحدگی ہے جس کا شوق بلکہ عشق ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ وہ کسی چیز میں اپنی شرکت عام لوگوں کے ساتھ پسند نہیں کرتے تھے تخلص بدلنے کا واقعہ جس کا ذکر اوپر ہوا اس کا بیّن ثبوت ہے اسی طرح وہ اپنے

لباس، وضع قطع، بات چیت، طرز تحریر، غرضکہ ہر چیز میں اسی علیحدگی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے، ان کے خطوط، ان کے اشعار، ہر چیز سے مترشح ہے کہ وہ عام باتوں سے سخت متنفر تھے۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا		ڈرتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

ان کی ابتدائی مشکل پسندی اسی علیحدگی پسندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری سے عام دماغ لطف نہیں اٹھا سکتے ان کے الفاظ میں خیالات کا اس قدر زور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات قید الفاظ کو توڑ ڈالیں گے ع

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔

تیسری خصوصیت ذاتی جذبات کا ادا کرنا

مرزا میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار ان کے خیالات کا صحیح فوٹو ہوتے ہیں۔ وہ زندگی اور مختلف کیفیات زندگی سے ترانے گاتے ہیں اور اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنے دلی کیفیات اپنے کلام کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں کہیں غم و الم کے نالے۔ کہیں ان کی مانند عظمت کا مرقع کہیں اُن کی حرماں نصیبی، کہیں ہجوم ناامیدی، کہیں جانکاہ مصائب، کہیں سعی بے حاصل کہیں دنیا سے تنفر اور بیزاری، کہیں رحم خداوندی پر پورا پورا اعتماد، کہیں تعلقات دنیاوی سے دل بستگی اور اس کی خوشی اور اس کے آلام کا بیان ہوتا ہے۔ غرضکہ ان کے لطیف اشعار، ان کی کیفیات قلبیہ کا جو وقتاً فوقتاً اور آناً فاناً وارد ہوتی رہتی ہیں صحیح پیرائے ہیں۔

چوتھی خصوصیت فلسفیت اور حقیقت طرازی

مرزا ایک بہت بڑے فلسفی ہیں اور ان کے اکثر اشعار حقائق فلسفہ کو نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں وہ رموز و حقائق تصوف سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی اور مذہبی تعصبات سے بالکل مبرا تھے فرماتے ہیں ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اور ان کے یہ خیال زبانی نہ تھے بلکہ وہ ان پر پوری طرح عامل تھے۔ ان کی زندگی مذہبی رواداری، آزادہ روی کی ایک درخشاں مثال تھی اسی طرح ان کا تخیل عبادت بھی بہت بلند ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جنت کے اس خیال سے کہ اس میں نہریں جاری ہوں گی اور وہی سب لطف حاصل ہوں گے جو دنیا میں ہوتے ہیں وہ متفق نہیں بلکہ اس کو اخلاق اعلیٰ سے گرا ہوا سمجھتے ہیں کہتے ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

ان کے نزدیک مصیبت عظمیٰ خود زندگی ہے جس سے احساس وجود پیدا ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ اپنے مبدا سے جدا ہو جاتی ہے۔ نغمۂ زندگی کو ایک نالۂ نے سمجھنا چاہیئے جو نیستان سے جدا ہونے پر نے بے اختیارانہ کرتی رہتی ہے۔ اسی مضمون کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بحیثیت ایک صوفی صافی کے وہ دنیا کے شادی و غم سے بالکل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ایک مرتفع مقام سے ترانہ سنجی کرتے ہیں ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

کس قدر خوبصورتی سے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ عالم ظاہر مظہر روح حیات مگر خود روح حیات نہیں ہے بقول برگسن کے یہی روح حیات اجسام میں جلوہ گر ہے مگر وہ خود اس عالم سے منزّہ ہے غالبؔ کہتے ہیں ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

پانچویں خصوصیت جذبات نگاری	حقائق فلسفہ کے علاوہ مرزا صاحب کی شاعری جذبات سے بھی مملو ہے ان کے بیاں جانکاہ مصائب، دلگداز تکلیفیں، ناقابل برداشت

مصیبتیں جو لازمہ زندگی ہیں نہایت موثر الفاظ میں بیان کی گئی ہیں، گویا زندگی ایک ایسا جنازہ ہے جس کے ساتھ دور سے قضا کے قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں چنانچہ اسی زندگی اور غم کے لازم و ملزوم ہونے کے متعلق مرزا کہتے ہیں

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں		موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے		غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج		شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مرزا کے کلام میں بچوں کی سی ضد اور اپنے معاصر انگریزی شاعر شیلی کی طرح تنک مزاجی پائی جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ اُن کو اُن کے حال پہ کیوں نہ چھوڑا جائے اور ان کے معاملات میں کیوں دست اندازی اور مزاحمت کی جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

بچے کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو تکلیف کیوں ہو۔ اسی طرح اس شعر میں ؎

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا کے اشعار میں خود انھیں کے آلام و مصائب کے نقشے نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار کو پڑھکر رنج و غم کی رفعت اور مصیبت کی عظمت معلوم ہوتی ہے اور گناہ کی ظلمت دُور ہوکر اس میں ایک نورانیت معلوم ہونے لگتی ہے مندرجہ ذیل شعر میں انتہا درجہ کا انکسار اور عاجزی اور دلی پشیمانی اور اپنی بے حقیقتی کا اظہار کس پُر اثر اور درد انگیز طریقے سے کیا ہے ؎

قدرِ سنگ سرِ رہ رکھتا ہوں		سخت ارزاں ہے گرانی میری	

کلام میں ظرافت و شوخی | مرزا کی شاعری میں جو مایوسی اور درد کی تاریکی ہے اس کو ان کی
طبعی ظرافت اور شوخی اکثر دُور کر دیتی ہے۔ اکثر اشعار میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حزن و یاس
کے ابر میں ظرافت کی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ ان کی ظرافت کی لطافت اور شوخی کلام کی
نزاکت کو ہم بے تکلف ایک نازک پھول کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مگر ان کی ظرافت کبھی
حد اعتدال سے بڑھکر پھکڑ نہیں ہو جاتی اور متین سے متین آدمی اس سے لطف اندوز
ہو سکتے ہیں۔

ان کے اکثر اشعار نفس شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کے روح رواں ہیں۔ سادہ
الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی اس طرح پنہاں ہیں جیسے دریا کے شفاف پانی کے نیچے دریا کی
تہ، ان کی ہر تصویر الفاظ کے پیچھے ان کے ہر نقش خیال کی پشت پر ایسے ایسے تخیل کے
وسیع مناظر نظر آتے ہیں جن کی محیط فضا حیات و ممات کے سربستہ رازوں سے معمور ہے
غالبؔ ایک کامل مصوّر ہیں اور ان کو خیالی تصویروں کے کھینچنے کا عجیب و غریب ملکہ حاصل ہے

نیند اُسکی ہے، دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں	تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ	یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے	خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

مرزا کو عجب قوت ایجاز حاصل تھی۔ ان کے بعض اشعار ایجاز و اختصار اور بات سے بات
پیدا کرنے کے بے مثل نمونے ہیں۔ مثلاً

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد	مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شعر نہایت پُر تاثیر ہے ظاہر میں تو ارتکاب شدہ گناہوں کے حساب سے بچنا چاہتا ہے
مگر درپردہ کہتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے بھی ہیں جن کے نہ کرنے سے دل میں حسرتوں کے
داغ پڑ گئے۔ یہ ایک نڈر اور صاف گو گنہگار کی تصویر ہے جو خدا سے بے دھڑک کہتا ہے
کہ کردہ گناہ میرے کم ہیں مگر ناکردہ گناہوں کی حسرت زیادہ ہے اور اسی کی میں تجھ سے

داد چاہتا ہوں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد		یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے[1]

غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین شعراء سے	علو خیال، فلسفۂ حیات، اور ذہانت و طباعی میں غالب اپنے معاصرین، ذوق و مومن سے بڑھ کر ہیں مگر روزمرہ اور سادگی

بیان اور محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق ان سے بڑھے ہوئے ہیں، گو کہ مومن اس میں بھی ان سے کم ہیں۔ یورپ کے شاعروں میں جو ان کے ہمعصر یا قریب العہد تھے ان کے کلام کا توازن شعرائے ذیل کے کلام سے کیا جاسکتا ہے۔

(۱) رابرٹ براؤننگ سے جو انگلستان کا اسی عہد کا ایک فلسفی شاعر تھا۔ پروفیسر سینٹسبری براؤننگ کی نسبت لکھتے ہیں کہ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ روح کا تجزیہ کرتا ہے۔ مرزا غالب تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا کہ رموز روحانی کے عمق کو دریافت کرتے ہیں۔ حقائق کی جھلکیاں وہ دیکھتے ہیں وہ دیکھتے ہیں ان کا کلام مثل مولانا روم وغیرہ کے سراپا اسرار تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہ الی آخرہ کوئی فلسفہ ہی مگر حقائق و رموز کا ان کے کلام میں جابجا پرتو موجود ہے۔ ان کو صوفی براؤننگ کہنا بجا ہے ہر چند کہ براؤننگ کے کھردرے پن اور اکھڑپن سے ان کا کلام پاک ہے۔

(۲) مضامین حزن و یاس میں ان کا مقابلہ جرمنی کے شاعر" ہین" سے خوب ہو سکتا ہے۔

(۳) مگر فی الحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر ان کا مد مقابل یورپ میں گزرا ہے تو

[1] مرزا کے اس خیال کی تائید کہ اکثر گناہ ایسے تھے جن سے میں بچا لہذا ان کی حسرت کی بھی داد دی جائے یعنی اس کا ثمرہ نیک ملے اس آیت وافی الہدایت سے ہوتی ہے وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ۔ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ہِیَ الْمَاْوٰی ؕ

سورۃ النازعات سیپارہ ۳۰

وہ جرمنی کا مشہور و معروف "گیٹے" ہے۔ غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہوگیا ہے یعنی فلسفی کی عقل اور ادراک۔ صوفی کی نگاہ۔ دوربین۔ چابک دست مصور کا نازک ہاتھ۔ ان کی صنعت اپرکاری اور پرکاری صنعت ہے۔ اور حسن حق ہے اور حق حسن ہے وہ ایک صوفی صاف دل تھے اور انکا یہ قول بالکل صحیح ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں	غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ان کا تصوف کوئی شغل دلچسپی نہیں اور نہ ان کی شاعری محض خیالی شاعری ہے بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے اس کا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جاسکتا ہے۔

غالب کے شاگرد غالب کے بکثرت شاگرد تھے جن میں اصحاب ذیل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں تخلص کہ ان کے عزیز بھی تھے۔ میر مہدی مجروح مرزا قربان علی بیگ سالک، خواجہ الطاف حسین حالی۔ مصنف یادگار غالب، منشی ہرگوپال تفتہ۔ نواب علاءالدین خاں علوی۔ زکی۔ عزیز۔ مشاق و جوہر وغیرہ۔ ان میں سے بعض کے مختصر حالات آگے درج ہیں[1]۔

میر مہدی مجروح متوفی ۱۹۰۲ء میر مہدی مجروح خلف میر حسین نگار مرزا غالب کے محبوب اور سب سے عزیز شاگرد دلی کے رہنے والے تھے۔ غدر کے ہنگامہ میں وطن چھوڑ کر پانی پت چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی کچھ عرصہ بعد جب کہ غدر کا طوفان فرو ہوا اور دلی میں گو نہ امن و امان کی صورت پیدا ہوئی تو یہ پھر دلی

[1] مصنف کتاب بابو رگھو پتی سہائے صاحب اور مسٹر صلاح الدین خدا بخش اور آنریبل شیخ عبدالقادر صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان حضرات کے بیش بہا مضامین سے جو غالب کی شاعری پر نکلے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

آگئے اور اپنے قدیم مشغلہ شعر و سخن سے دلچسپی لینے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے بعد چند روز کے بہ تلاش معاش الور گئے جہاں مہاراجہ شیودھان سنگھ والی ریاست نے ان کی قدردانی کی آخر عمر میں نواب صاحب رامپور کی قدردانی اور عنایت و مہربانی سے اسی ریاست میں چلے آئے اور بفراغت زندگی بسر کی ۱۳۱۶ھ میں اپنا ایک دیوان "مظہر معانی" کے نام سے چھپوایا۔ میر مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ اور شیریں ہے چھوٹی بحروں میں ان کا کمال بوجہ احسن معلوم ہوتا ہے خیالات میں ندرت اور مضامین میں جدت ان کے کلام میں نہیں ہے مگر طرز ادا استادانہ ہے اور اشعار عیوب شاعری سے پاک ہیں۔ مولانا حالی ان کے بہت معترف تھے۔ میر مجروح ان لوگوں میں ہیں جن کو اردو شاعری کی آخری یادگار سمجھنا چاہیئے۔ انھوں نے اردو شاعری کی روایات قدیمہ کو حتی الامکان خوب نباہا۔ مرزا غالب کے اکثر دلچسپ خط عود ہندی اور اردوئے معلی میں ان کے نام موجود ہیں۔

سالک متوفی ۱۸۹۳ء | مرزا قربان علی بیگ سالک نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے حیدرآباد میں پیدا ہوئے مگر بعض کے نزدیک مسقط الراس دلی ہے۔ غرضکہ دلی میں نشو ونما پائی پہلے قربان تخلص کرتے اور مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے مگر جب ان کا انتقال ہوگیا تو یہ غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص اختیار کیا۔ غدر کے زمانہ میں یہ دلی چھوڑ کر الور چلے گئے۔ جہاں کچھ عرصہ تک وکالت کرتے رہے اس کے بعد حیدرآباد گئے اور وہاں محکمہ تعلیمات میں سررشتہ دار ہوئے حیدرآباد میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک اردو رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکلتا تھا سالک کچھ عرصہ تک اس کے مدیر رہے ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد ہی میں انتقال کیا "ہنجار سالک" دیوان کا نام ہے۔ یہ بھی غالب کے مشہور شاگردوں میں سے تھے کلام خیالی اور زبان دونوں کے اعتبار سے اچھا ہے۔ مگر جدت سے خالی ہے

اُن کا شہر آشوب دہلی کی تباہی پر اور اپنے استاد غالب کا مرثیہ بہت پر زور اور
درد انگیز ہے

ذکی متوفی ۱۹۱۳ء | نواب محمد زکریا خاں رضوی تخلص بہ زکی ایک عالی خاندان
شخص تھے دلی میں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب سید محمد خاں اور
نانا نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں معظم جنگ تخلص بہ سرور ہیں۔ یہ دونوں بھی مشہور
شاعر اور صاحب دیوان ہیں اور سرور کا ایک تذکرہ بھی ریختہ گو شعراء کا ہے زکی کی
تعلیم دلی میں ہوئی اور ان کو زبان فارسی و عربی پر عبور حاصل تھا اس کے علاوہ
فن طب حدیث و فقہ اور تصوف اور نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے موسیقی
اور فن خوشنویسی سے بھی باخبر تھے۔ مولانا صہبائی اور پنڈت رام کشور بسمل کے علوم
درسیہ میں شاگرد تھے۔ فن شعر میں مرزا غالب کو کلام دکھلاتے تھے جن سے ان سے
کچھ قرابت بھی تھی۔ مرزا ان کا بہت خیال کرتے اور بہت محبت سے پیش آتے تھے مرزا کے
ہاتھ کی ایک سند کا عکس ان کے دیوان میں دیا ہوا ہے زکی کو شعر و سخن سے بہت شوق
اور اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ جہاں کہیں جاتے تھے شعر و سخن کی
محفلیں گرماتے تھے۔ غالب کے شاگرد رشید اور ان کے طرز کے متبع تھے۔ خیال آفرینی اور
جدت تخیل اُن کے کلام کا جوہر ہے البتہ درد و اثر اس قدر کلام میں نہیں ہے مثل
ظہیر و انور و سالک وغیرہ کے ان کو بھی تلاش معاش میں وطن سے نکلنا پڑا۔ میرٹھ گورکھپور
الہ آباد وغیرہ میں ملازمت سرکاری کرکے ۱۹۰۱ء میں بدایوں میں بحیثیت ڈپٹی
انسپکٹر مدارس پنشن پائی اور وہیں ۱۹۰۳ء میں انتقال کیا ان کا دیوان ان کی زندگی
میں چھپ گیا تھا اپنے زمانے میں طرز قدیم کے استاد مانے جاتے تھے بہت سے شاگرد
چھوڑے جن میں مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ اور پنڈت جواہر ناتھ کول
ساقی تخلص زیادہ مشہور تھے۔
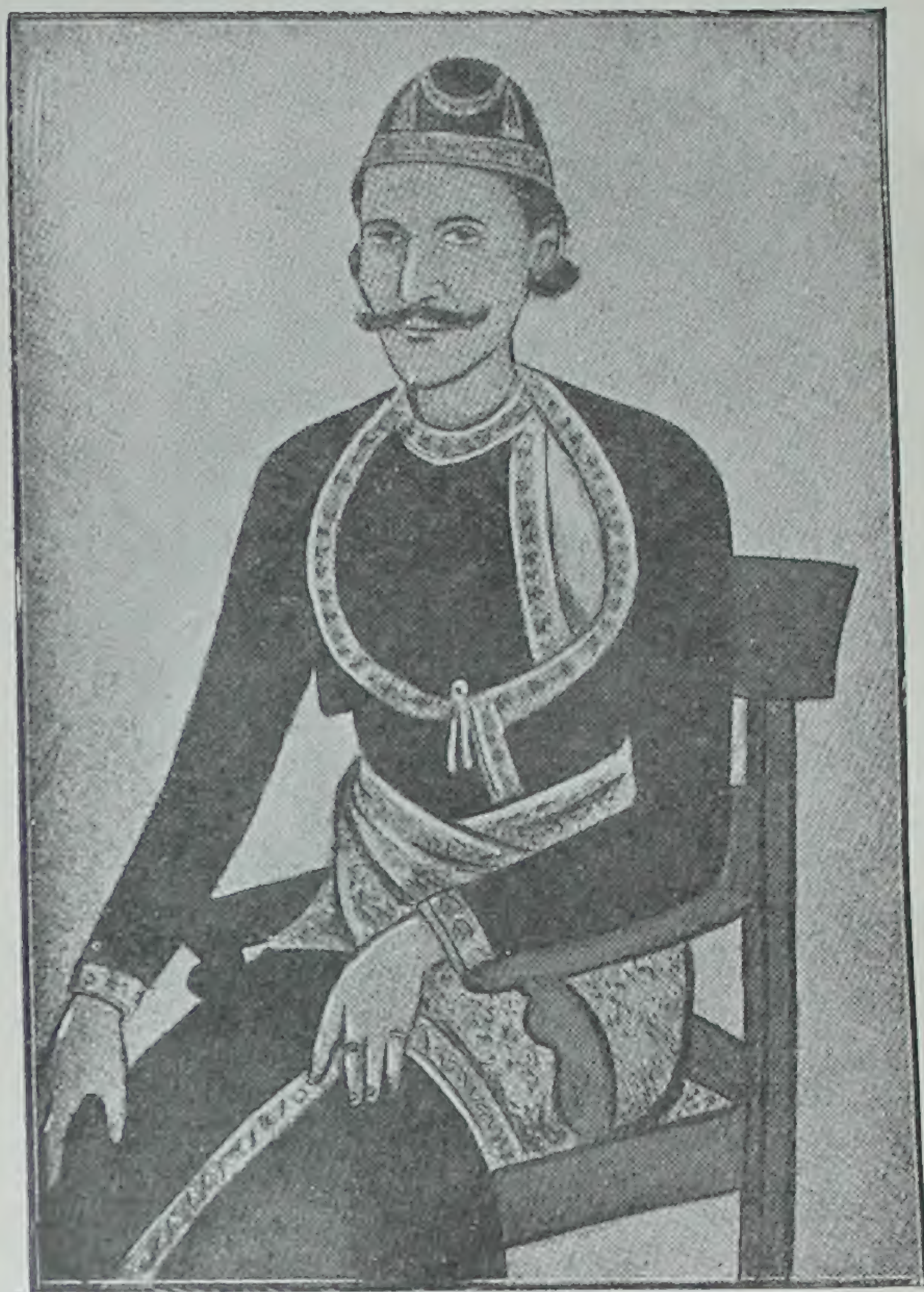
میرزا حاتم علی مہر

نواب سید محمد زکریا خان ذکي دهلوی

رخشاں متوفی ۱۳۰۸ھ	نواب ضیاء الدین احمد خاں متخلص بہ رخشاں و نیّر، نواب احمد بخش

خاں رئیس لوہارو کے چھوٹے بیٹے تھے۔ نواب صاحب لوہارو نے اپنی جاگیر اپنے چھوٹے بیٹوں کے نام منتقل کردی تھی جس کا انتظام نواب امین الدین احمد خاں کرتے تھے نیّر اور غالب سے رشتہ داری بھی تھی اور مرزا ان کو اپنا خلیفہ کہا کرتے تھے۔ نیّر اپنے زمانہ کے اہل علم اور اہل ثروت میں ایک خاص درجۂ امتیاز رکھتے تھے اور شعر و سخن کے بڑے ماہر اور پرکھنے والے سمجھے جاتے تھے۔ تاریخ سے بھی ان کو بہت دلچسپی تھی چنانچہ الیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ ہندوستان کی تیاری میں ان کی جامعیت اور معلومات سے بہت کچھ مدد لی۔

نواب شہاب الدین احمد خاں متخلص بہ ثاقب نیّر کے بڑے بیٹے غالب کی بیوی کے بھتیجے اور غالب کے شاگرد بھی تھے شعر اردو و فارسی دونوں میں کہتے تھے ۱۸۶۹ء عین عالم شباب میں بعمر انتیس سال انتقال کیا۔

دوسرے بیٹے نواب سعید الدین احمد خاں تخلص بہ طالب، جن کی ولادت ۱۸۵۲ء میں ہوئی، اپنے بڑے بھائی ثاقب اور ان کے مرنے کے بعد میر مجروح و سالک و حالی سے مشورہ سخن کرتے تھے کچھ عرصہ تک دلی کے آنریری مجسٹریٹ رہے پھر ۱۸۷۹ء میں پنجاب کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوگئے ۱۸۸۴ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے عہدہ سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔

مرزا شجاع الدین احمد خاں تخلص بہ تاباں نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے بیٹے شاداں اور داغ کے شاگرد ہیں ان کے دو دیوان ہیں۔ ان کی شادی مرزا باقر علی خاں کامل کی لڑکی سے ہوئی اور یہ وہی مرزا باقر علی خاں ہیں جن کو غالب نے پالا تھا۔ تاباں اب حضور نظام کے پنشن خوار ہیں

نواب مرزا سراج الدین احمد خاں متخلص بہ سائل خلف نواب شہاب الدین احمد خاں

داغ کے ایک سر برآوردہ شاگرد اور ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔

آزردہ سنہ ۱۲۰۴ھ
وفات سنہ ۱۲۸۵ھ

مفتی صدر الدین خاں آزردہ خلف الرشید مولوی لطف اللہ کشمیری اپنے زمانہ کے جید فاضل اور متبحر عالم تھے اس زمانہ کی علمی اور ادبی سوسائٹی میں ان سے بڑھ کر اور کوئی ممتاز شخص نہ تھا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور مولانا فضل امام سے فیض تربیت حاصل کیا تھا عہدۂ صدر الصدور پر فائز تھے جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے واسطے سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا عربی، فارسی، اردو، تینوں زبانوں میں ان کو دستگاہ کامل حاصل تھی۔ ان کے علم و فضل کی اس قدر شہرت تھی کہ نواب یوسف علی خاں والی رام پور اور نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم رئیس بھوپال نے انکے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ سرسید مرحوم بھی ان کے شاگرد تھے اور ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے تھے۔ ان کو درس و تدریس کا اس قدر شوق تھا کہ بعد انجام دینے اپنے فرائض منصبی کے اپنے اکثر شاگردوں کو سبق دیتے تھے۔ غالب۔ مومن۔ ذوق۔ شیفتہ وغیرہ ان کے احباب میں سے تھے۔ غدر کے زمانہ میں یہ بھی مصیبت میں مبتلا ہوئے اور نصف جاگیر ضبط ہوگئی۔ آزردہ تینوں زبانوں یعنی عربی، فارسی، اُردو میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں اصلاح سخن پہلے شاہ نصیر سے اور پھر مجرم اکبرآبادی اور آخر میں میر ممنون سے لیتے تھے ان کے اشعار نہایت صاف و سلیس اور پر اثر ہوتے ہیں مگر کبھی دیوان کی صورت میں مرتب نہیں کئے گئے ان کا ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا بھی ہے مگر اب نہیں ملتا ان کی شہرت بحیثیت ایک شاعر یا تذکرہ نویس کے اس قدر نہیں ہے جتنی کہ اُن کے علم و فضل کی ہے۔

باب ۱۳

دربار رام پور و حیدر آباد

امیرؔ و داغؔ کا زمانہ

بعد انتزاع سلطنت اودھ اور غدر ۵۷ء جبکہ واجد علی شاہ کلکتہ اور ابو المظفر بہادر شاہ قید کر کے رنگون بھیجے گئے لکھنؤ اور دلّی، جو ایک عرصہ تک اردو شاعری کے مسکن و مامن رہ چکے تھے ادبی لحاظ سے بالکل ویران ہو گئے اور یہاں کے شاعر اب ہندوستانی ریاستوں کی طرف نہایت اشتیاق اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے

مٹیا برج کلکتہ میں شعراء کا مجمع

وہ شعرائے لکھنؤ جو لکھنؤ میں حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے ان میں سے بعض تو اپنے آقائے نامدار کے ساتھ ہی اور بعض غدر کے بعد جب کسی قدر تسلط اور امن و امان ہو گیا تو راہی کلکتہ ہوئے چنانچہ بادشاہ نے جن کو مناسب نام و خطاب دینے کا خاص ملکہ تھا اُن سات بڑے شاعروں کو جو مٹیا برج میں ان کے ساتھ تھے سبعہ سیّارہ کا خطاب دیا تھا ان میں سے ہر ایک بڑے بڑے معزز شاہی خطاب سے بھی سرفراز تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے مٹیا برج کی صحبتوں میں بڑی گرما گرمی تھی۔ مشاعرے آئے دن ہوا کرتے تھے اور مٹیا برج سواد کلکتہ نہیں بلکہ لکھنؤ کا ایک محلہ معلوم ہوتا تھا۔ اُن سبعہ سیّارہ میں جن کا ذکر اوپر ہوا بعض شعرا کے نام یہ ہیں:۔ فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برقؔ۔ عتاب الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ تخلص بہ درخشاںؔ۔ مالک الدولہ صولتؔ

گلشن الدولہ حاجی مرزا علی متخلص بہ بہار شاگرد رشک۔ عیش۔ مظفر علی ہنر۔ جو غزل میں صبا کے اور مرثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے اور مخدرہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل متخلص بعالم اور نواب محبوب عالم صاحبہ کے کہ یہ دونوں بیویاں واجد علی شاہ کی تھیں استاد تھے۔ اسی پر لطف مجمع میں داغ اور نظم طباطبائی بھی پہونچ گئے تھے ان صحبتوں اور مشاعروں سے زبان اور شاعری اردو کا بنگال میں بہت چرچا ہو گیا تھا وہاں کے مقامی شعرا میں اس زمانہ میں مولوی عبد الغفور نساخ جو اس وقت راج شاہی کے ڈپٹی کلکٹر تھے بہت ممتاز اور معزز سمجھے جاتے تھے۔ نساخ ایک ذی کمال سخن گو سخن سنج اور اچھے نقاد سخن تھے چنانچہ تذکرۂ سخن شعرا۔ دفتر بیمثال قطعہ منتخب، چشمہ فیض، شاہد عشرت، مرغوب دل۔ اشعار نساخ، گنج تواریخ، قند پارسی ارمغان، باغ فکر وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔ دبیر و انیس کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے جو اکثر مقامات پر صحیح تو نہیں مگر دلچسپ اور مفید ضرور ہے اُن کے مشہور شاگردوں میں آسنح تھے۔

شعرائے دہلی اپنا وطن چھوڑ کر نکلتے ہیں	پہلا سفر شعرائے دہلی کا اپنے وطن مالوف سے جس کا اشارہ صفحات گذشتہ میں کئی بار ہو چکا ہے چند اسباب پر مبنی ہے اور وہ یہ ہیں یعنی

افغانوں اور مرہٹوں کے حملے اور دہلی کی تباہی ان کے ہاتھ سے شاہان دہلی کی عظمت قدیم کا جاتا رہنا، رعایا کی جان و مال کا عدم تحفظ۔ تلاش معاش کی دقتیں۔ شعرا کی بے قدری اور بیکاری بس یہی وجوہ تھیں جن کی بنا پر شعرا اپنا وطن چھوڑنے اور دوسرے مقامات میں تلاش روزگار کے لئے نکل جانے پر مجبور ہوئے، چنانچہ فرخ آباد، فیض آباد، عظیم آباد، مرشد آباد، اور حیدر آباد دکن نے دہلی کے ان شورہ بختوں کو اپنی آغوش محبت میں بے تکلف جگہ دی فرخ آباد اور فیض آباد دہلی سے بہ نسبت دوسرے مقامات کے زیادہ قریب تھے مگر چونکہ فرخ آباد ایک چھوٹا مقام تھا اور رؤسا وہاں کم تھے لہذا شعرائے دہلی نے پہلے فیض آباد کا اور جب
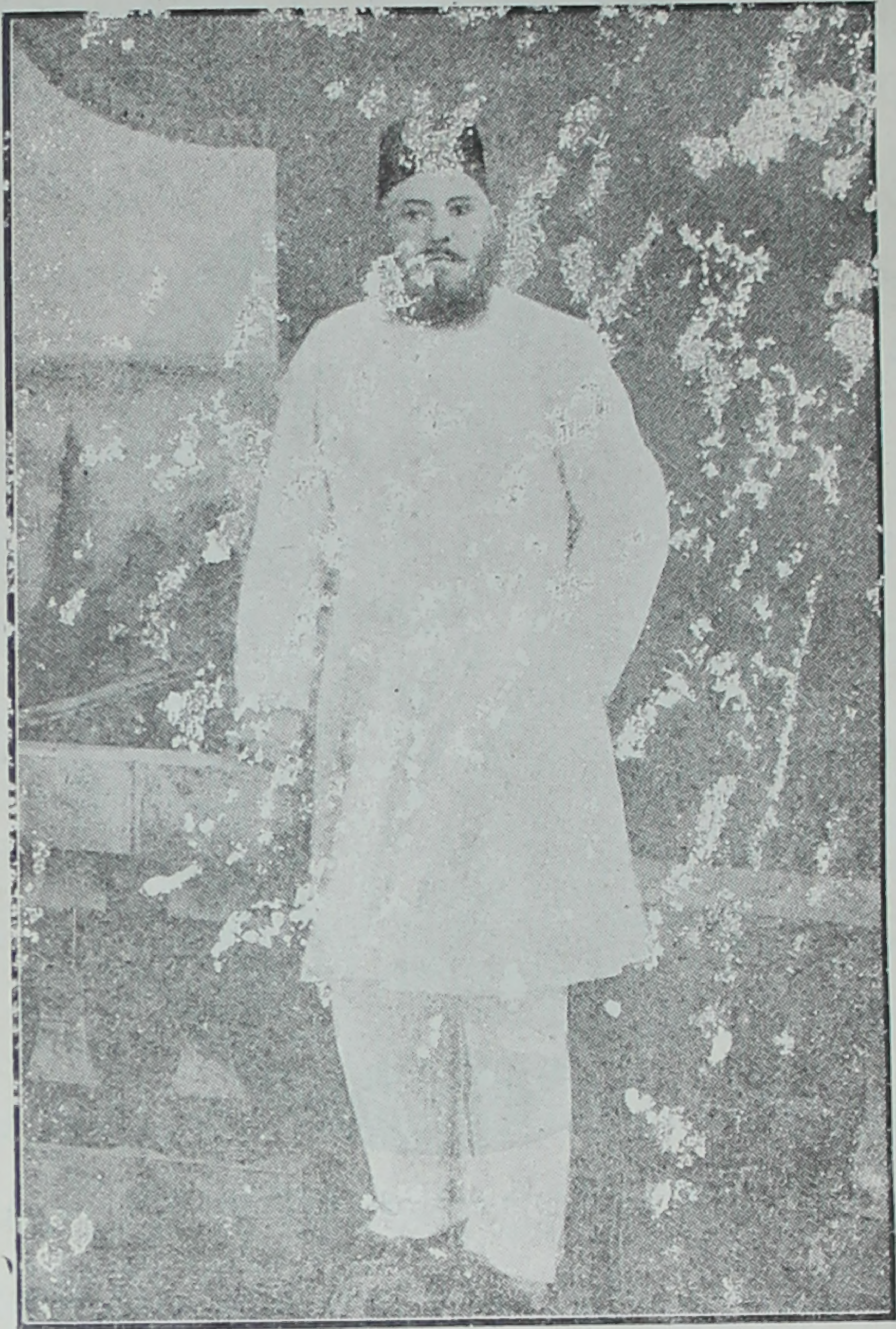
مولانا سید علي حیدر صاحب طبا طبائي شارح دیوان غالب

نواب مرزا سعیدالدین احمد خان طالب دہلوی